شعلوں کی سیج
محی الدین نواب
5 کہانیوں
کا
مجموعہ

نام کتاب: شعلوں کی سیج
مصنف: محی الدین نواب
سن اشاعت: ۱۹۹۲ء
قیمت: 40/= روپے
مطبوعہ: فائن آفسٹ پریس، شاہدرہ، دہلی ۳۲
ناشر: کتاب والا ۲۷۹۴، پہاڑی بھوجلہ، دہلی ۔۶

پنجاب کی زمین سے ابھرنے والی کہانی کتنا دلچسپ ہے آپ کے پسندیدہ ترین لکھاری محی الدین نواب سے سکتے ہیں آپ تو جانتے ہی ہیں کہ نواب جب لکھنے پر آتے ہیں تو قلم جان لڑا دیتے ہیں۔ اس کہانی کا اچھوتا موضوع اور جا بجا بکھرے ہوئے رنگ ان کے قلم کا اعجاز بھی ہے اور ان کے ذہن رسا کا آئینہ بولتا ثبوت بھی۔ یہ کہانی کیا ہے اُبھرتی ہوئی اقتدار اور بندوبست کی سیاست کی شرح ہے کہ جس میں ایک ایسی حسینۂ دلنواز کی داستان حیات ہے جسے اپنی آن بھی عزیز تھی اور شان بھی۔ وہ کردار کی پاکیزگی پر نہ صرف ایمان رکھتی تھی بلکہ اپنے گھر کی آبرو کی حفاظت اس کا منشور حیات بن گیا۔ اپنی عصمت پر ہلکی سی آنچ آجانے کے بعد وہ تن تنہا پورے جہان کے سامنے صف آرا ہو گئی۔ اُسے تسلیاں دی گئیں، دلاسے دے کے بہلانے کی کوشش کی گئی۔ دو خاندانوں نے سر جوڑ کر اپنے فیصلے کی چادر اُس کے قدموں میں ڈال دی مگر اُس کے اندر دہکنے والی آگ کسی سمجھوتے کی بوچھاڑ سے بھی ٹھنڈی نہ پڑی۔ اُس کے باطن میں بھڑکنے والا لاوا ایک روز اچانک آتش فشاں بن گیا۔

شعلوں کی سیج
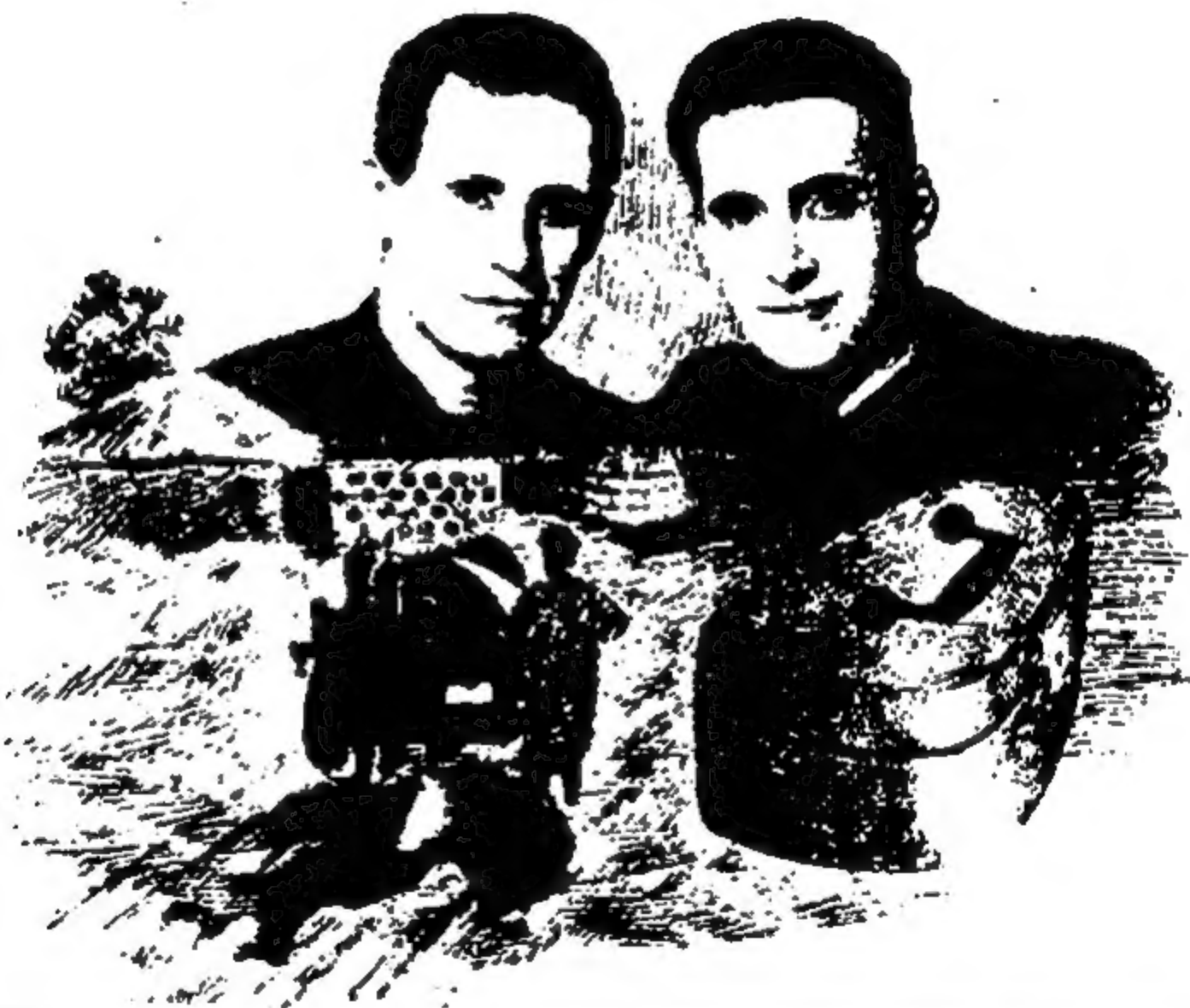
سینٹرل جیل کا آہنی دروازہ اس کے لئے دوسری بار کھل گیا۔ چار برس پہلے وہ اس دروازے سے اندر گئی تھی۔ اب باہر آرہی تھی۔ وہ رہا کر دی گئی تھی۔ رہائی اس کے جسم کو ملی تھی لیکن عمر کے چار برس اس دروازے کے پیچھے قید رہ گئے تھے۔ اسے سزا دینے والے میعادِ قید کے بعد نئی زندگی دے رہے تھے لیکن گزری ہوئی جوانی کے چار برس نہیں دے سکتے تھے۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ قیدی رہا کر دیا جاتا ہے اور اس کی عمر کٹ جاتی ہے۔

جیل کے سامنے دو کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک اُس کے میکے سے آئی تھی۔ دوسری ہونے والی سسرال سے آئی تھی۔ آنے والے اپنی گاڑیوں سے نکل کر اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھ رہے تھے۔ سب سے پہلے ماں نے گلے سے لگایا۔ باپ نے سر پر ہاتھ رکھا۔ ان کی آنکھیں خوشی سے بھیگی ہوئی تھیں ان کے پیچھے

چودھری شرافت علی اپنی کار سے اتر کر آیا تھا۔ وہ اس کا ہونے والا دولہا تھا۔ کل وہ دلہن بننے والی تھی۔

چودھری شرافت علی نے قریب آکر پوچھا "ہیلو سلطانہ! کیسی ہو؟"

"اچھی ہوں۔"

"کیا شادی سے خوش نہیں ہو؟"

چودھری شرافت علی نے اس کے چہرے پر ہمیشہ سنجیدگی پائی تھی۔ کبھی اسے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنی شادی پر خوش ہوگی۔ مسکرائے گی۔ خواہ سنجیدگی ہی سے کیوں نہ مسکرائے لیکن خدا نے اسے جتنا حسن دیا تھا اتنا ہی چڑچڑا بنایا تھا۔ وہ سنجیدگی سے بولی "تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"تم اعتراض کیوں کر رہی ہو؟"

"مشرقی رسم و رواج کے مطابق کر رہی ہوں۔ شریکِ حیات بنانے کے بعد تمہیں میرا چہرہ دیکھنا چاہئے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا "پھر تو تمہارا اعتراض درست ہے۔ مجھ جیسا سیاست داں اور ایم این اے تمہارے سامنے لاجواب ہو جاتا ہے۔ کوئی بات نہیں کل برات لے کر آؤں گا۔"

وہ ہنستا ہوا اپنی کار کی طرف گیا۔ ایک مسلح باڈی گارڈ نے دروازہ کھولا۔ اس نے بیٹھنے سے پہلے سلطانہ کو عاشقانہ انداز میں مسکرا کر دیکھا پھر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا دروازہ بند ہوگیا۔ باڈی گارڈ آگے بیٹھ گیا پھر وہ کار وہاں سے چلی گئی۔

ماں نے کہا "یہ شرافت مجھے زہر لگتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا بیٹی تو اس کے ساتھ کیسے زندگی گزارے گی۔"

"جیل میں بدترین جرائم پیشہ عورتوں کے ساتھ چار برس گزار لئے۔ باقی زندگی بھی اس چودھری کے ساتھ گزر جائے گی۔"

باپ نے کہا "بیٹی! چودھری شیطان سہی مگر تمہارے ساتھ نیکی کی ہے۔ تمہیں سزائے موت اور عمر قید سے بچایا ہے۔"

"ابا! وہ سیاستدان ہے۔ ووٹ حاصل کرنے سے پہلے عوام سے سیاسی نیکیاں کرتا ہے۔ اس نے مجھ سے بھی سیاسی نیکی کی ہے۔"

ماں نے کہا "کیا بحث کرنے کے لئے گھر نہیں ہے۔ ہم تو یہیں اپنے مسائل میں الجھنے لگے ہیں۔ آؤ چلو۔"

سلطانہ نے پوچھا "میرا سیکرٹری کیوں نہیں آیا؟"

باپ نے کہا "میں نے تمہارا پیغام اسے پہنچا دیا تھا۔ وہ تو تمہارا وفادار اور بڑا ہی فرض شناس ہے۔ پتا نہیں کہاں رہ گیا ہے۔ آؤ ہمارے ساتھ چلو۔"

اسی وقت ایک کار آکر کچھ فاصلے پر رکی۔ ایک نوجوان کار سے باہر آیا اور تیزی سے چلتا ہوا قریب آکر بولا "معافی چاہتا ہوں۔ ڈیڈی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ اس لئے بیگم صاحبہ کو لینے میں آیا ہوں۔"

وہ بول رہا تھا اور سلطانہ کو بے اختیار دیکھا جا رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے لوہا مقناطیس کو دیکھ رہا ہو۔ ماں نے کہا۔ "کل شادی ہے۔ آج ابٹن اور مہندی کی رسمیں ایک ساتھ ادا ہوں گی۔ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا چاہئے۔"

"میں شام سے پہلے حویلی پہنچ جاؤں گی۔"

وہ شاہانہ انداز میں چلتی ہوئی کار کے پاس آئی پھر پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ نوجوان رعبِ حسن اور قیامت کی چال دیکھ رہا تھا۔ پھر جھک کر دوڑتا ہوا اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا "میرا نام بلال مرزا ہے۔ میرے ڈیڈی۔۔۔"

وہ بات کاٹ کر بولی "جانتی ہوں۔ جمال مرزا کے بیٹے ہو۔"

"ڈیڈی نے کہا ہے پہلے آپ پرانی حویلی۔۔۔"

"جانتی ہوں۔ تم پرانی حویلی کی چابیاں لائے ہو؟"

"میں سے وہ چابیاں نکال رہا ہوں۔۔۔"

"جانتی ہوں اتنی بھاری چابیاں تم جیب میں نہیں رکھو گے۔ غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرو۔ پہلے مجھے اپنے باپ کے پاس لے چلو۔"

وہ کار ڈرائیو کر رہا تھا اور کن انکھیوں سے عقب نما آئینے میں اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کل چودھری شرافت کی دلہن بن جائے گی۔ وہ پرائی ہے۔ وہ جمال والہ کے بہت بڑے جاگیردار اور موجودہ ایم این اے کی ہونے والی ملکیت ہے۔ ان کے سامنے وہ ایک حقیر ذرہ تھا۔ مگر حسن ایسا تھا کہ ذروں کی بھی آنکھیں ہوتیں تو وہ سلطانہ بیگم کو دیکھتی رہ جاتیں۔

کوئی حسینہ سوچنے کے لئے آنکھیں بند کرے تو سامنے والا خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ شاید وہ اس کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ وہ آنکھیں بند کئے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ بلال ایک ہاتھ کی انگلیوں سے بالوں کو درست کرنے لگا۔ دوسرے ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھال رہا تھا۔ اچانک ہی اسٹیرنگ بہک گیا۔ اس نے سنبھلنے کے لئے گاڑی کو جھٹکے سے بریک لگایا۔ سلطانہ اگلی سیٹ کی پشت سے ٹکراتے ٹکراتے بچ گئی۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ حاضر دماغ رہتی ہے اور بڑے بڑے حادثوں سے بچتی آئی ہے۔

بلال نے ندامت سے دیکھا۔ وہ کھڑکی کے پار دیکھ رہی تھی جیسے کوئی بات نہ ہوئی ہو۔ اس نے دوبارہ کار اسٹارٹ کی پھر اسے آگے بڑھاتے ہوئے بولا "معافی چاہتا ہوں۔ دراصل۔۔۔"

وہ دوبارہ بات کاٹ کر بولی "جانتی ہوں۔ آئینے کا رخ بدل دو۔ حادثہ نہیں ہوگا۔"

وہ بری طرح جھینپ گیا۔ چوری پکڑی گئی تھی۔ اس نے جلدی سے عقب نما آئینے کا رخ بدل دیا۔ بے چارہ ابھی ابھی جوان ہوا تھا۔ تجربات کی بھٹی میں کندن بننے والی ناگن اس کے حواس پر چھا رہی تھی۔

کار ایک مکان کے سامنے رک گئی۔ سلطانہ نے بلال کو دروازہ کھولنے کا موقع نہیں دیا۔ خود ہی دروازہ کھول کر باہر آگئی پھر تیزی سے چلتی ہوئی مکان کے اندر چلی گئی۔ سامنے ہی ایک کمرے میں اس کا سیکریٹری ایک بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ بیگم صاحبہ کو دیکھتے ہی اٹھنے لگا۔ وہ بولی "لیٹے رہو۔ کیسی طبیعت ہے؟"

"اللہ کا کرم ہے۔ آپ کی مہربانی ہے۔ طبیعت سنبھل گئی ہے۔"

وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولی "میرا میک اپ بکس؟"

"وہ تیار ہے۔ میں نے سوچا تھا۔ شام تک طبیعت سنبھل جائے گی تو میک اپ بکس لے کر آؤں گا۔ یہ بکس اتنا اہم ہے کہ میں اپنے بیٹے کے ہاتھ نہیں بھیج سکتا تھا۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔ بکس میں میری ضرورت کا سامان ہے؟"

سیکریٹری نے تکیے کے نیچے سے ایک چھوٹی چابی نکال کر دیتے ہوئے کہا "وہ سامنے میز پر بکس ہے۔"

وہ اٹھ کر چابی سے بکس کھولنے لگی۔ بلال کمرے میں آکر بولا۔ "کیا میں باہر انتظار کروں؟"

سلطانہ بکس کے اندر کی چیزیں دیکھ اور سونگھ رہی تھی۔ پھر بند کرتے ہوئے بولی "یہ میک اپ بکس پچھلی سیٹ پر رکھ دو۔"

سیکریٹری اپنے بیٹے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مالکن کو ایسی لگن سے دیکھ رہا تھا کہ باپ کا دل ڈرنے لگا۔ بیٹے کی محویت کا یہ عالم تھا کہ اس نے سلطانہ کی بات نہیں سنی تھی۔ وہ بکس اٹھا کر نہیں لے گیا تھا۔ سلطانہ اسے لاک کرکے سیکریٹری سے بولی "مرزا! تمہیں آرام کرنا چاہئے۔ میری شادی میں شریک ہونا ضروری نہیں ہے۔ اچھی طرح علاج کراؤ۔"

وہ باہر جانے لگی۔ دروازے پر بلال کے پاس سے گزری تو وہ چونک گیا۔ باپ نے کہا "یہ بکس لے جاؤ۔"

وہ میز کے پاس آیا۔ بکس اٹھا کر جانے لگا۔ باپ نے کہا "کسی کو اتنی شدت سے نہ دیکھو کہ دیدے باہر ابل پڑیں۔ تم ستاروں کو دیکھ سکتے ہو۔ انہیں توڑ کر نہیں لاسکتے۔"

وہ جاتے جاتے دروازے پر رک گیا۔ پلٹ کر کچھ کہنا چاہتا تھا۔ باپ نے ہاتھ اٹھا کر کہا "آسمان بوڑھا ہے' ستاروں کی روشنی بھی صدیوں کی بوڑھی ہے۔ روشنی کے حسن کو نہ دیکھو۔ اس کی عمر کا حساب کرو۔ وہ تم سے بڑی ہے' محترم ہے۔ اب جاؤ۔"

وہ سر جھکائے باہر آیا۔ دل میں سوچنے لگا "ڈیڈی درست کہتے ہیں۔ آخر میں ملازم کا بیٹا ہوں۔ ابھی جا کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولوں گا تو بیگم صاحبہ اندر تشریف لے جائیں گی۔"

وہ سوچتا ہوا کار کے پاس آیا۔ پھر ٹھٹک گیا۔ پہلے حیرانی ہوئی پھر خوشی سے دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ سلطانہ اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا آیا۔ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر میک اپ بکس وہاں رکھا اور اسٹیرنگ سیٹ پر سلطانہ کے برابر بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر گیئر بدل کر ڈرائیو کرنے لگا۔

وہاں سے دیہات والا راستہ نکلنے کا موقع تھا۔ ہائی وے سے پانچ میل پہلے ایک چھوٹی سی جاگیر تھی۔ وہ سلطانہ کے نام تھی۔ سلطانہ وہیں اپنی حویلی میں جا رہی تھی۔ کار کی رفتار خاصی تیز تھی۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ اس کی زلفوں کو اڑا رہے تھے اور دوپٹے کو رہ رہ کر سرکا رہے تھے۔ وہ بار بار اسے درست کر رہی تھی' بار بار بلال کی نظریں بھٹک رہی تھیں۔

اچانک سلطانہ نے ہاتھ اٹھا کر چٹکی بجائی پھر ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے اسکرین کے پار سامنے دیکھنے لگا۔ پھر کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا "میم۔ میں پریشان ہوں۔"

وہ چپ ہو گیا۔ سلطانہ نے پریشانی کی وجہ نہیں پوچھی۔ پھر وہ خود ہی بولا "میں آپ کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا مگر بے اختیار دیکھنے لگتا ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر۔۔۔"

"جانتی ہوں۔ خبر نہیں ہے۔ ایک بار حادثے سے بچ گئی۔ آئندہ اپنے بچاؤ کے لئے یہاں آکر بیٹھی ہوں۔ سامنے دیکھتے رہو۔"

"میں سچ کہتا ہوں۔ میری نظریں پاکیزہ ہیں۔"

"دودھ کے دانت کب ٹوٹے تھے؟"

"تم! وہ۔۔۔ میں سچ کہتا ہوں کہ۔۔۔"

"جس مرد کی نظریں بھٹکتی ہیں' اس کی زبان بھی بھٹکتی ہے اور بھٹکنے والی زبان کبھی سچ نہیں بولتی۔"

اسے چپ سی لگ گئی۔ پھر کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ حوصلہ ہوا بھی تو الفاظ نہیں ملے۔ کار کی رفتار خاصی تیز تھی۔ وہ چار گھنٹے کی طویل خاموشی کے بعد پرانی حویلی پہنچ گئے۔ جاگیر میں داخل ہوتے ہی بستی کے مرد' عورتیں' بچے اور بوڑھے کار کے پیچھے آنے لگے۔ وہ کار سے باہر آئی تو سب آگے بڑھ بڑھ کر سلام کرنے لگے۔ ایک شخص نے کہا "بیگم صاحبہ! ہمیں خبر ہوتی تو آپ کے آنے سے پہلے ہم حویلی کی صفائی کردیتے۔"

وہ بولی "صفائی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سیکریٹری مرزا سے کہہ دیا تھا کہ جب تک میں نہ آؤں اس حویلی کا دروازہ نہیں کھلے گا۔ تم لوگ جاؤ۔ میں یہاں بھیڑ نہیں چاہتی۔"

بلال نے ڈیش بورڈ سے حویلی کی بھاری بھرکم چابیاں نکالیں۔ سلطانہ نے کہا "یہ مجھے دو' تم حویلی کے اندر نہیں جاؤ گے۔ گاڑی لے جاؤ۔ ایک گھنٹے بعد واپس آجانا۔"

اس نے چابیاں لیں' پچھلی سیٹ پر رکھے ہوئے میک اپ بکس کو اٹھایا پھر حویلی کے برآمدے میں آکر بلال کو گھور کر دیکھا۔ وہ فوراً ہی کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کرکے وہاں سے چلا گیا۔ بستی والے بھی جا رہے تھے۔ وہ حویلی کے دیو ہیکل دروازے کے سامنے آگئی۔ مضبوط لکڑی کے دروازے پر پیتل کے ڈیزائن کئے ہوئے

جڑے لگے ہوئے تھے۔ کبھی اس کی چمک میں اپنے بدن کا عکس دکھائی دیتا تھا۔ اب برسوں کی گرد نے اس کی آنکھ دھندلی کر دی تھی۔ وہاں تین وزنی تالے لٹک رہے تھے۔ سلطانہ نے چابیوں کے گچھے سے ایک چابی لے کر تالے میں ڈالی۔ اسے کھولنا چاہا۔ وہ اندر گیا۔ تھوڑی دیر جدوجہد کی۔ وہ تالا کچھ دیر ناراضگی دکھا کر کھل گیا۔ وہ چار برس کے بعد ایک معنی اہم اور پرانے رشتے کا زخم چھڑانے آئی تھی۔ وہ زنگ آلود تالے کیا تھے۔ باقی دو تالے بھی ذرا ناراضگی دکھا کر کھل گئے۔

اس نے دروازے کے دونوں پٹ دھکیلے۔ ویرانی اور سناٹے میں دروازے کی کراہتی آواز دور تک گونجتی گئی۔ اس نے دہلیز پار کی۔ بے جان قدم رکھتی ہوئی جب ہال نما کمرے کو دیکھنے لگی۔ وہ جہاں جا رہی تھی وہاں مٹی میں قدموں کے نشان بنتے جا رہے تھے اور ان نشانات کے پیچھے قیمتی قالین جھانک رہے تھے۔

حویلی وہی تھی۔ وہاں کی ہر چیز وہی تھی اور ہر چیز جتنی پرانی تھی، اتنی ہی پرانی یادیں تازہ کر رہی تھی۔ وہ یادیں ایسی تھیں جو صرف آنکھوں کو ہی نہیں دل کو بھی رلا دیتی تھیں۔

اس نے دل سے نکلنے والی ایک آہ کے ساتھ زینے پر قدم رکھا اور پھر زینہ بہ زینہ اوپر جانے لگی۔ اس کی سماعت میں کسی بچے کی آواز گونج رہی تھی۔ کوئی چیخ چیخ کر اسے بلا رہا تھا "سلطانہ! سلطانہ۔"

یہ چار برس پرانی آوازیں تھیں۔ پھر بھی وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر دوڑتی ہوئی اس کمرے میں آئی جہاں سے وہ چیخ کر بلا رہا تھا مگر اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ خواب گاہ دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ دلہن جیل سے آئی تھی۔ مگر دولہا نہیں تھا۔

وہ تھکے ہوئے انداز میں خواب گاہ کی دہلیز پر بیٹھ گئی۔ پھر بیٹھے ہی بیٹھے ماضی میں پہنچ گئی۔

○☆☆○

وہ سہاگ کی سیج پر بیٹھی ہوئی تھی۔ گھونگھٹ میں چھپ کر اپنے مجازی خدا کا انتظار کر رہی تھی۔ جو لمحے بیتے لمحات پیش آنے والے تھے، وہ پیش آنے سے پہلے گدگدا رہے تھے۔ ایک انجانا سا خوف بھی تھا، جو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بعض دلہنیں خود کو [illegible] میں نہیں "آپریشن تھیٹر" میں سمجھتی ہیں۔

کمرے کا دروازہ کھلتے ہی سلطانہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جیسے جیسے کسی کے قریب آنے کا احساس ہو رہا تھا، دھڑکنیں پاگل ہوئی جا رہی تھیں۔ ہر عورت کی زندگی میں ایک مرد ایسا ہوتا ہے، جو دستک دیے بغیر تنہائی میں چلا آتا ہے۔ وہ بھی اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے حنائی ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔ "واہ! دلہن کے ہاتھ اتنے خوب صورت ہیں۔ پتا نہیں مکھڑے کی شادابی کیا ہو گی؟"

وہ ہاتھ چھڑانا چاہتی تھی۔ اس نے اور مضبوطی سے پکڑ لیا پھر کہا "جانتا ہوں، جانتا ہوں۔ دلہن رشوت لیے بغیر گھونگھٹ اٹھانے نہیں دیتی۔"

اس نے ہیرے کی ایک انگوٹھی نکال کر اس کی انگلی میں پہنا دی۔ ہتھیلی کی پچھلی پشت کو سہلایا پھر اسے چوم لیا۔ وہ حیا سے سمٹنے لگی۔ وہ بولا "دور دور کے جاگیردار تمہارے دیوانے تھے۔ سب نے اپنی دولت اور طرح طرح کے ذرائع استعمال کیے مگر تم میرے نصیب میں تھیں۔ میری تقدیر بن کر آ گئیں۔"

اس نے گھونگھٹ الٹ دیا۔ اسے دیکھتے ہی وہ بولنا بھول گیا۔ کمسن چہرے کے نقوش ایسے تیکھے اور جاذب نظر تھے کہ پلکیں جھپکانا یاد نہ رہے۔ وہ تو پیدائشی حسین تھی لیکن دلہن کے روپ میں اور غضب ڈھا رہی تھی۔

سلطانہ کو پتا نہیں تھا کہ اسے دیکھنے والا پتھر کا ہو گیا ہے۔ وہ آنکھیں بند کیے اس کی نگاہوں کی تپش محسوس کر رہی تھی۔ ایسے ہی وقت دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ جبکہ دولہا کے آجانے کے بعد پھر دروازہ نہیں کھلتا لیکن وہاں تیسرے کی مداخلت ہو چکی تھی۔

کسی نے پوچھا "ابے شرافت! تو ادھر کیا کر رہا ہے؟"

سلطانہ ایک اور مرد کی آواز سن کر چونک گئی۔ اس نے فوراً ہی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ دلہن کے کمرے میں ایک ہی دولہا آتا ہے مگر وہاں دو تھے۔ وہ الجھ گئی۔ دونوں کو باری باری سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

بعد میں آنے والے دولہا نے قریب آ کر کہا "معاف کرنا سلطانہ! یہ میرا چھوٹا بھائی چودھری شرافت علی ہے۔ تمہارا دیور ہے۔ شریر ہے۔ اس نے ضرور کوئی شرارت کی ہو گی؟"

سلطانہ کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ شرارت ایسی تو نہیں ہوتی؟ وہ سیج پر بیٹھے بیٹھے پیچھے ہٹ گئی۔

وہ کورے کاغذ کی طرح تھی۔ اس کا حنائی ہاتھ بھی کورا تھا۔ مہندی کی اس خوشبو کو چومنے کا حق صرف شوہر کو تھا جب کہ دوسرے نے اس کے اچھوتے پن پر ناجائز بوسے کی مہر لگا دی تھی۔

وہ ایسی نفاست پسند تھی کہ اپنے ہی ناخن کا میل دیکھنا گوارا نہیں کرتی تھی۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ کجا یہ کہ کوئی ہتھیلی کی پشت پر مکھا آ کر بیٹھ گیا تھا۔

شرافت علی فاتحانہ انداز میں مسکراتا ہوا چلا گیا۔

وہ سخت جان تھی۔ مرنا نہیں جانتی تھی۔ اس بے ہودگی پر پھر گئی۔ جس ہتھیلی کی پشت پر اس نے ہونٹ رکھے تھے اسے دوسرے ہاتھ کے ناخنوں سے کھرچنے لگی۔ سیج سے اٹھ کر دوسری طرف چلی گئی اور چیخ چیخ کر کہنے لگی "چلے جاؤ۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ میرے ابا کو بلاؤ۔۔۔"

وجاہت علی بوکھلا گیا تھا۔ کبھی دلہن کو اور کبھی دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سلطانہ کی چیخیں کمرے کے باہر دور تک جا رہی ہوں گی۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا "پلیز سلطانہ! چھوٹی

کی بات کو تماشا نہ بنائیے۔ خدا کے لئے چپ ہو جائیے۔"

"چھوٹی سی بات؟" وہ حلق پھاڑ کر بولی "یہ چھوٹی سی بات ہے؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ میرے ساتھ کیا ہو چکا ہے؟"

اس سوال نے وجاہت علی کو چکرا دیا۔ دلہن کے احتجاج سے صاف ظاہر تھا کہ شرافت نے خلافِ تہذیب کوئی حرکت کی ہے۔ اس نے کہا "میں مانتا ہوں یہ چھوٹی سی بات نہیں ہے۔ لیکن جو کچھ ہوا اس کی مکمل تلافی ہوگی۔ مجھ پر بھروسا کرو۔ خاموش ہو جاؤ۔"

"آپ میری آواز بند کرنا چاہتے ہیں تو میرے میکے والوں کو بلائیے۔ فوراً اس کمرے سے چلے جائیے۔ میں پرائے مرد کے ساتھ نہیں رہوں گی۔"

"میں پرایا نہیں ہوں۔ تمہارا نکاح مجھ سے ہوا ہے۔"

"ہوا ہے نہیں 'ہوا تھا' جائیے 'علمائے دین' سے فتویٰ لے کر آئیے کہ ایسی صورت میں ہمارا نکاح قائم رہا یا نہیں؟"

وجاہت علی چکرا کر بیٹھ گیا۔ لو دروازہ کھل گیا تھا۔ شادی میں جو رشتے دار آئے ہوئے تھے ان کی بھیڑ لگ گئی تھی۔ ایک بوڑھی نے پوچھا "اوئے وجاہت میاں کیا ہو رہا ہے۔ میں ساٹھ برس کی ہو گئی ہوں۔ میں نے آج تک کسی دلہن کو یوں چیختے چلاتے بھی نہیں سنا۔"

وجاہت علی کی ماں بھیڑ کو چیرتی ہوئی کمرے میں آئی۔ اپنی بہو کو دیکھا۔ پھر پوچھا "دلہن! کیوں چیخ رہی ہو؟"

سلطانہ نے وجاہت کو گھور کر دیکھا۔ پھر بولی "امی! آپ کے لاڈ پیار نے شرافت کو انسان سے جانور بنا دیا ہے۔"

"کیا بکتی ہو؟"

"بکتا نہیں عرض کرتا ہوں۔ آپ کے لاڈلے نے یہاں آکر دلہن کے ساتھ ایسی حرکت کی ہے جسے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

ماں پہلے تو حیران رہ گئی پھر بولی "شرافت اس کمرے میں کیسے آگیا۔ تم کہاں تھے؟"

"آپ میری مصروفیات جانتی ہیں۔ الیکشن کے معاملے میں الجھا رہتا ہوں۔ کل چک نمبر دو سو تیرہ میں بہت بڑا جلسہ ہے۔ میں اپنے بندوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا شرافت یہاں آکر ذلالت کرے گا۔"

"میں شرافت سے بعد میں پوچھوں گی۔ تم یہ بتاؤ جو کچھ بھی ہوا اس کے بعد تم دلہن کو قبول کرتے ہو؟"

"ایک نہیں ہزار بار قبول کرتا ہوں۔"

ماں نے کہا "اس کا مطلب ہے کوئی بڑی بات نہیں ہوئی ہے۔ دلہن! میں تم سے کہتی ہوں۔ بات نہ بڑھاؤ۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔"

سلطانہ نے کہا "میکے چھوڑ کر آنے والی ہر بہو اپنی ساس کے اصولوں پر چلتی ہے۔ کیا آپ دلہن بن کر آئی تھیں تو آپ کے ساتھ بھی ایسی ہی حرکت کی گئی تھی اور آپ نے اسے بھلا دیا"

ساس غصے میں تلملاتی ہوئی تھپڑ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ سلطانہ نے ہاتھ پکڑ کر کہا "ساس بیگم! دوسری بار ایسی غلطی نہ کرنا۔ تم لوگ یہاں کے جاگیردار ہو تو میں بھی بڑے جاگیردار کی بیٹی ہوں۔ سلطنت کا رعب تمہارے لئے تنگ۔"

ساس ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے بڑے بڑے جاگیرداروں اور چودھریوں کے درمیان پھوٹ پڑنے والے جھگڑوں کا انجام دیکھا تھا۔ دونوں طرف کے جوان حرام موت مارے جاتے تھے۔ ماں کو اپنے بیٹے شرافت کی حرام موت منظور نہیں تھی۔ لیکن وہ چودھرائن تھی؛ آسانی سے جھکنے والی بھی نہیں تھی۔ اس نے پلٹ کر وجاہت علی سے کہا "تجھے شرم نہیں آتی؟ اس نے تیری ماں کا ہاتھ پکڑا اور تو خاموش ہے؟"

"امی! پہلے شرافت نے بدتمیزی کی، اب آپ ہاتھ اٹھانے جا رہی تھیں۔ آپ کسی چھوٹے گھر سے بہو لے کر نہیں آئی ہیں۔ بہتر ہے اپنے غصے کو قابو میں رکھیں۔"

ماں نے ناگواری سے پوچھا "معلوم تو ہو آخر ہوا کیا ہے؟"

سلطانہ نے ہاتھ آگے کر کے اپنی ہتھیلی کی پشت دکھائی۔ وہ لہولہان ہو رہی تھی۔ اس نے دانتوں سے بری طرح کچل ڈالا تھا۔ وہ بولی "اسے آپ کے دوسرے بیٹے نے اپنے ہونٹوں سے ناپاک کیا تھا۔"

ساس نے پوچھا "بس؟ کیا اس سے بھی آگے کوئی بات ہے؟"

سلطانہ نے پوچھا "میں نے جو کہہ دیا کیا وہ کافی نہیں ہے؟ کیا میں ایسی بات کہوں کہ پھر آپ کو طیش آجائے؟"

وجاہت نے کہا "بے شک کوئی شریف زادی ایسی بے حیائی برداشت نہیں کرے گی۔ مجھے بتاؤ۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ تم کیا چاہتی ہو؟"

"آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ ایک غیرت مند شوہر کیا ہوتا ہے اور کیا کرتا ہے؟"

ساس نے کہا "اے! میرے ایک بیٹے کو دوسرے بیٹے کے خلاف بھڑکا رہی ہو۔ کیا تم چاہتی ہو یہ شرافت کا ہاتھ کاٹ کر پھینک دے۔ میں ابھی تمہارے باپ کو بلاتی ہوں۔ میں ایسی بہو کو ایک منٹ برداشت نہیں کروں گی۔"

وہ وہاں سے تلملاتی ہوئی چلی گئی۔ وجاہت علی نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "سلطانہ! جب سے تمہاری تصویر دیکھی ہے تمہارا دیوانہ ہو گیا ہوں۔ میری محبت کا یوں اندازہ کرو کہ الیکشن سر پر ہیں۔ اپنے مخالف امیدوار سے زبردست مقابلہ ہے۔ اس کے باوجود میں دشمنوں کو نظر انداز کر کے تمہیں دلہن بنا کر لے آیا ہوں۔ خدا کے لئے کوئی سمجھوتے کی راہ اختیار کرو۔"

"اگر آپ واقعی چاہتے ہیں کہ میں کوئی سمجھوتا کروں تو مجھے فوراً میکے بھیج دیں۔ میرے اندر آگ بھڑک گئی ہے۔ اس حالت میں

کوئی معقول فیصلہ نہیں ہو گا۔"

وہ حسرت سے دلہن کو دیکھنے لگا۔ اسے حاصل کرنا تو دور کی بات ہے اسے چھونے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ وہ سیج سُونی کر جائے گی تو تمنا نہیں ہو سکے گی۔ دلہن کا بستر شعلوں کی سیج بن جائے گا۔ وہ قریب آتے ہوئے بولا "نہیں سلطانہ! جانے کی بات نہ کرو۔ مجھے چھوڑ کر جاؤ گی تو میرا سکون برباد ہو جائے گا۔"

اس نے محبت سے سمجھانے کے لئے اسے چھونا چاہا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھنا چاہا۔ وہ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔ پھر بولی "کیا آپ میرا ہاتھ پکڑنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں پکڑنا چاہتا ہوں۔ پھر کبھی چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

"آپ پرائے ہونٹوں کی غلاظت مٹا کر ہی یہ ہاتھ پکڑ سکتے ہیں۔"

اس نے گوری ہتھیلی کی پشت کو دیکھا' وہاں لہو پھیلا ہوا تھا۔ وہ سرخ لہو گواہ تھا کہ دلہن کے تن بدن میں سرخ انگارے دہک رہے ہیں۔ یہ بات بے حیاؤں کے لئے معمولی تھی اور حیا والوں کے لئے بڑی تھی کہ کوئی نامحرم پرائی دلہن کو انگوٹھی پہنا کر ہونٹوں سے کی ملاقات سے کر ایک کنواری کی پارسائی کو چوم کے داغدار کر گیا تھا۔

دروازے پر دستک سنائی دی۔ وجاہت علی نے غصے سے گرج کر کہا "کون ہے؟ جاؤ یہاں سے۔"

باہر سے ملازمہ نے کہا "بڑے چوہدری جی! دلہن بیگم کا فون ہے۔ ان کے ابا جی بات کریں گے۔"

وجاہت نے دروازہ کھول کر ملازمہ سے واکی ٹاکی لی پھر دروازہ بند کر کے وہ واکی ٹاکی سلطانہ کو دی۔ سلطانہ نے اسے کان سے لگاتے ہوئے کہا "ہیلو میں سلطانہ بول رہی ہوں۔"

دوسری طرف سے باپ کی آواز سنائی دی "ہاں رانی! کیا بات ہے؟ تمہاری ساس کہہ رہی ہیں' شرافت علی نے دیور کے رشتے سے مذاق کیا تو تم نے پوری حویلی سر پر اٹھالی ہے۔"

"اباجی! اس نے مذاق نہیں کیا' آپ کی عزت پر کیچڑ اچھالی ہے۔ آپ نے کلام پاک کے سائے میں ایک بے داغ بیٹی کو رخصت کیا تھا۔ یہاں آتے ہی اس نامحرم شرافت علی نے میرے ایک ہاتھ کو داغ دار کر دیا ہے۔ آپ آکر دیکھیں۔ آپ کی غیرت مند بیٹی نے اپنے اس ہاتھ کو لہولہان کر دیا ہے۔"

"بس کر سلطانہ! آگے کچھ نہ کہنا۔ جتنا لہو تیرے ہاتھ سے بہا ہے اس سے زیادہ شرافت علی کے سینے سے بہے گا۔ میں ابھی آرہا ہوں۔"

"نہیں اباجی! میں خون خرابا نہیں چاہتی۔ ہیلو! ہیلو اباجی۔ ہیلو۔۔۔"

اس نے واکی ٹاکی کو دیکھا' وہ خاموش ہو چکا تھا۔ بندوق سے گولی نکل چکی تھی۔ اس کے میکے کے وفادار نشانے باز سنسناتی ہوئی گولیوں کی طرح آنے والے تھے۔ وجاہت نے اس سے واکی ٹاکی لیتے ہوئے پوچھا "کیا ہوا؟"

اس کے جواب دینے سے پہلے ہی ماں نے زور زور سے دروازہ پیٹتے ہوئے کہا "اوئے وجاہت! دروازہ کھول! ہم دلہن نہیں' مصیبت اٹھا کر لائے ہیں۔"

وجاہت نے دروازہ کھولا۔ ماں اندر آئی۔ اس کے پیچھے رشتے داروں کی بھیڑ تھی۔ سب ملازم بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ماں نے کہا "میں نے دوسرے فون پر باپ بیٹی کی بات سنی ہے۔ اس کا باپ کہہ رہا تھا' میرے شرافت کے سینے میں گولی اتار دے گا۔ اپنی بیٹی کے ہاتھ کی طرح میرے بیٹے کے سینے سے لہو بہائے گا۔"

"امی! آپ پریشان نہ ہوں۔ سلطانہ کے والد میرے بزرگ ہیں۔ میں انہیں سمجھاؤں گا۔"

"تم کیا سمجھاؤ گے۔ ادھر شرافت ہمارے وفاداروں کو مسلح کر رہا ہے۔ سسرال والوں کو چھوڑو۔ اپنے بھائی کو بچاؤ۔ اسے سمجھا کر یہاں سے دور بھیج دو۔"

وجاہت تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ ماں بھی بڑبڑاتی ہوئی پیچھے پیچھے گئی۔ "یہ دلہن میرے بیٹوں کے لئے کفن لے کر آئی ہے۔ اللہ کرے یہ کھڑے کھڑے مر جائے۔ اس کے میکے والے یہاں آنے سے پہلے دنیا سے اٹھ جائیں۔"

ان ماں بیٹے کے پیچھے رشتے داروں کی بھیڑ چل رہی تھی۔ ایک کمرے میں شرافت اپنے وفاداروں کو رائفلیں اور کارتوس کے بیلٹ دے رہا تھا اور انہیں بتا رہا تھا کہ ان میں سے کون کہاں چھپ کر مورچہ بنائے گا۔ وجاہت علی نے کمرے میں آکر گرجتے ہوئے پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

اس کی گرج سن کر تمام وفادار چپ چاپ سیدھے کھڑے ہو گئے' شرافت نے کہا "بھائی جان! آپ کا سسر مجھے گولی مارنے آرہا ہے۔"

وجاہت نے کہا "گولی تو میں تجھے مار سکتا ہوں۔ مگر امی کے آنسو مجھے روکتے ہیں۔"

پھر اس نے وفاداروں سے کہا "رائفلیں پھینک دو اور یہاں سے جاؤ۔ میری حویلی سے ایک گولی بھی نہیں چلے گی۔"

تمام وفادار چلے گئے۔ ماں نے پوچھا "اور وہ جو گولیاں چلانے یہاں آرہے ہیں۔"

"وہ گولیاں میں اپنے سینے پر کھاؤں گا۔ آپ کا لاڈلا بیٹا محفوظ رہے گا۔ کیا آپ سمجھتی ہیں' میرا سسر فوج لے کر آئے گا اور ہماری حویلی میں گھس پڑے گا۔"

شرافت نے کہا "وہ حویلی میں نہ گھسے۔ لیکن میں بزدل کی طرح اندر نہیں رہوں گا۔ سینہ تان کر چوہدری ملک نواز سے کہوں گا کہ اس کی بیٹی سلطانہ کا حق دار میں ہوں۔ اس لئے اپنا حق وصول کیا ہے۔"

وجاہت نے گرج کر پوچھا "کیا بکتے ہو؟"

ماں نے کہا "ارے شرفا! تیرا دماغ چل گیا ہے؟"

"ہاں! آپ ماں بیٹے نے میرا دماغ خراب کیا ہے۔ میں نے آپ دونوں سے التجا کی کہ الیکشن میں پارٹی سے ٹکٹ مجھے ملنا چاہئے۔ میں الیکشن لڑوں گا۔ مگر بھائی جان نے فرمایا۔ آس پاس کے چودھری مجھے پسند نہیں کرتے ہیں۔ وہ مجھے ووٹ نہیں دیں گے۔"

وجاہت بولا "میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ تمہاری عیاشی اور بدنامی دور تک مشہور ہے۔"

"یہ بکواس ہے۔ جاگیردار تو عیاش ہوتے ہی ہیں۔ سبھی بدمعاش اور مشہور ہوتے ہیں۔ غریب کسان اور دور تک کے عوام صدیوں سے ہمارا رعب اور دبدبہ دیکھتے آرہے ہیں۔ مگر ہم سے نفرت اور بغاوت کرنے کی جرات نہیں کرتے۔ الیکشن میں آپ کھڑے ہوں یا میرے نام کے بینر اور پوسٹر لگیں، ان کے ووٹ ہم جاگیردار بھائیوں کی جھولی میں ہی آئیں گے۔"

ماں نے کہا "بیٹا! جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب تو وجاہت کی چاروں طرف دھوم مچی ہے۔ اسے کامیاب ہونے دے۔"

"جو بھی اہم معاملہ ہو اس میں آپ بڑے بیٹے کا ساتھ دیتی ہیں۔ میں نے سب سے پہلے سلطانہ کی تصویر دیکھ کر کہا تھا کہ میں اس سے شادی کروں گا۔"

وجاہت علی نے کہا "میں نے انکار نہیں کیا تھا۔ لیکن میں بھی اسے پسند کر چکا تھا۔ امی نہ تمہارا دل توڑنا چاہتی تھیں نہ مجھے مایوس کرنا انہیں گوارا تھا۔ امی نے ہم دونوں کی تصویریں دونوں کا رشتہ بھیجا تھا۔ سلطانہ کے والدین نے مجھے داماد بنالیا۔ میں نے تمہارا حق نہیں چھینا۔ یہ مقدر کا فیصلہ ہے۔"

وہ تلملا کر بولا "مجھ سے میرے حق چھینتے رہو، مجھے الو بناتے رہو اور کہتے رہو مقدر کا فیصلہ ہے۔ جاگیرداروں کی یہ خاصیت ہے کہ وہ غریبوں اور ماتحتوں کی تقدیر کو اپنے فیصلوں سے لکھتے ہیں۔ آپ بھی ویسے جاگیردار ہیں بھائی جان! آپ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ سلطانہ کو چھین کر آپ میرے مقدر میں محرومی اور ناکامی لکھ دیں گے۔ لیکن میں بھی جاگیردار ہوں۔ میں نے بھی آپ کے مقدر میں سلطانہ سے محرومی لکھ دی ہے۔"

"تو مجھے کیا محروم کرے گا کمبخت! وہ میری شریکِ حیات بن چکی ہے۔"

"جھوٹ ہے۔۔ سلطانہ ابھی کسی کی شریکِ حیات نہیں ہے۔ صرف نکاح پڑھا دینے سے کوئی عورت بیوی نہیں بن جاتی۔ اسے بیوی بنانے کے لئے ازدواجی رشتہ قائم کرنا ضروری ہے۔"

ماں نے کہا "ارے شرفا! تجھے شرم نہیں آتی۔ بھائی اور بھرجائی کے لئے ایسی باتیں کر رہا ہے۔"

"میری کوئی بھرجائی نہیں ہے۔ جاؤ اور کسی عالمِ دین سے پوچھو! ابھی وہ کسی کی بیوی نہیں ہے نہ بھرجائی۔"

ماں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔ وجاہت علی نے غصے سے دانت پیس کر پوچھا "کیا تو مسلمان نہیں ہے؟ کیا شریعت کے مطابق ہونے والے رشتے کو ماننے سے انکار کر رہا ہے؟"

"میں اپنے دین کے اندر رہ کر بول رہا ہوں۔ میں دین کا منکر نہیں ہوں۔ پاگل نہیں ہوں۔ اول فول نہیں بک رہا ہوں۔"

ماں نے کہا "ارے تو پاگل ہو گیا ہے۔ ہمیں بھی پاگل بنادے گا۔ ارے کچھ باہر کا بھی خیال کر۔ وہ تمہارا سسر بندوقیں لے کر آرہا ہوگا۔"

وجاہت نے کہا "میں باہر جا رہا ہوں۔ تجھے سمجھا رہا ہوں کہ تیری بے جا ضد سے صرف میرے سسرال والے دشمن نہیں بنیں گے، میں بھی دشمن بن جاؤں گا۔ دانشمندی یہی ہے کہ بات بڑھنے سے پہلے تم سلطانہ سے معافی مانگ لو۔"

وہ جانے لگا۔ شرافت اس کے پیچھے دروازے تک گیا اور کہا "چودھری ہو کر عورت سے معافی مانگنے کو کہتے ہو۔ عورت کے سامنے تم جھکتے ہو، سسرال والوں سے تم ڈرتے ہو۔ میں اپنا حق مانگتا ہوں تو دشمنی کی دھمکی دیتے ہو۔ میں نے جو ارادہ پکا کرلیا۔ اب نہیں کروں گا۔"

وجاہت حویلی کے باہر آیا۔ کچھ دیر پہلے تک حویلی کے باہر بڑی چہل پہل تھی۔ پھر یہی خبر گشت کرنے لگی کہ دلہن کے میکے والے بندوقیں لے کر آرہے ہیں، ویسے ہی باہر دور تک ویرانی

چھائی تھی۔ تمام دور کے رشتے دار حویلی کے اندر سمٹ آئے تھے۔ چند کے لوگ اپنے اپنے کمروں میں دبک گئے تھے۔ جو طوائف مجرا کرنے آئی تھی' وہ واپس جانے کی ضد کر رہی تھی۔ مجرے کے شوقین اسے سمجھا رہے تھے کہ ذرا چودھری سمجھوتا کر لیں گے' خون خرابا نہیں ہونے دے گا حویلی کی رونق ابھی لوٹ آئے گی۔

وجاہت' تیر چڑھے سلطانہ کو دلہن بنا کر لایا تھا۔ یعنی اس کا سسرال بائیں تھپڑ کے فاصلے پر تھا۔ صبح سسرال والوں کے آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ اس نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ وہ گیٹ پر موجود رہیں۔ جو چار ملازم حویلی کے باہر جانے والے راستے پر ہیں۔ جیسے ہی سسر کا قافلہ نظر آئے اسے فوراً اطلاع دی جائے۔

وہ احکامات صادر کر کے حویلی میں آیا۔ مرد' عورتیں' بچے' بوڑھے سب اسے دیکھ رہے تھے۔ جہاں سے گزرتا تھا' وہاں سے افسوس بھرے ہمدردی کے الفاظ سنائی دیتے تھے۔ افسوس اس بات کا ظاہر کیا جا رہا تھا کہ دلہن نے شب عروسی گزارنے سے انکار کیا تھا۔ ایسے میں سلطانہ ظالم اور چودھری وجاہت علی مظلوم نظر آ رہا تھا۔ لہٰذا مظلوم کے لئے ہمدردی کے الفاظ استعمال ہو رہے تھے۔

اسے ہمدردی پر غصہ آ رہا تھا۔ البتہ خود کو مظلوم سمجھ رہا تھا۔ سلطانہ اس سے انصاف نہیں کر رہی تھی۔ قصور کسی کا تھا' سزا اسے دے رہی تھی۔ وجاہت نے پہلے تو زبانی اس کے حسن کے چرچے سنے تھے۔ تصویر دیکھنے کے بعد ایسا دیوانہ ہوا تھا کہ دن رات تصور میں اسے حاصل کرتا رہتا تھا۔ کسی کو تصور میں حاصل کرنے کے لئے نکاح پڑھانا ضروری نہیں ہوتا۔ اسے تصور کا کھیل کہتے ہیں' آج وہ نکاح پڑھوانے کے باوجود حاصل نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔ وہ نہیں کھلا۔ اس نے آواز دی "میں ہوں وجاہت! دروازہ کھولو۔"

اندر سے آواز آئی "میں کیسے سمجھوں کہ آپ دونوں میں سے کون وجاہت اور کون شرافت ہے؟"

"میں ہوں۔ میں تمہارا مجازی خدا ہوں۔"

وہ بولی "آپ میری مجبوری اور حالات دونے کو سمجھیں۔ اب میں ثبوت کے بغیر آپ کو مجازی خدا تسلیم نہیں کروں گی۔"

"سلطانہ! یہاں میرے خاندان کے بہت سے بزرگ ہیں۔ یہ میری حمایت میں گواہی دیں گے۔"

"آپ برا نہ مانیں۔ آپ کے خاندان میں آتے ہی میں نے بہت بڑا دھوکا کھایا ہے اس لئے یہاں میرے لئے کوئی معتبر نہیں ہے۔ جب میرے ابا جی آئیں گے اور اپنے داماد کو شناخت کریں گے تب میں دروازہ کھولوں گی۔"

اتنی دیر میں وجاہت کے آس پاس رشتے داروں کی بھیڑ لگ گئی تھی۔ اس نے گرج کر پوچھا "آپ لوگ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ کیا میں کوئی تماشا ہوں؟ اگر ہوں تو شرافت نے مجھے اس حال کو پہنچایا ہے۔ آپ لوگوں کا فرض ہے اسے جا کر سمجھائیں۔ یہاں میرے بہت سے بزرگ ہیں۔ میرے مسئلے کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔ لیکن کوئی مسئلہ ختم نہیں کر رہا ہے۔ سب ہمدردی کر رہے ہیں۔"

ایک بزرگ نے کہا "تم ایک تو ہمیں مسئلہ ہی سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسرے یہ کہ تم ہمارے پاس آ کر اصل قصہ بیان کرتے تو ہم ایک پنچایت قائم کر کے مسئلے کا ضرور کوئی حل پیش کر دیتے۔"

ماں نے آ کر کہا "دنیا کے بڑے بڑے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ یہاں کوئی قیامت تو نہیں آئی ہے۔ یہاں جتنے بزرگ ہیں' وہ میرے کمرے میں چلیں۔ اس سے پہلے کہ دلہن کے میکے والے آئیں' ہمیں دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرا دینا چاہئے۔"

ایک بزرگ نے کہا "ہاں لازمی کی بات ہے۔ دونوں بھائی آپس میں لڑیں گے تو دلہن کے میکے والے بھاری پڑ جائیں گے۔"

دوسرے نے کہا "خون پھر خون ہوتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے' ابھی دونوں بھائی گلے ملیں گے۔ آؤ چلو۔"

وہ تمام بزرگ ایک کمرے کی طرف جانے لگے۔ وجاہت سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپری منزل کے ایک کمرے میں آیا۔ پھر دروازے کو اندر سے بند کر کے بیٹھ گیا۔ رات کے دو بجے تھے۔ کسی رشتے دار کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ حویلی میں سب جاگ رہے تھے۔ سب کو اس ڈرامے کے ڈراپ سین کا بے چینی سے انتظار تھا۔

دراصل سلطانہ نے پیدا ہو کر یہ بے چینی پھیلائی تھی۔ کسی بھی جاگیردار یا وڈیرے کے علاقے میں کوئی حسین لڑکی جوان ہوتی ہے اور اس کے حسن و شباب کا چرچا غیر معمولی طور پر دور تک پھیلتا ہے' بڑی بڑی محفلوں میں اس کے تذکرے سے شراب دو آتشہ ہو جاتی ہے تو وہ حسینہ تمام جاگیرداروں' وڈیروں اور سیاست دانوں کے لئے ایک ضد بن جاتی ہے۔ ان کے ہاں جتنی بیویاں اور داشتائیں ہوتی ہیں' وہ پھیکی پڑ جاتی ہیں۔ ایک غیر معمولی حسینہ کی جوانی کا حصول ایک چیلنج بن جاتا ہے۔

کتنے ہی بڑے لوگوں نے سلطانہ کے لئے رشتہ بھیجا۔ اپنی تصویروں کے ساتھ اپنی دولت جائیداد' کوٹھیوں اور کاروں کا بھی حساب پیش کیا۔ مہر کے طور پر سیکڑوں ایکڑ زمین لکھنے کو تیار رہے۔ ادھر چودھری وجاہت علی اور چودھری شرافت علی بھی اسے اپنانا چاہتے تھے۔ وجاہت نے کہا "میں بڑا بھائی ہوں' پہلے میری شادی ہوگی۔"

شرافت نے کہا "تم بڑے ہو تو میں بھی نابالغ نہیں ہوں۔ تم ہر معاملے میں بڑے بن کر میرا حق مارتے ہو۔ میں سلطانہ کے معاملے میں چھوٹا بن کر نہیں رہوں گا۔ وہ میری ضد ہے۔ میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔"

ماں نے بھائیوں میں جھگڑا بڑھتے دیکھا تو فیصلہ کیا کہ دونوں بھائیوں کا رشتہ بھیجا جائے گا۔ رشتہ مانگنے والے اپنی تصویریں بھی

بھیجی تھیں۔ ظاہر ہے ان تصویروں کے ذریعے سلطانہ کی پسند معلوم کی جاتی ہوگی۔ یہ خبر ملی کہ چودھری ملک نواز نے چودھری وجاہت علی کو داماد بنانا منظور کیا ہے۔ والدین نے اپنی منظوری دی تھی۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ بیٹی نے اسے پسند کیا ہے۔

یہ بہت بڑی خوش قسمتی تھی کہ جس کی خوشبو میلوں تک پھیلی ہوئی تھی اور وہ بڑی ممتاز شخصیتوں کے لئے انا کا مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ اس حسینہ نے وجاہت کے حق میں ووٹ دیا تھا۔

اس خوش بختی پر شرافت بپھر گیا "میں اس فیصلے کو نہیں مانتا۔ امی نے بڑے بیٹے کا ساتھ دیا ہے۔ میری تصویر سلطانہ کے پاس نہیں بھیجی گئی۔ میں دور دور تک کے جوان تسلیم کیا جاتا ہوں۔ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔"

ماں نے قسمیں کھا کر یقین دلایا "تم دونوں میری دو آنکھیں ہو۔ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی ایک آنکھ نہیں پھوڑ سکتی۔ ماں اپنی کسی اولاد سے ناانصافی نہیں کرتی۔ میں نے تیری تصویر بھی بھیجی تھی۔"

لیکن اس نے چیلنج کر دیا "یہ شادی نہیں ہوگی۔ اور ہوگی تو بربادی ہوگی۔ ہاں ایک شرط پر سمجھوتا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ اگلا الیکشن میں لڑوں گا۔"

وجاہت نے کہا "ہماری سیاسی پارٹی مجھے الیکشن کے لئے ٹکٹ دے رہی ہے۔ تم پارٹی کے فیصلوں کے خلاف کیسے امیدوار ہو گے؟"

"بہت آسان ہے۔ مخالف پارٹی مجھے ٹکٹ دے رہی ہے۔ اس حلقے سے میں تمہارے خلاف کھڑا ہو گیا تو یہاں سے تمہارے پچاس فیصد ووٹ لے جاؤں گا۔ نہ تمہارا بھلا ہوگا نہ میرا۔ تیسرے امیدوار کو ہمارے جھگڑے سے فائدہ پہنچے گا۔"

وجاہت نے کہا "اتنی دانائی سے سیاست کر سکتے ہو پھر مجھے کیوں چیلنج کر رہے ہو؟"

"اس لئے کہ تمہاری گندی سیاست سمجھ میں آتی ہے۔ ہماری سیاسی پارٹی میں تمہیں سر پر بٹھایا جاتا ہے۔ تم چاہتے تو میں صوبائی اسمبلی کا امیدوار بن سکتا تھا۔ مگر تم لوگوں نے اپنے ایک چمچے کو امیدوار بنایا۔ خود قومی اسمبلی کے لئے کھڑے ہو گئے۔ یہاں دو محاذوں پر مجھے پیچھے دھکیل کر اب سلطانہ کے محاذ سے بھی نکال رہے ہو۔"

"تم سیاست میں سلطانہ کو کیوں گھسیٹ رہے ہو؟"

"مجھے احمق نہ سمجھو۔ تم الیکشن سے پہلے سلطانہ سے شادی کرو گے تاکہ اس کی جاگیر کے ہزاروں ووٹ تمہاری جھولی میں آ جائیں۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔ یہ سیاسی شادی ہے۔"

وہ کوئی جواب سنے بغیر غصے میں تلملاتا ہوا چلا گیا۔ اس کا چیلنج بدستور تھا کہ یہ شادی نہیں بربادی ہوگی۔

وجاہت خیالات سے چونک گیا۔ ملازم دروازے پر دستک دے کر کہہ رہا تھا "جناب عالی! چودھری ملک نواز آ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ پولیس والے بھی ہیں۔"

وہ فوراً ہی دروازہ کھول کر باہر گیا۔ سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے پہنچا۔ ڈرائیور احاطے میں گاڑی لے گیا تھا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ایک ملازم سے پوچھا "کیا چودھری سسر جی میں داخل ہو گئے ہیں؟"

ملازم نے کہا "ابھی وہ پہلی چوکی کے پاس تھے۔"

گاڑی آگے بڑھ گئی۔ وہ زیادہ دور استقبال کے لئے نہ جا سکا۔ سسر کا قافلہ سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے قریب پہنچ کر گاڑی رکوائی۔ پھر پیدل چلتا ہوا چودھری ملک نواز کی طرف جانے لگا۔ سسر نے داماد کو پیدل اور ہنستا آتے دیکھ کر قافلے کو رکنے کا حکم دیا۔ پھر داماد ہی سے سوال کیا "مجھے سلام کرنے سے پہلے یہ بتاؤ میری بیٹی کس حال میں ہے؟"

وہ آگے بڑھتا ہوا بولا "چودھری چاچا! تمہاری بیٹی کو میری ذات سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ اگر کوئی تکلیف پہنچی تو میں مجرم ہوتا۔ اور مجرم تنہا بھی نہیں آتا۔"

ملک نواز نے کہا "ارے وجاہت! میرے سوال کا سیاسی جواب نہ دے۔ تو کہتا ہے میری بیٹی کو تیری ذات سے تکلیف نہیں پہنچی۔ اس کا مطلب ہے وہ دوسرے کی ذات سے پہنچی ہے اور تو تکلیف پہنچانے والے کو جواب کی ہیرا پھیری میں چھپا رہا ہے۔"

"میری سیاست باہمی سلامتی کے لئے ہے چودھری چاچا! میں گھریلو اور سیاسی معاملات میں تجھ سے پیار کرتا ہوں مگر ایک حق کی بات کہتا ہوں۔ بچوں اور بیٹیوں کا ذکر چار دیواری سے باہر نہیں ہونا چاہئے۔ میں تجھے خوش آمدید کہتا ہوں۔ جو بھی معاملہ ہے اسے حویلی کے اندر نمٹایا جائے گا۔"

انسپکٹر نے آگے بڑھ کر وجاہت سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "آپ کے سسر نے کمشنر صاحب کو فون پر بتایا تھا۔ کمشنر صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ میں یہ معاملہ نمٹاؤں۔"

پھر انسپکٹر نے چودھری ملک نواز سے کہا "چودھری صاحب! آپ بزرگ ہیں۔ اوپر تک آپ کی پہنچ ہے۔ آپ کو اطمینان ہونا چاہئے کہ آپ کی صاحبزادی سے کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ چودھری وجاہت علی صاحب نے بہت خوب کہا ہے کہ بچوں اور بیٹیوں کی باتیں چار دیواری میں مناسب ہوتی ہیں۔"

ملک نواز نے کہا "ٹھیک ہے، حویلی چلو۔"

وجاہت نے کہا "چودھری چاچا! اب میں سلام کر سکتا ہوں۔"

اس نے السلام علیکم کہا۔ ملک نواز نے غصے سے منہ پھیر لیا۔ قافلہ آگے بڑھنے لگا۔ وجاہت اپنی کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ انسپکٹر نے حویلی کے سامنے پہنچ کر ملک نواز سے کہا "آپ کے مسلح آدمی حویلی کے باہر رہیں گے۔ میں مسلح سپاہیوں کو لے کر آپ کے ساتھ اندر

جاؤں گا۔"

حویلی کا بڑا ہال رشتے داروں سے خالی کرایا گیا۔ ملک نواز نے اندر آتے ہی پوچھا "میری بیٹی کہاں ہے؟"

وجاہت انہیں ساتھ لے کر اس کمرے تک آیا' جہاں سلطانہ نے خود کو قید کر رکھا تھا۔ وجاہت کی ماں نے چند بزرگوں کے ساتھ آ کر کہا "السلام علیکم بھائی صاحب!"

وہ بولا "میں نے ابھی تک داماد کے سلام کا جواب نہیں دیا ہے۔ السلام علیکم کے معنی ہیں تم پر سلامتی ہو اور میں بوا! اس وقت تک کسی پر سلامتی نہیں چاہوں گا جب تک اپنی بیٹی کو صحیح سلامت نہ دیکھ لوں۔"

سلطانہ نے باپ کی آواز سنتے ہی دروازہ کھول دیا۔ پھر تیزی سے آ کر سینے سے لگ گئی۔ باپ نے کہا "میں تجھے بچپن سے دیکھتا رہا ہوں۔ تو ہزار زخم کھاتی ہے مگر آنکھ سے آنسو نہیں نکالتی۔ پھر باپ کی چھڑی ہے۔ چل ذرا الگ ہو جا۔ مجھے دیکھنے دے۔ تیرا ہاتھ زخمی کیسے ہوا؟"

وہ زخمی ہاتھ دکھاتے ہوئے بولی "ابا جی! میں نے خود اسے زخمی کیا ہے۔"

"تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"اس لئے کہ میری انا زخمی ہوئی تھی۔"

"کھل کر بتاؤ بات کیا ہے؟"

"میں بتاتا ہوں" شرافت علی نے رشتے داروں کے درمیان سے آگے آتے ہوئے کہا "آپ کی جاگیر میں تین ہزار آٹھ سو ووٹر ہیں۔ آپ اپنے آس پاس کے علاقوں سے مزید ہزاروں ووٹ دلا سکتے ہیں۔ یہ حساب لگانے کے بعد میرے بھائی نے آپ کی بیٹی سے شادی کی ہے۔ میں نے بہت سمجھایا کہ مجھے سلطانہ سے شادی کرنے دو۔ چودھری ملک نواز کے پاس میری تصویر بھیج دو کیوں کہ میں سیاسی مکاری نہیں جانتا۔ میں ایک شریفانہ ازدواجی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں یقین سے کہتا ہوں کہ آپ کا داماد بننے کا جو جائز حق دار تھا' اس کی تصویر آپ تک نہیں پہنچائی گئی۔"

چودھری ملک نواز نے کہا "تمہاری باتوں سے پتا چل رہا ہے کہ تم چودھری شرافت علی ہو۔ کوئی دس برس پہلے تمہیں دیکھا تھا۔ پھر آج دیکھ رہا ہوں۔ ویسے تمہاری کوئی تصویر میرے پاس نہیں آئی تھی۔"

شرافت نے طنزیہ نظروں سے ماں کو دیکھا۔ ماں نے وجاہت سے کہا "بیٹے! تم گواہ ہو۔ میں نے لفافے میں تمہاری تصویر کے ساتھ شرافت کی بھی تصویر رکھی تھی۔"

شرافت نے کہا "جی ہاں اور وہ لفافہ بھائی جان کا خاص ملازم لے گیا تھا۔"

ملک نواز نے کہا "میں اپنی بیٹی کے معاملے میں یہاں آیا ہوں اور تم لوگ تصویر کے معاملے میں الجھ رہے ہو۔"

شرافت نے کہا "میں سمجھا رہا ہوں۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ جب مجھ جیسے سگے بیٹے اور سگے بھائی کے ساتھ ایک تصویر کے سلسلے میں دھوکا ہو سکتا ہے تو آپ کی بیٹی تصویر نہیں ہے' زندہ حقیقت ہے۔ اس کے ساتھ مجھ سے بھی برا سلوک ہوگا۔"

سلطانہ نے پوچھا "اور تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟"

وہ بولا "میں تمہارے پاس محبت سے سمجھانے گیا تھا کہ تم یہاں محبت سے نہیں سیاست سے لائی گئی ہو۔ تمہیں مجھ سے چھین لیا گیا ہے۔"

"اس لئے تم مجھے میرے شوہر سے چھین لینا چاہتے ہو؟"

شرافت نے کہا "اگر میرا بھائی تمہارا شوہر ہو' تو میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں' جتنا سمجھا جا رہا ہوں۔ میں نے ایک عالم صاحب کو بلایا ہے۔ وہ تمہیں سمجھائیں گے کہ صرف نکاح پڑھانے سے کوئی کسی کا مجازی خدا نہیں بن جاتا۔"

سلطانہ نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ مزید بولا۔ "ورنہ وہ شوہر ہوتا ہے جو دلہن کے کمرے میں پہلے آتا ہے۔ ابھی تمہارا کسی سے کوئی گھرا دلی اور جذباتی رشتہ نہیں ہے۔ تم سوچ اور فیصلہ کرو۔ میں نے ثابت کر دیا ہے کہ میرا یہ بھائی صرف اور صرف سیاستداں ہے۔ اسمبلی تک پہنچنے کے لئے تمہیں یہاں لایا ہے۔"

وہ اپنی بات کہہ کر جانے لگا۔ وجاہت نے کہا "شرافت! تم مجھ سے بھی بڑے سیاستداں نکلے۔ سلطانہ کو نئے مسئلے میں الجھا دیا۔ کیوں سلطانہ! تم نے اس کے خلاف چیخ چیخ کر ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ اپنے ابا جی کو میکے سے بلا لیا۔ لیکن اس نے تمہیں کوئی الزام لگانے کا موقع ہی نہیں دیا۔"

وہ بولی "میں یہاں گھونگھٹ میں منہ چھپا کر آئی۔ میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ آپ کو بھی گھونگھٹ اٹھنے کے بعد نہیں دیکھا صرف چودھری وجاہت علی زندہ باد کے نعرے سنے۔ اب شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ میں محبت کرنے والوں کے خاندان میں نہیں سیاست کرنے والوں کی دلدل میں دھنس گئی ہوں۔"

"سلطانہ! میرے خلاف نہ سوچو۔ یہ غلط ہے کہ میں نے تمہارے ابا جی کے ذریعے ہزاروں ووٹ حاصل کرنے کے لئے تمہیں اپنایا ہے۔ میں خدا سے ڈرتا ہوں' جھوٹ نہیں بولوں گا۔ تمہیں شریک حیات بنانے کے لئے میں نے بھائی سے دھوکا کیا۔ جو لفافہ تمہارے گھر جا رہا تھا اس میں سے شرافت کی تصویر غائب کرا دی تھی۔ یہ فریب ضرور ہے مگر میری محبت کا ثبوت بھی ہے۔"

بھیڑ میں سے شرافت کی آواز آئی "او بھائی جان اور وڈے چودھری! میں کہیں نہیں گیا ادھر ہی موجود ہوں۔ ابھی تیری سچائی کا پتا چل جائے گا۔ تو نے ووٹ حاصل کرنے کے لئے شادی نہیں کی ہے تو دلہن تیری' سیاست میری۔ مجھے الیکشن لڑنے دے۔ سلطانہ کے سامنے ثابت کر دے کہ تو اس سے محبت کرتا ہے۔ سیاست

نہیں کرتا ہے۔"

بات بڑھتی جا رہی تھی۔ رشتے دار وہاں کرسیاں ڈال کر رکھ رہے تھے تاکہ وہ آرام سے بیٹھ کر بات بڑھاتے رہیں۔ لیکن وہ ایک دوسرے سے الجھنے والے جوش اور غصے میں تھے۔ وہ ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ وجاہت نے بڑے جوش اور جذبے سے سلطانہ کو دیکھا۔ پھر کہا "میں اپنی شریکِ حیات کے لئے سیاست کو (کیا) دنیا کو بھی چھوڑ سکتا ہوں۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ اپنی پارٹی کے کسی بھی لیڈر کے حق میں بیٹھ جاؤں گا۔"

چودھری ملک نواز نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا "شاباش! پتر! تو نے اپنی سچائی ثابت کر دی۔"

سلطانہ نے کہا "معاملہ کچھ اور تھا اور اسے کچھ اور رنگ دے دیا گیا تھا۔ اب جب کہ سیاست کی باتیں ختم ہو چکی ہیں میں اس خاندان کے بزرگوں سے پوچھتی ہوں۔ چودھری شرافت علی میرے کمرے میں کیوں آیا تھا؟"

ماں نے کہا "دلہن جو بات ختم ہو گئی ہے اسے پھر کیوں شروع کرنی ہو؟"

وہ ساس سے بولی "میں عزت دار گھرانے سے آئی ہوں۔ میری عزت پر آنچ آئی ہے اس لئے بات ختم نہیں ہو گی۔"

"میرا بیٹا تمہارے کمرے میں چلا گیا تو کون سی قیامت آ گئی۔ آخر وہ رشتے میں دیور ہے۔"

سلطانہ نے اپنی ساس کو ناگواری سے دیکھا۔ پھر اپنی الٹی ہتھیلی وجاہت کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی "کیا میں بتاؤں؟ یا آپ زبان کھولیں گے۔"

وہ بولا "امی! شرافت نے ایسی بے ہودگی کی ہے جسے میں آپ کی خاطر برداشت کر رہا ہوں۔ آپ شرافت کی بے جا حمایت نہ کریں۔ میں اپنے بزرگوں سے التجا کرتا ہوں کہ بات بڑھنے سے پہلے کوئی معقول سمجھوتا کرا دیں۔"

بزرگوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک نے سلطانہ سے کہا "دلہن بیٹی! تم اس حویلی اور اس خاندان کی عزت بن کر آئی ہو یہاں کی عزت کو برقرار رکھنا تمہارا فرض ہے۔ جو کچھ ہوا اس پر غصے سے نہ سوچو۔ ایسی راہ اختیار کرو کہ آئندہ پھر ایسا نہ ہو۔"

دوسرے بزرگ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "ہر شریف زادی کو اپنی عزت کے لئے ایسے ہی لڑنا چاہئے جیسے تم نے لڑائی کی ہے۔ تم جیت گئی ہو۔ کاش کہ شرافت کو شرم آئے نہ آئے مگر ہم شرمندہ ہیں۔"

باپ نے کہا "بیٹی! میں بہت غصے میں آیا تھا۔ لیکن یہ تمام بزرگ تمہارے سامنے شرمندہ ہیں۔ چلو غصہ تھوک دو۔ میں نے تمہیں بزرگوں کے سامنے جھکنا سکھایا ہے۔"

وہ سر پر گھونگھٹ درست کرتے ہوئے بولی "ابا جی! آپ نے جس شرافت، شرم و حیا اور پاکیزگی کی تعلیم دی تھی، وہ میری طرح محفوظ ہوئی ہے۔ میں تمام بزرگوں کے آگے سر تسلیم خم کرتی ہوں۔ لیکن میرے دماغ کو زبردست دھچکا لگا ہے۔ میں اس ماحول میں گھٹن محسوس کرتی ہوں۔ اپنے میکے میں کچھ دن رہنا چاہتی ہوں۔ اس لئے ابھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔"

ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ دلہن ابھی آئی ہو اور ابھی میکے چلی جائے۔ لیکن ایسی بات ہو گئی تھی کہ کوئی اسے جانے سے نہیں روک سکتا تھا۔ وجاہت ایک دم سے بے بس ہو گیا تھا۔ وہ شوہر کی حیثیت سے اسے روک نہیں سکتا تھا کیونکہ ایسے وقت بزرگ روکتے ہیں۔ شوہر روکے تو بے حیائی ہوتی ہے۔

وہ بار بار حسرت سے سلطانہ کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر پریشانی تھی کہ کیا کہے اور کیسے کہے؟ اس کی حرکتوں سے بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کا ہاتھ رہ رہ کر اٹھ رہا تھا۔ پھر نیچے جا رہا تھا جیسے اسکول کا بچہ استاد سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ پھر کسی امکانی غلطی کے خیال سے اٹھا ہوا ہاتھ نیچے کر لیتا ہو۔ ایک خاتون نے یہ حرکتیں دیکھ کر پوچھا "کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

وہ چونک گیا پھر بولا "نن ---- نہیں! میں تو ---- ہاں، وہ بات یہ ہے کہ ذہنی سکون کے لئے میکے جانا ضروری نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے ---- فیروزوالی کوٹھی خالی ہے۔ وہ کوٹھی میں نے نکاح کے وقت حق مہر میں لکھ دی تھی۔ سلطانہ وہاں رہ سکتی ہے۔"

ملک نواز نے کہا "خالی کوٹھی قبرستان کی طرح ہوتی ہے۔ میری بیٹی میکے میں رہے گی۔"

ملک نواز کے ساتھ آئے ہوئے ملازم سلطانہ کا ضروری سامان اٹھا کر باہر جانے لگے۔ وجاہت بے بسی سے سلطانہ کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی مجبوری سی مجبوری تھی کہ شوہر کی حیثیت سے اپنی بات نہیں منوا سکتا تھا۔

سلطانہ نے سامنے آ کر کہا "آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ سیاست سے زیادہ میں آپ کے لئے اہم ہوں۔ ابھی میرے دماغ پر بوجھ ہے۔ میری جو توہین ہوئی اسے برداشت کر رہی ہوں، اس کا اثر زائل کرنے کے لئے جا رہی ہوں ورنہ آپ کو تنہا نہ چھوڑتی۔ میری ایک بات مان لیں۔ سیاست نہ چھوڑیں۔ آپ کی کامیابی میری کامیابی ہو گی۔"

وہ اپنے باپ کا ہاتھ تھام کر اس کے سامنے سے گزر گئی۔ وجاہت اسے رخصت کرنے باہر گاڑی تک آیا۔ جب وہ چلی گئی تو وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ حویلی کے اندر کیوں جاتا؟ دلہن کے بستر پر پھولوں کی پتیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اب وہ انگاروں کی طرح اسے کروٹ کروٹ داغنے والی تھیں۔

حویلی کے اندر ایک کھڑکی سے شرافت اس گاڑی کو دیکھ رہا تھا جس میں دلہن واپس گئی تھی۔ اس کی زندگی میں کتنی ہی حسین لڑکیاں آتی رہی تھیں، جاتی رہی تھیں۔ لیکن کبھی کوئی گھونگھٹ میں نہیں آئی تھی۔ پردہ اٹھانے کے بعد جو حسن نظر آتا ہے، وہ

"خوبصورتی میں گمان ہوا کرتا ہے' دل کو دھڑکاتا ہے' مگر گمان تو گمان ہی ہے۔ وہ سلطانہ کا گھونگھٹ اٹھا کر حیران رہ گیا تھا۔ آنکھوں میں اب تک وہی تصویر بسی ہوئی تھی۔ حالانکہ تصویر تک پہنچ کر وہ پیاس باقی رہ گئی تھی جو کنویں کی منڈیر تک پہنچ کر بھی لوٹنے کے بعد رہ جاتی ہے۔

کنواں لبالب بھرا ہو تو ایسے میں پیاس خطرناک ہو جاتی ہے۔
شرافت کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ بڑے بھائی کو سیاست سے ہٹا کر اس کی جگہ لینا چاہے گا اور سلطانہ کو سوہا جائے گا تو خود اس کے حسن و شباب کے آگے ایک سوالی بن جائے گا۔ گھونگھٹ اٹھانے کے بعد پتا چلا کہ اس نے ناگن کا پٹارہ کھول دیا ہے۔ کئی میل کی دوری تک اس کی زہریلی جوانی کا چرچا تھا۔ سب اسے بس میں کرنے کا منصوبہ سوچ رہے تھے۔ شرافت کی سمجھ میں آیا تھا کہ منصوبے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ناگن کے لئے ناگ بننا پڑے گا۔

وجاہت تمام دن الیکشن کے معاملات میں مصروف رہتا تھا۔ سیاسی مصروفیات کے لئے پوری نیند سونا لازمی ہوتا ہے تاکہ دوسرے دن ذہنی تازگی کے ساتھ مصروفیات جاری رہ سکیں۔ لیکن رات کو بستر پر سلطانہ کی یاد آ جاتی تھی۔ اس نے دو راتیں جاگ کر گزاریں۔ دن کو کام کے وقت بھی اونگھتا' کبھی غائب دماغ ہو جاتا۔ اس نے تیسری رات مجبور ہو کر نیند کی گولیاں کھائیں۔ چوتھے دن اس نے فون پر رابطہ کیا۔ پہلے تو کسی ملازم نے ریسیور اٹھایا۔ وجاہت کا نام سن کر تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر سسر کی آواز سنائی دی "ہیلو' چوہدری وجاہت علی! تم ہو؟"
"جی چوہدری چاچا! السلام علیکم۔"
"بیٹے! اس روز میں نے تمہارے سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔ آج وعلیکم السلام کہتا ہوں۔ تم پر بھی اللہ کی طرف سے سلامتی ہو۔"
وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "میں... میں اپنی شریک حیات سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"
"ضرور کرو مگر یاد رکھو' جب تک تمہاری حویلی میں شیطان ہے میری بیٹی سے وہاں جانے کی بات نہ کرنا۔"
تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر سلطانہ کی آواز سنائی دی "ہیلو میں بول رہی ہوں۔"
"کیسی ہو؟"
"جی رہی ہوں۔ آپ سنائیں؟"
"مر رہا ہوں۔ تم اپنے ذہنی سکون کے لئے میکے گئیں اور میرا سکون لے گئیں۔ کل رات میں نے نیند کی گولیاں کھائیں۔ سنا ہے اس کی عادت پڑ جائے تو پھر دو چار گولیوں سے بھی نیند نہیں آتی۔ سیاسی معاملات میں دماغ حاضر نہیں رہتا ہے۔ تم سمجھ سکتی ہو' سیاسی لیڈر کہیں سے بھی ذرا کمزور پڑ جائے تو حریف اسے اسمبلی میں پہنچنے سے پہلے پچھاڑ دیتے ہیں۔"
"میں تو سمجھ رہی تھی' آپ سب کچھ بھول کر کامیابی کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے ہوں گے۔"
"میں سب کچھ بھول سکتا ہوں۔ تمہیں بھول کر دنیا کو نہیں جیت سکتا۔ میں ہار جاؤں گا سلطانہ! میں اندر سے بالکل خالی ہو گیا ہوں۔ یہاں صرف میرا جسم ہے۔ ذہانت اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں تو تم لے گئی ہو۔"
وہ چپ رہی۔ سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے کہا "میں نے کئی بار سوچا۔ تم سے ملنے کو آؤں۔ پھر سوچا تم میرے گھر سے واپس گئی ہو۔ مجھے بھی تمہارے دروازے سے واپس کر دیا جائے گا۔"
"آپ نے درست نہیں سوچا۔ آپ میرے ساتھ آج رات کا کھانا کھائیں گے؟"
وہ ایک دم سے خوش ہو کر بولا "سچ؟"
اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے ہیلو ہیلو کہا۔ سلطانہ کو آوازیں دیں۔ پھر سمجھ میں آیا' دعوت دینے والی نے شرما کر ریسیور رکھ دیا ہے۔
وہ خواب گاہ میں اکیلی تھی۔ ایک صوفے پر بیٹھی سامنے پلنگ کو دیکھ رہی تھی۔ اس بستر پر وہ بچپن سے سوتی آئی تھی۔ صرف تے ارمان کے پلنگ بدلتے رہے تھے ورنہ بیٹی کا بستر وہی تھا' جہاں اسے وقت پر نیند آ جایا کرتی تھی۔ لیکن سسرال سے پہلی ہی رات واپس آنے کے بعد سے اس کی نیند اڑ گئی تھی۔ سہاگ کی سیج سے واپس آنے والی جوانی کو بچپن کے بستر پر نیند نہیں آتی تھی۔
وہ خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کر کے فرش پر سو گئی تھی۔ اب تو بستر کو دیکھتے ہی شعلے سے لپکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔
وجاہت نے فون پر مختصر گفتگو میں اپنے جذبات کو بڑی حد تک پیش کر دیا تھا۔ وہ کچھ نہ کہہ پائی تھی۔ رات کو کھانے پر بلا کر شرما گئی تھی۔ یہ سوچ کر پریشان ہو گئی تھی کہ دعوت دے کر اپنانے میں کہیں کوئی بے حیائی تو نہیں ہو گی؟
وہ بیٹھے بیٹھے اچانک ہی چونک پڑی۔ ایسا لگا وجاہت ایک دم سے سامنے آ گیا ہے۔ جب کہ فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ خیالات سے چونکتے ہی وہ گھنٹی خاموش ہو گئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں ایک ملازم نے ریسیور اٹھا لیا تھا۔ پھر اس نے انٹرکام کے ذریعے اطلاع دی "بی بی جی! آپ کا فون ہے۔"
سلطانہ نے دھڑکتے ہوئے دل سے ریسیور اٹھایا' اسے کان سے لگایا پھر کہا "ہیلو میں بول رہی ہوں۔"
"میری آواز سن کر ریسیور نہ رکھنا۔"
سلطانہ کو وہ آواز چھری کی طرح لگی۔ شرافت کہہ رہا تھا "میری باتیں سنو گی تو تمہارا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ تم نے ثابت کر دیا ہے کہ کوئی غلط بات ہو تو تم گھونگھٹ میں بھی سر اٹھا کر بولتی ہو اور غلطی کے خلاف جنگ جاری رکھتی ہو۔ اور اگر سچ بات ہو تو اسے

ساتھ گزار لیتی تو اس کی پارسائی مشکوک نہ ہوتی۔ شرافت کے خلاف ہنگامہ برپا کر کے اور پہلی رات شوہر کو چھوڑ کے وہ ثابت کر چکی تھی کہ شرافت کے ساتھ کچھ ہو گیا ہے۔ بلکہ بہت کچھ ہو گیا ہے۔

وہ خود اپنی بدنامی کے لئے راستہ ہموار کر کے آئی تھی۔ عورتوں کے ساتھ یہ ایک المیہ ہے کہ عزت و آبرو پر حرف آئے تو اسے چھپانا پڑتا ہے۔ اپنے ہونٹ سی لینے پڑتے ہیں۔ انا اور خودداری سے بغاوت کرنے والی لڑکیاں اپنے ہی باغیانہ رویے سے داغ دار ثابت ہو جاتی ہیں اور تمام عمر داغ لگانے والے کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔

کوئی لڑکی جان بوجھ کر بدنامی مول نہیں لیتی۔ سلطانہ نے بھی جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ بچپن سے حسین کہلاتی تھی۔ کسی کی محتاج نہیں تھی۔ کسی سے مرعوب نہیں تھی، اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے اپنا ناخن تک کسی کو چھونے نہیں دیا تھا۔ ایسے میں جب ایک نامحرم اس کے ناخن سے بھی آگے بڑھ گیا تو وہ اپنی توہین برداشت نہ کر سکی۔ بڑے باپ کی بیٹی بارود کی طرح پھٹ پڑی۔ سمجھ میں یہ حقل نہ آئی کہ وہ خود اپنی بدنامی کا سامان کر رہی ہے۔

سوچتے سوچتے وقت گزرنے کا کچھ پتا نہ چلا۔ ملازمہ نے آکر بتایا کہ چودھری وجاہت علی تشریف لائے ہیں، بیٹھک میں چودھری صاحب کے ساتھ شربت پی رہے ہیں۔ ابھی یہاں تشریف لانے والے ہیں۔

آنے والے کا انتظار تھا لیکن اب اُس کی آمد سے وہ پریشان ہو رہی تھی۔ جلدی جلدی سوچنے لگی کہ وجاہت سے اس مسئلے پر کس طرح گفتگو کی جائے۔ وہ ہجر کا مارا بڑی حسرتوں کے ہجوم میں پھر ایک بار دلہن کے پاس آ رہا تھا اور دلہن اسے پھر سنجیدہ مسئلے میں الجھانے والی تھی۔

اس نے اٹھ کر آئینہ دیکھا۔ الجھے ہوئے بال اور متفکر چہرہ آنے والے کو یہی سمجھاتا کہ وہ بھی ہجر کی ماری ہے۔ اگرچہ یہ درست تھا لیکن اب وہ اپنی پیار بھری کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کمرے سے نکلی اور ملازمہ کو بلا کر کہا۔

"صاحب آئیں تو انہیں کمرے میں بٹھانا۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ وہاں سے چلتی ہوئی اور سوچتی ہوئی دوسرے کمرے میں آئی۔ ایک سنگار میز کے آئینے میں دوبارہ اپنا جائزہ لیا پھر واش روم میں آئی۔ واش بیسن کا نلکا کھول کر جھک گئی۔ دونوں ہتھیلیوں میں پانی بھر بھر کر چہرے پر یوں چھینٹے مارنے لگی جیسے چہرے سے مسائل کو دھو رہی ہو۔ اچھی طرح صابن سے منہ ہاتھ دھونے کے بعد وہ تولیے سے منہ پونچھتی ہوئی کمرے میں آئی، سنگار میز کی لائٹس آن کر کے دیکھا تو تیز روشنی میں پتا چلا کہ پانی کے مسلسل چھینٹوں نے

اس کی آنکھوں کو سرخ کر دیا ہے۔ سرخ آنکھیں تو رت جگے اور جذبات کی چغلیاں کھاتی ہیں۔ ایک پریشانی کو چھپانے کی کوشش میں دوسری گلے پڑ گئی تھی۔

اس نے بستر پر لیٹ کر دونوں آنکھوں میں گلاب کا عرق ٹپکایا اور ایک منٹ تک لیٹی رہی۔ پھر اٹھ کر آئینے کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ آنکھوں میں کاجل لگانے لگی۔ وہ میک اپ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ صرف آنکھیں چھپانا چاہتی تھی۔ تاکہ آنے والا کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے۔

وہ کمرے سے نکل کر کوریڈور میں آئی پھر اپنی خوابگاہ کے دروازے پر پہنچ کر دیکھا۔ وجاہت صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی شوہر اپنی بیوی کی تعظیم کے لئے نہیں اٹھتا۔ یہ تعظیماً اٹھنا بتا رہا تھا کہ ابھی وہ بیوی نہیں ہے، ایک ایسی حسین عورت ہے جسے حاصل کرنا باقی رہ گیا ہے۔ حاصل ہونے کے بعد وہ بیوی ہوگی اور تعظیم رخصت ہو جائے گی۔

شرافت نے غلط نہیں کہا تھا کہ ابھی وہ وجاہت کی بیوی نہیں ہے اور وجاہت بے اختیار اپنے عمل سے ثابت کر رہا تھا کہ صرف نکاح پڑھ جانے سے عورت بیوی نہیں بن جاتی۔ بیوی بنانے کے لئے اسے تعظیم کے مقام سے نیچے گرانا پڑتا ہے۔

سلطانہ نے کمرے میں آکر اسے سلام کیا پھر کہا "معافی چاہتی ہوں، آپ کو انتظار کرنا پڑا۔"

"میں تمام عمر ایک پاؤں پر کھڑے رہ کر تمہارا انتظار کر سکتا ہوں۔"

وہ سامنے آکر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ وجاہت نے کہا "کاجل لگانے سے آنکھیں خوبصورت ہو جاتی ہیں۔ لیکن تمہاری خوبصورت آنکھوں نے کاجل کا حسن بڑھا دیا ہے۔ یہ کاجل یہاں نہ ہوتا تو کہیں نہ ہوتا۔"

وہ سر پر آنچل درست کرتے ہوئے بولی "اپنی تعریف سن کر خوشی ہوئی ہے لیکن میں خوش ہونا چاہتی ہوں تو میرے حالات مجھ پر ہنستے ہیں۔"

"حالات؟ کیسے حالات؟"

"سوچتی ہوں سسرال سے واپس آنا کہاں تک مناسب تھا؟"

"ہاں، حالات نے مجبور کیا، تمہیں غصہ آگیا۔ بات ایسی ہو گئی کہ میں تمہیں روکنے کے حق سے محروم ہو گیا۔ بہر حال جو ہوا اُسے بھول جاؤ۔"

"میرے اور آپ کے بھولنے سے کیا ہوتا ہے، دنیا تو نہیں بھولے گی۔"

"دنیا والے بہت کچھ بولتے ہیں پھر بولتے بولتے ایک دن تھک کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ مجھے یہ سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ تم نے اپنے آپ کو صرف میرے لئے رکھا ہے۔ کوئی دوسرا ہاتھ لگائے تو چیخ پڑتی ہو۔"

"تمہاری یہ پارسائی میرے لیے عذاب بن گئی ہے۔ اب باتیں بنیں گی کہ میں داغدار ہوں۔"

"کس کی مجال ہے کہ تم پر انگلی بھی اٹھائے۔"

"جاگیردارانہ بڑک لگانے سے حقیقت نہیں بدلے گی۔ اگر میں پہلی رات میکے نہ آتی، جو ہوا تھا اسے برداشت کر کے سسرال میں رہ جاتی تو معاملہ اسی چار دیواری میں ختم ہو جاتا۔"

"سلطانہ! مجھے تو خوشی ہے کہ تم نے ایک سچی عورت کی طرح احتجاج کیا اور ثابت کیا کہ میرے سوا تمہیں کوئی چھو نہیں سکتا۔"

"مگر اس نے چھو لیا تھا۔ اور یہ بات آگے بڑھے گی۔ میں آپ کے ساتھ ازدواجی زندگی گزاروں گی لیکن اس کے نام سے بدنام رہوں گی۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔ یہ معاملہ رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا۔"

"شرافت اسے کبھی ختم نہیں ہونے دے گا۔"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا "وہ سانپ میری آستین میں پل رہا ہے۔ اگر میں اسے آستین سے نکال کر دور پھینک دوں۔ اگر تمہیں اس سے دور رکھوں۔ اگر تم اس حویلی میں کبھی نہ جاؤ اور ہم شہر میں رہ کر نئی زندگی شروع کریں تو بات بن سکتی ہے۔"

"بات صرف اسی طرح بنے گی کہ شرافت یہ لکھ کر دے کہ اس نے دیور کی حیثیت سے میرے ساتھ مذاق کیا تھا۔ غلط فہمی کے باعث بات بڑھ گئی تھی۔ شرافت یہ غلط فہمی دور کر کے اپنی بھابی کو خود بھائی کے گھر لے آیا ہے۔"

"ہاں، یہ بات معقول ہے۔ آئندہ بدنامی کا اندیشہ نہیں رہے گا۔ میں کل ہی اپنے بزرگوں کی موجودگی میں شرافت سے یہ لکھواؤں گا۔"

ملازمہ نے آ کر کہا "آپ کے ابا جی یاد کر رہے ہیں۔ کھانا تیار ہے۔"

سلطانہ نے کہا "ہم آ رہے ہیں۔"

ملازمہ چلی گئی۔ وجاہت نے کہا "مجھ سے تمہارے ابا جی نے کہا تھا کہ میں تمہیں اپنی حویلی میں لے جانے کی بات نہ کروں۔ میں خود نہیں چاہتا کہ تم وہاں جاؤ۔ مگر میں نے جو کوٹھی تمہارے نام لکھی ہے، وہ تمہاری ہے۔ تمہارے سسرال والوں کی نہیں ہے۔ ہم کھانے کے بعد وہاں جا سکتے ہیں۔"

وہ ذرا کشمکش میں رہی پھر بولی "آپ کچھ خیال نہ کریں۔ پہلے شرافت سے لکھوا کر لے آئیں۔ پھر میں آپ کی ہوں۔ میں اندیشوں میں رہ کر نئی زندگی شروع نہیں کروں گی۔"

وہ مایوس ہو کر اٹھ گیا۔ سسر کے ساتھ بیٹھ کر مجبوراً روٹیاں کھائیں۔ کھانے کے دوران سوچتا رہا کیا شرافت سلطانہ کی مرضی کی تحریر لکھ دے گا۔ اس سے لکھوانا آسان تو نہیں تھا لیکن کوشش کی جا سکتی تھی۔ وہ بڑی خوشی سے دلہن کے ساتھ رات گزارنے گیا تھا۔ دلہن کوئی لوٹی جانے والی چیز نہیں تھی۔ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ابھی پتا نہیں کتنی بار اس کے دروازے سے نامراد جانا تھا۔

وہ نامراد اپنی ماں کے پاس گیا "امی! آپ کا بیٹا مجھے کانٹوں میں گھسیٹ رہا ہے۔"

"کیا دلہن نے آنے سے انکار کر دیا ہے؟"

"کیا وہ بدنام ہونے آئے گی۔ آپ چاہیں تو یہ مشکل آسان کر سکتی ہیں۔"

"میں تو دن رات دعا کرتی ہوں کہ دونوں بھائی آپس میں محبت سے رہا کریں۔ بولو میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"آپ شرافت سے یہ لکھنے کو کہہ دیں کہ اس نے دیور کے رشتے سے سلطانہ کے ساتھ مذاق کیا تھا۔ جس سے غلط فہمی ہوئی۔"

ماں نے بات کاٹ کر کہا "یہ تو میں نے دلہن سے اسی رات کہا تھا کہ دیور کمرے میں آ گیا تو کون سی قیامت آ گئی؟ مگر وہ تو بپھر پڑی تھی۔"

"امی! اس رات کی بات جانے دیں۔ ابھی جو کہہ رہا ہوں وہ لکھوا دیں۔"

شرافت نے کمرے میں آ کر کہا "میں سب سن رہا ہوں اور سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ بھائی جان! اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ تم نے سلطانہ سے کہا تھا، اس کی خاطر سیاست چھوڑ دو گے۔ الیکشن نہیں لڑو گے لیکن تمہاری سیاسی سرگرمیاں جاری ہیں۔"

"یہ سلطانہ کی خواہش ہے کہ میں الیکشن میں کامیاب ہو کر اسمبلی میں جاؤں۔"

ماں نے کہا "خدا کرے تمہیں کامیابی ہو مگر چھوٹے بھائی کے لیے تم نے کیا کیا؟ سیاسی پارٹی نے اسے صوبائی اسمبلی کے لیے ٹکٹ نہیں دیا اور تم خاموش رہے۔ میں نے سلطانہ کا رشتہ مانگنے کے لیے دونوں کی تصویریں بھیجیں۔ تم نے لفافے سے بھائی کی تصویر غائب کر دی۔ تمام بزرگوں اور رشتے داروں کے سامنے سلطانہ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہوئے اعلان کیا کہ سیاست چھوڑ دو گے۔ شرافت کو پھر امید ہوئی کہ اسے تمہاری جگہ الیکشن لڑنے کا موقع ملے گا لیکن تم بھائی نہیں ہو، دشمن ہو۔ اسے ہمیشہ پیچھے دھکیلتے رہے ہو، ہمیشہ نیچے گراتے رہے ہو۔"

شرافت نے کہا "صاف بات یہ ہے کہ میں نے تمہیں بھائی کہنا چھوڑ دیا ہے۔ میں سلطانہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا۔ ہاں یہ لکھ دوں گا کہ ہمارے درمیان سیاست اور سلطانہ نے بھائی کا رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے۔"

وجاہت نے کہا "ایسی تحریر سے سلطانہ اور بدنام ہو گی۔ بھائی کا رشتہ مجھ سے نہیں ہے تو کس رشتے سے اس کے کمرے میں گئے تھے؟"

"تم نے کس رشتے سے میری تصویر کھینچی تھی؟ جب تم ایسا کرسکتے ہو تو کیا میں ہاری ہوئی بازی جیتنے کے لئے کمرے میں نہ جاتا؟؟"
"یعنی تم انتقام لے رہے ہو؟"
"لے رہا ہوں نہیں' انتقام لیتا رہوں گا۔ اسے تمہاری زندگی میں آنے نہیں دوں گا۔"
وجاہت اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر بولا "مجھے غصہ نہیں آتا' اور سیاست میں یہی کامیابی کی دلیل ہے' اب تم دیکھو گے کہ سلطانہ کس طرح میری زندگی میں آتی ہے۔"
وہ پلٹ کر جانے لگا۔ شرافت اس کے پیچھے دروازے تک آگیا' بولا "تم بھی میری سیاست دیکھو گے۔ میں الیکشن لڑوں گا۔ تمہاری مخالف پارٹی نے مجھے ٹکٹ دیا ہے۔ پھر وہ عورت بھی میری ہوگی جو اب تک تمہاری نہ بن سکی۔"
وجاہت نے اپنے کمرے میں آکر دروازے کو اندر سے بند کرلیا اور بے چینی سے ٹہلنے لگا اسے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ شرافت دوسری پارٹی کے پلیٹ فارم سے آرہا ہے۔ ابھی اس نے خود ہی تصدیق کردی۔ اب سیاست اور سلطانہ دونوں محاذوں پر بھائی سے مقابلہ تھا۔
وجاہت کو یقین تھا' سیاست میں چھوٹے بھائی کو بری طرح شکست ہوگی لیکن سلطانہ کے محاذ پر بے یقینی تھی۔ کامیابی اسی صورت میں ممکن تھی کہ وہ جلد از جلد حاصل ہوجائے۔ شرافت کا یہ دعویٰ اہم تھا کہ سلطانہ ابھی تک اس کی بھی نہیں بن پائی ہے۔
ملازم نے دروازے پر دستک دے کر اطلاع دی کہ پارٹی کے اہم لیڈر ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ وہ کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ کسی سے مصافحہ کیا' کسی کو گلے لگایا۔ ایک نے کہا "چودھری صاحب! یہ اچھا نہیں ہوا۔ چھوٹے چودھری کو آپ کے مقابلے پر نہیں آنا چاہئے تھا۔"
وجاہت نے کہا "آنے دو جی آنے دو۔ کیا میری پوزیشن کمزور ہے؟"
ایک لیڈر نے کہا "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم تو چودھری شرافت کی بھلائی کے لئے کہہ رہے ہیں۔ اسے بری طرح شکست ہوگی۔"
دوسرے نے کہا "حریف کو کمزور اور نادان نہ سمجھو۔ چودھری شرافت گھر کے اندر سیاست کھیل رہا ہے۔ بھئی چودھری وجاہت صاحب' ایمان سے کہنا۔ کیا اس نے آپ کی شادی کو مسئلہ نہیں بنایا ہے؟"
تیسرے نے کہا "ابھی مجھ سے پوچھو۔ چودھری صاحب پوری توجہ سے الیکشن کے معاملات میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں اور یہی چودھری شرافت کی کامیابی ہے۔"
ایک اور لیڈر نے کہا "ہم آپ کا مسئلہ حل کرنے آئے ہیں۔ جب تک ہماری بھرجائی آپ کی زندگی میں نہیں آئے گی آپ یکسوئی سے ہمارا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم سب مل کر چودھری ملک نواز کے پیر پڑ جائیں گے اور ان سے درخواست کریں گے کہ چودھری شرافت کی چالوں میں آکر اپنی بیٹی اور داماد کا مستقبل برباد نہ کریں۔"
وجاہت نے تائید میں سر ہلا کر کہا "اب یہی ایک راستہ رہ گیا ہے۔ اگر آپ لوگوں کی کوششوں سے میرا گھر تباہ ہونے سے بچ جائے گا تو شرافت کی سمجھ میں آئے گا کہ ہمارے خلاف اس کی کوئی سیاسی ہیرا پھیری کام نہیں آئے گی۔"
"بے شک سیاسی مفادات کے لئے آپ کی خانہ آبادی بہت ضروری ہے۔"
وہ کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر یہ کہہ کر چلے گئے کہ کل صبح تک اسے کوئی خوشخبری سنائیں گے۔ صبح ہونے میں بڑی دیر تھی۔ عید کی خوشی میں چاند رات کو نیند نہیں آتی۔ وہ بستر پر آکر بڑی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ خوشی میں یہ بھول گیا تھا کہ سلطانہ نے نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے شرافت کی ایک تحریر طلب کی تھی۔
جب یاد آیا تو نیند اچاٹ ہوگئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رات کو سونا اور دن کو تازہ دم رہنا ضروری تھا۔ وہ نیند کی دو گولیاں کھا کر سوگیا۔ دوسری صبح آنکھ کھلی تو اچانک ہی ایک تدبیر سوجھی' اس نے فوراً ہی بستر سے اٹھ کر قلم اور اسٹامپ پیپر لے کر تحریر لکھی۔ اسے میز پر چھوڑ کر غسل کرنے گیا۔ اب اسے بڑی حد تک یقین تھا کہ سلطانہ انکار نہیں کرے گی۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنے پر راضی ہوجائے گی۔
وہ پھر سسرال پہنچ گیا۔ سلطانہ نے پہلے دن کی طرح اپنی خوابگاہ میں اس کا استقبال کیا۔ وجاہت نے کہا "شیطان اپنے ہتھکنڈوں سے باز نہیں آئے گا۔ البتہ انسان چاہے تو شیطانی چالوں کا جواب دے سکتا ہے۔"
"یعنی چودھری شرافت میری بدنامی کا باعث بنا رہے گا؟"
"ہاں' لیکن میں نے اس کا توڑ کیا ہے۔ تم یہی چاہتی ہو نا کہ سالگرہ والے واقعے پر کوئی تمہیں بدنام نہ کرے۔ میری بات سمجھو سلطانہ! کسی بھی عورت کی پارسائی کا گواہ اس کا خاوند ہوتا ہے۔ اگر میں تمہیں تحریری طور پر نیک نام اور پارسا تسلیم کرلوں تو شیطان کا منہ بند ہوجائے گا۔"
اس نے ایک اسٹامپ پیپر اسے دیتے ہوئے کہا "بزرگوں نے شرافت کی حمایت میں مجھ کو آزمایا تھا۔ کسی نے تمہارے بے داغ ہونے کی قسم نہیں کھائی تھی۔ میں نے اس کاغذ پر قسم کھائی ہے' اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے کہ تم اپنی ذات میں آئینے کی طرح صاف ہو اور میں مرتے دم تک تمہارے اعلیٰ کردار کا گواہ بن کر رہوں گا۔"
وہ وجاہت کی تحریر پڑھ رہی تھی اور قائل ہو رہی تھی۔ محبت

کرنے والا شرافت کو زیر نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن بڑی دانائی سے راستہ بدل کر گیا تھا۔

اس نے پوچھا "میری پارٹی کے اہم افراد یہاں آئے ہوں گے؟"

"جی ہاں! مجھے اپنی غلطیوں کا احساس ہے۔ آپ جو سیاسی جنگ لڑ رہے ہیں میں نے اس میں آپ سے تعاون نہیں کیا۔ اب کروں گی۔ اس تحریر سے بھی اطمینان ہو گیا ہے۔ چونکہ آپ کی میرے بھلے برے کے گواہ ہیں اور گواہ رہیں گے۔ اب میں کسی بات پر اعتراض نہیں کروں گی لیکن آپ ایک بات مان لیں۔"

"ایک نہیں ہزار باتیں منوا لو۔"

"میں حویلی واپس نہیں جاؤں گی۔"

"میں نہ تو اس حویلی میں تمہیں لے جاؤں گا نہ امی اور شرافت کے سامنے لے جانا پسند کروں گا۔ ہم اپنی کوٹھی میں جائیں گے۔ میں آج رات تمہیں لینے آؤں گا۔"

وہ شرما گئی۔ فوراً ہی منہ پھیر کر کمرے سے چلی گئی۔ جانے کا انداز بتا گیا کہ وہ ذرا شرم و حیا کو ترک کر واپس آئے گی۔ دلہن بن بولنے کے بعد پھر کہیں نہیں جائے گی۔

وہ بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ بڑی دیر بعد ملازمہ نے آ کر کہا "آپ کو چودھری صاحب کھانے پر بلا رہے ہیں۔"

دل سے ایک ہائے نکل گئی۔ بھوک بھی اور بجھی بجھی سی اور چپ کی جا رہی تھی۔

دسترخوان پر ساس سسر موجود تھے۔ سلطانہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اپنے ہاتھوں سے ڈشیں اٹھا اٹھا کر دینے لگی۔ ایسے وقت گوری کلائیوں کی چوڑیاں کھنک رہی تھیں اور گنگناتی ہوئی سرگوشیوں میں کہہ رہی تھیں "ابھی جلوت میں ہوں پھر خلوت میں ملوں گی۔"

چودھری سسر نے کھانے کے دوران کہا "مجھے وجاہت! مجھے خوشی ہے کہ تم دونوں نئی زندگی شروع کرنے جا رہے ہو۔ خدا تمہیں ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔"

وہ کھاتا رہا۔ ہوں ہاں کہہ کر ان کی دعائیں لیتا رہا اور آنکھ کسی رکاوٹ کے بغیر سلطانہ سے وصال کی دعائیں مانگتا رہا۔ پھر دوپہر تک نئی کوٹھی میں آ گیا۔ ملازموں کو حکم دیا کہ وہاں کی اچھی طرح سجاوٹ کریں اور کوٹھی کو دلہن کی طرح سجا دیں۔ اس کے بعد حویلی واپس آ گیا۔

شام ہوتے ہی بادل امنڈ کر آنے لگے۔ بارش ہونے لگی پھر ہوا ہی چلی گئی۔ گویا ایک ہی مصیبت دستک دینے لگی۔ بارش کا زور بتا رہا تھا کہ وہ شرافت کی سازش کے مطابق آئی ہے اور سلطانہ سے اسے ملنے نہیں دے گی۔

ایسے ہی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر پوچھا "ہیلو۔"

دوسری طرف سے بہت ہلکی سی آواز سنائی دی۔ پھر اس نے سلطانہ کو پہچان کر پوچھا "سلطانہ! تم بول رہی ہو؟ میں وجاہت علی ہوں۔"

اس نے کہا "آپ کی آواز اچھی طرح سنائی نہیں دے رہی ہے۔"

وہ بولا "میں کہہ رہا ہوں کوئی طوفان، کوئی سیلاب مجھے تمہارے پاس آنے سے نہیں روک سکے گا۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔ ہم آج ہی اپنی کوٹھی میں جائیں گے۔"

"ہیلو ہیلو! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

وہ بولا "ذرا ایک منٹ۔" پھر اس نے پوچھا "امی! کیا آپ نے ایکسٹینشن والا فون اٹھایا ہے؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے کہا "ہیلو ہیلو۔"

سلطانہ نے کہا "آپ کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے۔"

"میں کہہ رہا تھا۔ تمہیں لینے کے لئے حویلی سے نکل رہا ہوں۔ تیار رہو۔"

اس نے ریسیور رکھ کر سوچتی ہوئی نظروں سے دروازے کی سمت دیکھا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا ایکسٹینشن میں گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ریسیور کریڈل پر رکھا ہوا تھا۔ اگر وہاں کوئی تھا تو باتیں سن کر جا چکا تھا۔

اس نے سوچا "کون سا کیا فرق پڑتا ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے سے ملنے جا رہے ہیں کوئی گناہ تو نہیں کر رہے ہیں۔"

وہ حویلی سے نکلا۔ بارش میں ذرا بھیگتا ہوا گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ اسے اسٹارٹ کیا تو انجن غور غور کر کے چپ ہو گیا۔ پتا نہیں کیوں رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں۔ ویسے یہ حقیقت ہے، جتنی رکاوٹیں اور مشکلات پیش آتی ہیں، انسان اتنا ہی ضدی اور خود سر ہو جاتا ہے۔ ملازموں نے گاڑی کو دھکا لگایا۔ وہ اسٹارٹ ہو کر سلطانہ کی طرف چل پڑی۔

ارادہ تھا اندھیرا ہونے سے پہلے جائے گا اور دلہن کو لے کر نئی کوٹھی میں پہنچ جائے گا لیکن خاصی دیر ہو گئی۔ جب وہ سلطانہ کے ساتھ وہاں پہنچا تو آدھی رات گزرنے کو تھی۔ کوٹھی رنگ برنگے قمقموں سے سجی ہوئی تھی مگر ویران تھی۔ وہاں کوئی ملازم تک نہیں تھا۔

سلطانہ نے کوٹھی کے اندر آ کر پوچھا "یہاں اور کوئی نہیں ہے؟"

وہ بولا "صبح تک کسی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے نوکروں کو چھٹی دے دی ہے۔ ویسے کھانے پینے اور دوسری ضروریات کا تمام سامان موجود ہے۔"

وہ کوٹھی کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ایک کمرے میں آئے۔ وہاں پہنچتے ہی سلطانہ ایک دم شرما گئی۔ وہ کمرا سہاگ رات کے لئے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ بیڈ پر تازہ گلابوں کی پتیاں

خوشبو لٹا رہی تھیں۔ سامنے تکیے پر دلہن کا سرخ جوڑا رکھا ہوا تھا۔

وجاہت نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تم میری ہو' میں تمہارا ہوں۔ آج ہمارے رشتے کو ایک نام ایک پہچان دے دو۔"

وہ بستر کے پاس آیا۔ پھر سرخ جوڑا اٹھا کر اسے دیتے ہوئے بولا "تو' میری دلہن بن جاؤ۔ میں باہر جا رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد آکر دستک دوں گا۔"

وہ کمرے سے باہر گیا۔ سلطانہ نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ وہ کوٹھی کے مختلف حصوں میں آکر کھڑکیوں اور دروازوں کو چیک کرنے لگا۔ وہ سب اندر سے بند تھے۔ باہر سے کوئی مصیبت نہیں آسکتی تھی۔ چھت مضبوط تھی۔ اوپر سے کوئی عذاب نازل نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ اطمینان پہلے سے تھا۔ پھر بھی اس نے وقت گزارنے کے لئے اور اطمینان حاصل کر لیا۔ پھر اس کے بعد دلہن کے دروازے پر آکر دستک دی۔ انتظار کیا لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ یہ عقل آئی کہ نئی دلہن سیج سے اٹھ کر دروازہ کھولنے نہیں آئے گی۔ اس نے ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔

وہ پھولوں کی سیج پر گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہوئی تھی۔ نظر نہیں آرہی تھی مگر جذبوں کو دھڑکا رہی تھی۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل سے قریب آکر بولا "میرا نام وجاہت علی ہے۔ تم نے نکاح قبول کرتے وقت میرا نام سنا ہوگا۔ ثبوت کے طور پر یہ شناختی کارڈ حاضر ہے۔"

وہ سلطانہ کے ہاتھ میں اپنا شناختی کارڈ تھما کر سامنے بیٹھ گیا۔ پھر بولا "گرچہ یہ ایک مذاق لگتا ہے لیکن میں ابھی باہر سے آیا ہوں۔ اور تم گھونگھٹ میں مجھے نہیں دیکھ رہی ہو۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ تمہیں ہاتھ لگا کر انگوٹھی پہنانے سے پہلے گھونگھٹ اٹھاتا ہوں۔ تم مجھے دیکھ کر اپنے شوہر کی موجودگی کا یقین کر لو۔"

اس نے بڑے پیار سے گھونگھٹ کو اٹھایا۔ وہ آنکھیں بند کئے سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھی۔ عجلت میں پوری طرح دلہن کا.... سنگار نہیں کر پائی تھی پھر بھی قدرتی حسن جھلک جھلک کر اسے دیوانہ بنا رہا تھا۔ وہ بولا "مجھے دیکھو۔ مجھے پہچانو۔"

اس نے آنکھیں نہیں کھولیں' شرما کر اور گردن جھکا لی۔ وجاہت نے کہا "سمجھ گیا۔ شرما رہی ہو۔ اچھا لو۔ میں آنکھیں بند کرتا ہوں۔ جلدی سے مجھے دیکھ لو۔ پھر میں ساری رات دیکھتا رہوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسی لمحے اچانک فضا میں سے گولی چلنے کی آواز گونج گئی۔ وجاہت کے حلق سے ایک کراہ نکلی' فائرنگ کی آواز سنتے ہی سلطانہ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھولتے ہی وجاہت اس پر اوندھا ہو گیا۔ وہ بستر پر گرتے گرتے سنبھل گئی۔ وجاہت اس پر سے ایک طرف ڈھلکتے ہوئے پلنگ کے سرے پر سے ہوتے ہوئے قالین پر پہنچ کر چاروں شانے چت ہو گیا۔

سلطانہ کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ پلنگ کے سرے سے لے کر فرش تک سرخ لہو بہتا رہا تھا کہ سہاگ کی سیج کو پھر آگ لگ گئی ہے۔ وہ فرش پر آکر جھکتی ہوئی اسے جھنجوڑتے ہوئے بولی "نہیں' یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ۔۔ آپ آنکھیں کھولیں۔ مجھ سے بولیں۔ کیا میں سمجھوں کہ یہ خواب ہے؟"

اسی وقت دور کسی کمرے میں کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی' وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دوڑتی ہوئی دروازے پر آئی۔ کوریڈور میں کوئی نہیں تھا اور کسی کو ہونا بھی نہیں چاہئے تھا۔ وجاہت نے کھڑکیوں اور دروازوں کو اندر سے بند کیا تھا لیکن کوریڈور کے آخری سرے پر ایک کھڑکی کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔

وہ دوڑتی ہوئی کھڑکی کے پاس آئی' وہاں فرش پر قالین نہیں تھا۔ اس لئے فرش پر ایک ریوالور کے گرنے کی آواز آئی تھی۔ وہ ریوالور وہاں پڑا ہوا تھا۔ اس نے جھک کر اٹھایا۔ باہر سے ایک گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ وہ لپک کر کھڑکی کے پاس آتے ہوئے بولی "کون ہے' سامنے آؤ کون ہے؟"

ایک گھوڑا دوڑتا ہوا احاطے کے کھلے ہوئے گیٹ سے باہر جا رہا تھا۔ وہ للکارتے ہوئے بولی "رک جاؤ نہیں تو گولی مار دوں گی۔"

اس نے دھمکی دیتے ہوئے گولی چلا دی۔ دور تک فائرنگ کی آواز گونجتی ہوئی گئی۔ لیکن گھڑسوار کا کچھ نہ بگڑا۔ وہ کوٹھی کے باہر اندھیرے میں گم ہو گیا تھا۔

وہ واپس کمرے کی طرف دوڑی۔ دماغ میں آندھی چل رہی تھی۔ آنکھوں سے اپنے شوہر کی لاش دیکھ کر یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ کنواری بیوہ ہو چکی ہے۔ سہاگ کے بستر نے پہلے اسے جلایا پھر شوہر کو جلا ڈالا۔

وہ دروازے کے پاس آکر رک گئی۔ اندر لاش پڑی ہوئی تھی۔ بستر سے گلاب کی پتیاں اڑتی ہوئی مردہ دولہا پر بکھر رہی تھیں۔ سلطانہ کی آنکھوں سے گہرے صدمے کا اظہار ہو رہا تھا لیکن ان آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک قطرہ نہیں تھا۔ وہ کسی مصیبت یا صدمے کے وقت روتی نہیں تھی۔ اس کے والدین نے اسے کبھی روتے نہیں دیکھا۔ ایسی پتھر لڑکی شاید ہی کبھی دیکھنے میں آئی ہو۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ٹیلی فون کے پاس آئی۔ پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ رابطہ قائم ہونے پر ملازم کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا "بابا جی کو بلاؤ۔"

چند سیکنڈ میں ہی باپ کی آواز سنائی دی۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولی "بابا جی! کسی نے چودھری وجاہت علی کو قتل کر دیا ہے۔ میں بیوہ ہو گئی ہوں۔"

"بیٹی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میرے داماد کو کس نے قتل کیا

ہے؟"

"میں نہیں جانتی' قاتل فرار ہو گیا ہے۔ آپ پولیس کو لے کر آجائیں۔"

"میں ابھی آرہا ہوں۔ حوصلہ رکھو فوراً آرہا ہوں۔"

سلطانہ نے ریسیور رکھ دیا پھر کچھ سوچ کر اٹھایا۔ دوسرے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس نمبر پر بھی ایک ملازمہ نے ریسیور اٹھایا۔ وہ بولی "میں سلطانہ ہوں۔ چودھرائن کو بلاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد چودھرائن کی آواز آئی "کیوں میری نیند خراب کر رہی ہو۔ میرے بڑے بیٹے کو پہلے ہی چھین کر لے گئی۔ اب کیا چاہتی ہو۔"

"تمہارے بیٹے کی لاش واپس کرنا چاہتی ہوں۔"

دوسری طرف سے وہ جیسے اچھل پڑی ہو۔ چیخ کر بولی "کیا بکتی ہو؟"

"یہ بکواس ہے یا حقیقت' اپنے چھوٹے ذلیل بیٹے سے پوچھو۔"

"اے خبردار! میرے بیٹے کو ذلیل نہ کہنا۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"یہاں نہیں ہے۔"

"انتظار کرو۔ وہ بارش میں بھیگ کر گھوڑے پر سوار آرہا ہوگا۔"

سلطانہ نے ریسیور رکھ دیا۔ دوسری طرف چودھرائن نے کہا۔ "ہیلو ہیلو۔"

ماں کا دل رونے لگا۔ آنکھیں بھی رونے لگیں۔ دشمن بہو سے اطلاع ملنے پر بیٹے کی موت کا یقین نہیں آرہا تھا۔ لیکن وہ یہ بھی مانتی تھی کہ بہو بھی اور کھری ہے۔ اپنے شوہر کی موت کی غلط اطلاع نہیں دے گی۔

وہ سوچنے کے دوران فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ باہر بارش کے شور میں گھوڑے کے ٹاپوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی بیرونی دروازے پر آئی۔ پھر اسے کھول کر دیکھا۔ شرافت گھوڑے سے اتر رہا اور سائیس سے کہہ رہا تھا "اسے اصطبل میں لے جاؤ اور خبردار! یہ کسی سے نہ کہنا کہ ہمارے اصطبل کا کوئی گھوڑا رات کو باہر نکالا گیا تھا یا پھر کہہ دینا۔ آج رات تم چھٹی پر گئے تھے۔ اسے اصطبل میں باندھ کر چھٹی پر چلے جاؤ۔"

سائیس گھوڑے کی لگام پکڑ کر لے گیا۔ شرافت بارش میں دوڑتا ہوا حویلی کے برآمدے میں آیا مگر کھلے ہوئے دروازے کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ پھر تیزی سے ماں کے پاس سے گزرتا ہوا حویلی کے اندر آیا۔ ماں نے پلٹ کر روتے ہوئے پوچھا "تم نے میرے بیٹے کو قتل کیا ہے؟"

وہ ایک دم سے گھبرا گیا۔ ماں کو دیکھ کر بولا "میں نے کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔"

"سلطانہ نے ابھی فون پر بتایا ہے کہ قاتل گھوڑے پر سوار یہاں آرہا ہے اور تو آگیا۔"

"یہ۔ یہ کیا بکواس ہے۔ کیا آج رات جو بھی گھوڑے پر سوار یہاں آئے گا وہ قاتل ہوگا؟"

وہ روتے ہوئے بولی "تو پھر میرے بیٹے کو کس نے قتل کیا ہے۔ مجھے وہاں لے چلو۔ میری جان نکلی جا رہی ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ بھائی جان کو کسی نے قتل کیا ہے۔ میں ابھی وہاں لے چلوں گا۔"

"کہاں لے جاؤ گے؟ کتنی دور جانا ہے؟"

"زیادہ دور نہیں ہے۔ بھائی جان نے سلطانہ کے نام جو کوٹھی لکھی تھی اسی کوٹھی میں جانا ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اسی کوٹھی میں میرے بیٹے کو۔۔۔"

وہ گڑبڑا گیا۔ پھر جلدی سے سنبھل کر بولا "امی! بڑے شرم کی بات ہے۔ تم ایک بیٹے کو دوسرے بیٹے کا قاتل کہہ رہی ہو۔ یہ بات موٹی سی عقل میں آسکتی ہے کہ بھائی جان سلطانہ سے ملنے کے لئے سلطانہ کی کوٹھی میں جایا کرتے تھے۔"

"ہاں بیٹے! میری عقل کام نہیں کر رہی ہے۔ میں تم پر شبہ نہیں کروں گی۔ مجھے جلدی وہاں لے چلو۔"

"میں بھیگ گیا ہوں۔ لباس بدل کر آتا ہوں۔"

"میں بیٹے کے لئے تڑپ رہی ہوں اور تم لباس بدلنے جا رہے

ہو؟"

"میں نے لباس تبدیل نہ کیا تو تمہاری طرح پولیس والے بھی سلطانہ کے بیان کو درست سمجھیں گے۔ مجھے ہی وہ قاتل تصور سمجھیں گے۔"

وہ پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دوسری طرف سلطانہ کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ اس کے ماں باپ آگئے تھے۔ اسے رلانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ پولیس انسپکٹر نے وہ ریوالور اپنے قبضے میں لے لیا تھا جس سے وجاہت پر گولی چلائی گئی تھی۔ پھر اس نے وجاہت کی ماں کو فون کے ذریعے قتل کی اطلاع دی۔ وہ تو چھوٹے بیٹے کے ساتھ آنے والی تھی۔ فون پر اطلاع ملتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ صبح ہونے سے پہلے بیٹے کی لاش دیکھنے پہنچ گئی۔

سلطانہ نے گھور کر شرافت کو دیکھا۔ وہ بڑے صدمے کا اظہار کرتے ہوئے بولا "سلطانہ! بھائی جان کے قتل نے مجھے اندر سے مار ڈالا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہم آپس میں کبھی کبھی لڑتے بھی تھے۔ لڑائی ہر گھر میں ہوتی ہے۔ ایسی لڑائیوں سے نفرت نہیں محبت بڑھتی ہے۔ بھائی جان میرے دل میں محبت بڑھا کر چلے گئے۔ تنہا میں اس محبت کا بوجھ اٹھا کر کیسے زندہ رہوں گا۔"

وہ بدستور خاموشی سے گھور رہی تھی۔ اس نے پوچھا "تم نے قاتل کو دیکھا ہوگا؟ تم بھائی جان کے قریب تھے۔"

انسپکٹر نے کہا "چھوٹے چوہدری جی سے یہ سوال کر چکا ہوں۔ یہ کہتے ہیں "قاتل ریوالور پھینک کر ایک کھڑکی سے فرار ہو گیا۔ اس کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔"

شرافت کی ماں نے روتے ہوئے پوچھا "اس نے نہیں دیکھا' کسی ملازم نے تو دیکھا ہوگا۔"

سلطانہ نے جواب دیا "آپ کے بیٹے نے ملازموں کو چھٹی دے دی تھی۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔"

"وہ کوٹھی تمہاری ہے۔ میرا بیٹا حویلی سے چل کر آیا تھا۔ ملازموں کو چھٹی دینے کا اسے حق نہیں تھا۔ تم نے انہیں چھٹی دی ہوگی۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

چوہدرائن ماں نے کہا "تم نے یہاں سے سب کو ہٹا کر میرے بیٹے کی جان لی ہے۔"

شرافت نے کہا "امی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟"

چوہدری ملک نواز نے کہا "چوہدرائن! ہوش میں رہ کر باتیں کرو۔ میری بیٹی ابھی تک دلہن کے جوڑے میں ہے۔ جوڑا پہننے والیاں اپنے ہاتھوں سے بیوہ نہیں بنتیں۔"

"اسے تو میں دلہن بنا کر اپنے گھر لائی تھی لیکن یہ پہلی ہی رات سے میرے بیٹے کی دشمن بن گئی تھی۔ دشمنی وہاں پوری نہیں کر سکی تھی اس لیے وہ یہاں کوٹھی میں بلا کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیا۔"

ملک نواز نے گرج کر کہا "بکواس بند کرو۔ ورنہ میں تمہارے دوسرے بیٹے کو یہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔ بڑھیا! تو یہاں سے دو جوان بیٹوں کی لاشیں لے جائے گی۔"

چوہدرائن بدحال ہو کر شرافت سے لپٹ گئی۔ پھر بولی "نہیں' میں کچھ نہیں بولوں گی۔ میرے بیٹے کی لاش مجھے دے دو۔ میں اپنے شرافت کو لے کر چلی جاؤں گی۔"

شرافت نے ملک نواز سے کہا "چوہدریوں کو بات بات پر غصہ آتا ہے۔ میں بھی چوہدری ہوں لیکن سلطانہ کے صدمے کو دیکھتے ہوئے بات نہیں بڑھانا چاہتا۔ آپ بھی میری امی کے صدمات کو سمجھیں۔"

انسپکٹر نے کہا "لاش پوسٹ مارٹم کے لئے جائے گی اور مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سلطانہ بیگم حراست میں رہیں گی۔"

ملک نواز نے کہا "انسپکٹر! تم میری بیٹی کو گرفتار کرو گے؟ آخر کس جرم میں؟"

"چوہدری صاحب! مقتول کے پاس صرف آپ کی صاحبزادی تھیں۔ اور کوئی نہ تھا۔ جس ریوالور سے قتل ہوا وہ بھی آپ کی صاحبزادی سے ہی ملا ہے۔"

چوہدری ملک نواز فون کا ریسیور اٹھا کر پولیس کے اعلیٰ افسران سے رابطہ کرنے لگے۔ وہ افسران سے شناسائی تھی۔ ان میں سے ایک چٹکی پر تھانیدار کو عارضی طور پر معطل کر دیا گیا تھا۔

شرافت فون کے ذریعے اپنی سیاسی پارٹی کے اہم لیڈروں سے کہنے لگا کہ وہ کسی طرح اپنے ذرائع استعمال کر کے سلطانہ کو حوالات میں جانے سے روک دیں لیکن صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔ ضمانت کے لئے عدالت کھلی ہوئی نہیں تھی اور کوئی لیڈر الیکشن سے پہلے قتل کے کیس میں سفارش کر کے اپنا نام اخبارات میں نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔

کوئی کچھ نہ کر سکا۔ سلطانہ پہلے حوالات میں گئی پھر جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دی گئی۔ چوہدرائن نے اپنے مقتول بیٹے کے لئے سلطانہ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ شرافت نے ماں کو ایسا کرنے سے نہیں روکا۔ لیکن جیل میں آکر سلطانہ سے ملاقات کی۔ اسے یقین دلایا "میری امی بیٹے کے غم میں پاگل ہو گئی ہیں۔ میں انہیں مقدمہ بازی سے روکنا چاہتا ہوں۔ وہ طعنے دیتی ہیں کہ میں تمہارے عشق میں پاگل ہو گیا ہوں۔"

وہ تلخی سے بولی "شرافت! عشق اور محبت کی باتیں نہ کرو' ملاقات کا مقصد بتاؤ؟"

"تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو لیکن میں تمہیں الزامات سے بری کرا کے اپنی محبت ثابت کروں گا۔ میں یہی کہنے آیا ہوں کہ میں اس مقدمے میں اپنی والدہ کے ساتھ نہیں' تمہارے والد کے

ساتھ ہوں۔"

ملاقات کا وقت ختم ہونے کے بعد وہ چلا گیا۔ سلطانہ آہنی سلاخوں کے پیچھے بیٹھ کر سوچنے لگی "سانپ ایک بار ڈستا ہے اور مار ڈالتا ہے۔ مونا مارتا نہیں ہے جیتے جی زہر سے ڈستا رہتا ہے۔"

چودھری شرافت حویلی میں آیا تو ماں نے پوچھا "اپنی منکوحہ سے مل کر آرہے ہو؟"

"ہاں اسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں مقدمے میں اس کے خلاف نہیں ہوں۔"

"یہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔ تم اپنی ماں کے خلاف ہو۔"

"امی! میں مخالفت کروں تو آپ اس مقدمے میں ایک قدم نہیں چل سکیں گی۔"

"تم میرے خلاف نہیں ہو' سلطانہ کے خلاف نہیں ہو تو آخر کس کے ہو؟"

"سلطانہ میری محبت کو نہیں سمجھتی اور آپ میری سیاست کو نہیں سمجھ پائیں گی۔ فی الحال آپ مجھے ایک تماشائی سمجھ لیں۔"

وہ ماں سے کترا کر چلا گیا۔ ملک میں جو عام انتخابات ہونے والے تھے' وہ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ملتوی کر دیے گئے تھے۔ سیاسی سرگرمیاں سرد پڑ گئی تھیں۔ بظاہر ایسا ہوا تھا لیکن سیاستداں سمجھ رہے تھے کہ ابھی نہ سہی پھر بھی عام انتخابات ضرور ہوں گے اور سیاسی سرد جنگ جاری رہی تو جلدی ہوں گے۔ اس لئے تمام سیاستدان اندر ہی اندر اپنے طور پر مصروف تھے۔

پارٹی لیڈر نے شرافت سے پوچھا "چودھری صاحب! آپ ہماری کارنر میٹنگ میں شریک کیوں نہیں ہوتے ہیں؟"

شرافت نے کہا "شریک ہونا کیا ضروری ہے۔ میں میٹنگ کے تمام ایجنڈوں کو تسلیم کرلیتا ہوں کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

"ہے۔" اور لیڈر نے کہا "چودھری صاحب آج کل۔ سلطانہ کے مقدمے میں الجھے ہوئے ہیں۔"

دوسرے نے پوچھا "کیا سلطانہ آپ کے لئے اقتدار حاصل کرنے سے زیادہ اہم ہے۔"

وہ بولا "اقتدار اہم ہے۔ آج اقتدار ہمارے ہاتھوں میں ہو تو میں سلطانہ کو جیل سے چھڑا کر اپنی سیج پر لے آؤں۔"

"کیا وہ آپ سے راضی ہے؟"

"یہی تو ایک مشکل ہے۔ وہ اوپر سے موم اور اندر سے فولاد ہے۔ اس فولاد کو آہستہ آہستہ پگھلا رہا ہوں۔ جب تک وہ راضی نہیں ہوگی میری امی کا وکیل مقدمے کی تاریخیں بڑھواتا جائے گا۔"

اس کے خیال کے مطابق محبت اور سیاست میں مکاری لازمی تھی۔ وہ ایک طرف ماں کو مقدمے بازی سے نہیں روکتا تھا۔ دوسری طرف اس نے وکیل کو بھاری معاوضہ دے کر پیشی کی تاریخیں بڑھوا رکھی تھیں۔ ساتھ ہی سلطانہ کے باپ ملک نواز سے

دوستی بڑھا رہا تھا۔ جس ریوالور سے وجاہت کو قتل کیا گیا تھا اس پر سلطانہ کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے اور واردات کے وقت صرف سلطانہ ہی مقتول کے پاس تھی۔ اس کے خلاف مقدمہ سخت ہو گیا تھا۔ صرف ایک ہی بات سلطانہ کے حق میں تھی کہ قتل کا کوئی چشم دید گواہ نہیں تھا۔ لیکن کسی موقع پر بھی ایسے ایک دو گواہ پیش کیے جا سکتے تھے۔

ملک نواز بیٹی کے مقدمے میں یہی سوچ کر کمزور پڑ گیا تھا کہ اسے شرافت کی حمایت حاصل ہے۔ اگر وہ چاہتا تھا تو جھوٹے چشم دید گواہ پیش کر سکتا تھا لیکن ایسا نہیں کر رہا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں ملک نواز کو سمجھاتا تھا کہ سلطانہ اسے اچھا سمجھے تو ماں کی دشمنی برقرار نہیں رہے گی۔

باپ ملاقات کے لئے جیل میں آتا تو بیٹی کو سمجھاتا تھا کہ شرافت کے لئے اپنا رویہ نرم رکھو۔ پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ انسان سے غلطی ہوتی ہے۔ شرافت غلطی کی تلافی کر رہا ہے۔ وہ مقدمے میں ماں کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ اسے اپنے ہی ساتھ رہنے کا حوصلہ دو۔

والدین اسے سمجھاتے تھے۔ پھر ملاقات کا وقت ختم ہوتے ہی چلے جاتے تھے۔ کوئی سمجھ نہیں پاتا تھا کہ وہ کس طرح اندر کی آگ میں جل رہی ہے۔ اس کی زندگی میں دو بار پھولوں کی سیج آئی اور ہر بار جذبوں کا گرم بستر چھین لیا گیا۔ جیل کے ٹھنڈے فرش پر سونے کے لئے پچھاڑ دیا گیا۔ ایسے میں وہ اوپر سے شانت رہتی تھی مگر اندر سے بھڑکی رہتی۔ والدین کی نصیحتوں کا اثر ہوتا تھا۔ یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ غصہ دکھانے سے نقصان اٹھائے گی۔ سزائے موت یا عمر قید کی صورت میں زندگی بے مقصد ہو جائے گی۔

اوپر کی آگ پانی سے بجھتی ہے۔ اندر کی آگ صبر سے اور صبر مشکل سے آتا ہے۔ اس نے خود کو نارمل رکھنے اور اچھا وقت گزارنے کے لئے جیلر سے کتابیں منگوائی تھیں۔ اس کے اہل خانہ جیلر کو اچھی خاصی رقم دیتے رہتے تھے۔ لیڈیز کانسٹیبل وغیرہ کی بھی آمدنی بندھ گئی تھی۔ وہاں کے تمام سرکاری ملازمین سلطانہ کی ایسی خدمت کرتے تھے جیسے وہ حویلی کے ملازم ہوں۔

اتنی سہولتیں حاصل ہونے کی وجہ سے جیل کی چار دیواری میں کسی حد تک دل لگ گیا۔ وہ صبح سویرے سلاخوں سے باہر آکر جیل کے باغیچے میں ٹہلتی تھی۔ ہلکی پھلکی ورزش کرتی تھی۔ اس طرح رکھ رکھاؤ سے اپنے جسم کو اور کتابوں سے ذہانت کو چمکانے لگی تھی۔

شرافت پہلے دو تین مہینوں میں آتا تھا۔ پھر ہر ماہ آنے لگا۔ جیل کی چار دیواری میں رہ کر اس کے حسن و شباب میں روز بروز نکھار آرہا تھا۔ اسے دیکھ دیکھ کر وہ پاگل ہو رہا تھا۔ انگور کے خوشے میں دانے دانے رس بھر رہا تھا اور لومڑی کے ہاتھ سلاخوں کے اندر نہیں پہنچ رہے تھے۔ وہ انگور کو کھٹے نہیں کہہ سکتا تھا۔ انگور لومڑی

کے لئے کھنچے یا جلے ہو سکتے ہیں لیکن کوئی کے لئے شراب پیو رہے ہیں۔ اور کیا قیامت تھی کہ آنکھوں کے سامنے شراب پر پابندی لگی ہوئی تھی۔

اسے پنجرے کے اندر دیکھتے دیکھتے تین برس گزر گئے۔ وہ آہستہ آہستہ موم ہو رہی تھی۔ شرافت نے قسم کھائی تھی کہ شمع فانوس کے اندر رہ کر پگھل جائے "اپنی عمر تمام کرنے کوئی بات نہیں۔ وہ اس کی روشنی اس وقت تک فانوس کے باہر سے دیکھتا رہے گا جب تک شمع اس کی خوابگاہ میں روشن ہونے کے لئے راضی نہ ہوگی۔ اور اب آثار بتا رہے تھے کہ وہ رفتہ رفتہ اس کی طرف مائل ہو رہی ہے۔

تین برس آٹھ ماہ گزر گئے۔ ایک دن شرافت نے آکر کہا "تم جب سے مسکرا کر بولنے لگی ہو تب سے میرے نصیب سنورنے لگے ہیں۔ تین ماہ بعد الیکشن ہونے والے ہیں آزاد امیدوار کی حیثیت سے میری پوزیشن بہت مضبوط ہے۔ میرے حلقے میں کوئی میرا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔ اب تک کسی نے مقابلے پر کھڑے ہونے کی جرأت نہیں کی ہے۔"

سلطانہ نے کہا "تمہارے بھائی کا انجام دیکھنے کے بعد بھلا کون جرأت کرے گا؟"

"تم نے بہت عرصے بعد پھر مجھے طعنہ دیا ہے۔"

"میں قاتل کو کہہ رہی ہوں جس نے تمہارے لئے میدان صاف کر دیا۔ کیا تم قاتل ہو؟"

"ہرگز نہیں' پتا نہیں تم کیوں مجھ پر شبہ کرتی ہو۔ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ جس نے بھی میرے لئے میدان صاف کیا' وہ میرا ہی آدمی ہے اور میں نے ہی سیاسی مفاد کے لئے ایسا کرایا ہے؟"

"میں تھوڑا کہتی ہوں' تم خود کہہ جاتے ہو۔ اور جو کہہ جاتے ہو کیا اسے سمجھ پاتے ہو؟"

وہ گڑبڑا گیا۔ یہ سوچ کر پریشان ہو گیا کہ پتا نہیں کون سی بات کس انداز میں کہہ گیا ہے جس سے وجاہت کا قاتل جھلکنے لگا ہے۔ وہ بولا "پلیز سلطانہ! مجھے الجھایا نہ کرو۔ بس اتنا یقین کر لو' میری محبت اور میری سیاست سب تمہارے لئے ہے۔"

"تم نے اب تک میرے لئے کیا کیا ہے؟"

"تمہاری خاطر عدالتی فیصلے کو ٹال رہا ہوں۔ پیشی کی تاریخیں بڑھواتا جا رہا ہوں۔ جب بھی فیصلہ ہوگا تمہارے خلاف ہوگا۔ سزائے موت ہوگی یا عمر قید۔"

"چار برس ہونے کو ہیں اور کب تک فیصلے کو ٹالتے رہو گے؟"

"ہم جاگیردار ہیں۔ زن اور زمین کے مقدمات کو آئندہ نسلوں تک الجھاتے رہتے ہیں لیکن اب وقت آ گیا ہے۔ مجھے الیکشن میں کامیاب ہونے دو پھر میں تمہیں مکھن کے بال کی طرح یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔ وعدہ کرو' میری دلہن بنو گی!"

سلطانہ نے پہلے سر جھکایا پھر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ سر جھکا کر یہ سمجھایا کہ شرما گئی ہے اور منہ پھیر کر چہرے سے ظاہر ہونے والی نفرت کو چھپا لیا۔

ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ شرافت چلا گیا۔ وہ کشمکش میں تھی۔ پچھلے کئی ماہ سے ماں باپ سمجھا رہے تھے۔ ماں نے سمجھایا تھا۔ "بیٹی! یہ نہ سوچ کہ شرافت میں شرافت نہیں ہے۔ وہ ایک اچھا انسان بھی ہے۔ تمہاری طرف سے کوئی اپنائیت نہیں ہے۔ پھر بھی وہ تمہارے لئے بہت کچھ کر رہا ہے۔"

باپ نے سمجھایا "جیل میں زندگی گزارنے سے بہتر ہے شرافت کے ساتھ زندگی گزارو۔ تم شادی کے لئے ہاں کر دو گی تو وہ تمہاری رہائی کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دے گا۔"

یہ بات وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اس کے ہاں کہہ دینے سے شرافت اسے ہر حال میں حاصل کرے گا۔ دانشمندی بھی یہی تھی کہ جیل میں زندگی برباد نہ کرے۔ باہر آکر آزادی کی قیمت شرافت کو ادا کرے۔

تین ماہ اور گزر گئے۔ عام انتخابات ہوئے۔ شرافت اپنے حلقے سے بلا مقابلہ کامیاب ہو گیا۔ اب اسمبلی میں جو اپنی بھاری اکثریت ثابت کرتا وہی اقتدار میں آکر اپنی حکومت بنا سکتا تھا۔ دو پارٹیوں میں زبردست مقابلہ تھا۔ دونوں پارٹیاں ! آزاد امیدواروں کو خریدنے میں مصروف ہو گئیں جو الیکشن میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ایسے وقت شرافت جیل میں ملاقات کے لئے آیا۔ اس کے ساتھ سلطانہ کے والدین بھی تھے۔ اس نے کہا "سلطانہ! میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے کامیاب ہو گیا ہوں۔ سیاسی پارٹیاں اپنی اپنی حکومت بنانے میں میرے ایک ووٹ کی' ایک حمایت کی بھوکی ہیں۔ میں کسی بھی پارٹی کا ساتھ دے کر اپنے بڑے بڑے مطالبات منوا سکتا ہوں۔ تم مان جاؤ تو میں تمہاری رہائی کا مطالبہ منوا لوں گا۔"

سلطانہ نے پوچھا "کیا تم عدالت کا فیصلہ بدل سکو گے؟"

"میں تمہارے کیس کو عدالت میں اب پہنچنے ہی نہیں دوں گا۔ تم سیاست کو نہیں سمجھو گی' صرف میری محبت کو سمجھو۔"

ماں نے کہا "بیٹی! ہاں کہہ دو۔ میں اور تمہارے ابا جی اسی لئے شرافت کے ساتھ آئے ہیں کہ ابھی نکاح اور رخصتی کی تاریخ مقرر ہو جائے۔"

شرافت نے کہا "ابھی میں نہیں جانتا کس سیاسی پارٹی سے سمجھوتے میں کتنے دن لگیں گے اور کس دن تمہیں رہائی ملے گی۔ لیکن جس دن بھی تم رہا ہو کر باہر آؤ گی اس کے دوسرے دن میری دلہن بن جاؤ گی۔ بولو منظور ہے؟"

سلطانہ نے سر کو جھکا لیا۔ باپ نے کہا "بیٹی! ہاں کہہ دو۔ شرافت کی محنت اور محبت کو دیکھو۔ یہ ایم این اے ہو گیا ہے۔ اپنے آس پاس کی اندھیری آبادیوں میں بجلی لا سکتا ہے۔ کسانوں

کے لئے پانی کا مستقل انتظام کرا سکتا ہے۔ دیہاں والہ میں ہائی اسکول اور کالج بنوا سکتا ہے۔ لیکن یہ حکومت بنانے والی پارٹی سے صرف تمہاری رہائی کا مطالبہ کرے گا۔ تم خوش نصیب ہو بیٹی' ہاں کہہ دو۔"

سلطانہ نے ہاں کہہ کر منہ پھیر لیا۔ وہ آہنی سلاخوں کے ادھر تھی۔ ادھر ماں باپ نے شرافت سے بات پکی کر دی کہ رہائی کے دوسرے دن وہ برات لائے گا اور ان کی بیٹی کو دلہن بنا کر لے جائے گا۔

رشتہ طے ہوتے ہی شرافت نے سیاسی توڑ جوڑ شروع کر دیئے۔ دیہاں والہ میں دونوں پارٹیوں کے لیڈر آنے لگے۔ اس کی حمایت حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی پیشکش کرنے لگے۔ وہ ہر لیڈر سے کہتا تھا۔ "خدا نے مجھے بہت دولت دی ہے۔ آپ حضرات کے طفیل عزت بھی بہت ہے۔ میرا مطالبہ کوئی بہت بڑا نہیں ہے۔ میں ایک قتل کا مقدمہ ختم کرانا چاہتا ہوں۔"

"ختم ہو جائے گا چودھری صاحب! یہ کون سی بڑی بات ہے۔"

"مجھے معلوم تو ہو کیس کیسے ختم ہو گا؟"

"بھئی بڑے بڑے لیڈروں کو قتل کیا جاتا ہے۔ ان کے قاتلوں کو سزا نہیں ہوتی۔ ان مقدموں کی فائلیں دبا دی جاتی ہیں یا جلا دی جاتی ہیں۔ آپ کے بھائی کا کیس تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

چودھری شرافت علی نے کہا "میں مانتا ہوں' ایسا ہوتا ہے لیکن آپ حکومت بنائیں گے تو پولیس آپ کی ہوگی اور مقدمے کی فائل آپ کے پاس آئے گی۔"

"چودھری صاحب! آپ ہماری حمایت میں تحریر دیں' ہم ضرور اپنی حکومت بنائیں گے۔ قتل کا مقدمہ ایسے مٹی میں ملے گا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔"

شرافت نے پوچھا "اگر آپ نے اکثریت حاصل نہ کی تو میرا یہ چھوٹا سا [illegible] دھرا رہ جائے گا۔ میں ہوا کا رخ دیکھ رہا ہوں۔ اس لئے [illegible] حمایت کروں گا۔"

آخر اس نے دوسری پارٹی کے لیڈر کو بھی اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ اس کے حلقے میں اٹھائیس ہزار ووٹرز تھے۔ انہیں ووٹ دینے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کیونکہ شرافت کا کوئی مخالف امیدوار نہیں تھا۔ وہ بلا مقابلہ کامیاب ہوا تھا۔ وہ صرف آزاد امیدوار ہی نہیں تھا بلکہ [illegible] مطالبات پورے کرنے کی پابندیوں سے بھی آزاد [illegible]۔

اس حلقے میں اگر الیکشن ہوتا اور مقابلہ میں بھی وہ جیت جاتا تب بھی ووٹ دینے والوں کا کوئی مطالبہ پورا نہ کرتا۔ کیونکہ اپنے ہی ایک مطالبے میں الجھا ہوا تھا۔ ویسے بھی سیاستداں وہی ہے جو اپنی الجھنوں کو سلجھانے کے لئے ہزاروں لاکھوں ووٹروں کی قربانیاں لے کر اسمبلی تک پہنچتا ہے۔ آخر اس نے ایک پارٹی کی حمایت کی اور اسمبلی میں حکمران جماعت کے ساتھ ہو گیا۔ اسے یقین دلایا گیا تھا کہ حلف وفاداری اٹھانے کے بعد اس کی مراد پوری ہو جائے گی۔

اس نے حویلی آ کر ماں سے کہا "امی! آپ نے بہت مقدمے بازی کر لی۔ اب اپنے وکیل کو چھٹی دے دیں۔"

ماں نے تعجب سے پوچھا "کیا بات ہے بیٹے! پہلے تم نے مقدمے کی مخالفت نہیں کی تھی۔ اب وکیل کی فیس تمہیں کیوں بھاری پڑ رہی ہے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا "وکیل ہم دونوں سے الگ الگ فیس وصول کرتا تھا۔ آپ سے مقدمے بازی کی فیس اور مجھ سے پیشی کی تاریخیں بڑھانے کی فیس۔ اب تاریخ بڑھانے اور مقدمہ جاری رکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ سلطانہ آپ کی بہو بننے کے لئے راضی ہو گئی ہے۔"

"جو میرے بیٹے کو کھا گئی اسے میری بہو مت کہو۔"

"جو بیٹا اللہ کو پیارا ہو گیا اس رشتے والی بہو کو بھول جائیں۔ اب وہ میری دلہن بن کر آنے والی ہے۔"

ماں کو ایسا لگا جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ وہ چیخ پڑی "نہیں بیٹا! ایسی بات زبان پر نہ لاؤ۔ اس کے لئے لڑتے لڑتے دو بیٹوں میں سے ایک بیٹا رہ گیا ہے۔ میرا کلیجہ نہ جلاؤ۔ اسے اپنے دماغ سے نکال دو۔ وہ خوبصورت بلا ہے۔ میرے بچوں کو کھا جانے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔"

"امی! آپ خواہ مخواہ گھبرا رہی ہیں۔ میں بھائی جان کی طرح شریف اور نادان نہیں ہوں۔ اسے چار برس تک جیل میں رکھ کر ایسا سبق سکھایا ہے کہ وہ تمام عمر میری وفاداری کا ہی سبق پڑھتی رہے گی۔"

"کچھ بھی ہو میں اسے حویلی میں برداشت نہیں کروں گی۔"

"میں اسی حویلی میں اسے لاؤں گا۔ اسی کمرے میں اسی سیج پر پہنچاؤں گا جہاں اس نے چیخ چیخ کر میری زیادتی اور اپنی پارسائی کا شور مچایا تھا۔ مجھے عیاش اور گنہگار ظاہر کیا تھا۔ وہ اپنے ایک ہاتھ کو نوچ نوچ کر اسے لہولہان کر کے بھی داغ دار رہی۔ میں اسے دلہن بنا کر یہ داغ دھو ڈالوں گا کہ میں عیاش تھا میں نے اس پر ظلم کیا تھا۔ نہیں' کوئی ظلم ہوا ہوتا تو وہ ظالم سے نکاح قبول نہ کرتی۔ وہ مجھے قبول کر کے پھر اسی حویلی میں آئے گی۔"

چودھرائن آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی باتیں سنتی رہی۔ پھر تائید میں سر ہلا کر بولی "ہاں' تمہاری باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں۔ اگر وہ تم سے راضی ہو گئی ہے تو اسے دلہن بنا کر ضرور لاؤ۔ میں خواہ مخواہ مقدمے میں وقت اور رقم ضائع کرتی رہی۔ اسے تو میں بہو بنا کر خاک میں ملا سکتی ہوں۔"

وہ ہنستا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ پھر جوتوں سمیت بستر پر گر کر چاروں شانے چت ہو گیا۔ چھت کو تکتے ہوئے سوچنے لگا۔

میرے دماغ میں کیا ہے؟ میرے دل میں کچھ ہے جو سلطانہ کو ڈنک مارنا چاہتا ہے۔ شاید میں اپنی توہین کا بدلہ لے رہا ہوں۔

شاید میں اُس خوبصورت بلا کا قائل بن کر بدنامی کا داغ دھو رہا ہوں۔ مگر میں اس کا دیوانہ ہوں۔ اس دیوانگی نے خوب کھیل کھیلا ہے۔ اُس کی پارسائی ڈھونگ بن جائے گی۔ میری عیاشی کو ازدواجی رشتے کا نام ملے گا۔ انتقام بھی پورا ہو گا اور وہ مجھے حاصل بھی ہوتی رہے گی۔

وہ ہنستا رہا اور سوچتا رہا۔ سوچتا رہا اور ہنستا رہا۔

O☆☆O

سلطانہ نے سوچتے ہوئے سر جھکا کر فرش کی طرف دیکھا۔ اس فرش پر چار برس پہلے وجاہت کی لاش پڑی تھی۔ اس رات کا ایک ایک لمحہ اسے یاد تھا۔ وہ اسی سیج پر بیٹھی ہوئی تھی جہاں وجاہت کو کھلی تھی۔ وہ گھونگھٹ اٹھانے کے بعد اس پر جھک گیا تھا پھر اس پر سے ہوتا ہوا پلنگ کے سرے پر سے لڑھکتا ہوا فرش پر گر پڑا تھا۔

اس کے دل سے ایک آہ نکلی۔ پہلی بار وہ غصے میں سہاگ کی سیج چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ دوسری بار وجاہت سیج کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ اور دونوں بار دلہن کے بستر کو شرافت نے آگ لگائی تھی۔

اور کیسی مجبوری اور بدبختی تھی کہ وہ اس آگ لگانے والے کی سیج پر جلنے والی تھی۔ وہ بہت شہ زور تھی۔ اقتدار کی کرسی بھی شہ زور ہوتی ہے۔ لیکن اپنے اوپر آکر بیٹھنے والے ظالم کو نہیں روک سکتی۔ وہ بھی شرافت کو نہیں روک سکتی تھی۔

وہ بستر پر جھک کر اسے ایک ہتھیلی سے سہلانے لگی۔ وہ وجاہت کا بستر تھا۔ آخری بار اسے دیکھنے اور چھونے آئی تھی۔ چار برس میں وہ بستر بدل گیا تھا۔ پھولوں کی پتیاں مرجھا کر ہوا میں اڑ گئی تھیں اور وہاں اچھی خاصی گرد جم گئی تھی۔ وہ اپنا میک اپ بکس لے کر وہاں سے اٹھ گئی۔ وہ سہاگ کے کمرے سے نکل کر سیڑھیاں اترنے کے بعد کوٹھی کے مختلف حصوں سے گزرتی ہوئی باہر آئی۔ باہر اس کے سیکریٹری کا جوان بیٹا اس کا منتظر تھا۔

بلال نے اس کے لئے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ وہ کوٹھی کے برآمدے سے اتر کر گاڑی کے پاس آئی پھر اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ بلال نے خوش ہو کر پچھلے دروازے کو بند کیا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا آکر اس کے برابر اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا "میں ملازم کا بیٹا ہوں۔ آپ کو مالکن کی طرح پچھلی سیٹ پر بیٹھنا چاہئے تھا۔"

وہ عادت کے مطابق خاموش رہی۔ اس نے کہا "آپ نے یہاں آتے وقت اور اب جاتے وقت میرے ساتھ بیٹھ کر مجھے آسمان پر پہنچا دیا ہے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "کل میں دلہن بن کر جاؤں گی تو میرے ساتھ ایک شیطان بیٹھا ہو گا۔ تم تو خیر انسان ہو۔"

"کیا یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ آپ چودھری کو شیطان کہتے ہوئے بھی شادی کر رہی ہیں۔"

"شیطان سے رشتہ نہ کرو تب بھی وہ ہمارے اندر جگہ بنا لیتا ہے۔ کیا تمہارے اندر شیطان نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔"

"کیا میرے لئے نہیں سوچ رہے ہو؟"

"جی ہاں۔ وہ 'آپ بہت اچھی ہیں۔ میں سوچنا نہیں چاہتا مگر سوچتا ہوں۔ دیکھنا نہیں چاہتا مگر دیکھتا ہوں۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"شیطان ہو گیا ہے۔"

بات سچی تھی' وہ کچھ نہ بول سکا۔ وہ بولی "کسی کے اندر پیدا شیطان ہوتا ہے' وہ سوچ کر اور دیکھ کر رہ جاتا ہے۔ کسی کے اندر منہ زور شیطان ہوتا ہے۔ وہ چھین جھپٹ کر حاصل کر لیتا ہے۔"

"آپ درست کہتی ہیں۔ میں آپ کے سیکریٹری کا بیٹا ہوں۔ ہمارے خاندان میں سب قلم پکڑتے ہیں۔ آپ کے چودھریوں والے خاندانوں میں گولیاں چلتی ہیں۔ میں گولیوں سے نہیں ڈرتا لیکن حرام موت نہیں مرنا چاہتا اور حرام موت سے کترانے والے بزدل نہیں ہوتے' باشعور ہوتے ہیں۔ خدا کی دی ہوئی زندگی کو سنبھال کر رکھتے ہیں۔"

"تم بہت اچھے ہو۔ میں تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی اس لئے ساتھ بیٹھ گئی ہوں۔ تم آسمان سے تارے توڑ کر نہیں لا سکتے لیکن ہاتھوں میں آئینہ لے کر ستاروں کو اپنی گود میں دیکھ سکتے ہو۔ بس اسی حد تک دیکھو۔ اور صبر کرو۔"

وہ پنڈ والی حویلی میں پہنچی تو وہاں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ حویلی کو رنگ برنگے قمقموں سے سجایا گیا تھا۔ ڈھولک کی تھاپ پر عورتوں کے گیت گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تمام رشتے دار اس کے استقبال کے لئے حویلی سے باہر آ گئے تھے۔ ایک تو یہ خوشی تھی کہ وہ جیل سے رہا ہو کر آ رہی ہے' دوسری خوشی اسے دلہن بنا کر رخصت کرنے کی تھی۔ لیکن دلہن بننے والی کے چہرے پر نہ خوشی تھی' نہ صدمہ تھا اور نہ ہی وہ شکستہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر سنگِ مرمر کے سے تاج محل جیسا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

دوسرے دن برات آگئی۔ دن کو نکاح ہوا' شام کو رخصتی ہو گئی۔ شرافت کے براتی پچاس رائفلیں لے کر آئے تھے۔ سلطانہ کے میکے سے سسرال تک ہوائی فائر کرتے جا رہے تھے۔ وہ گھونگھٹ میں چھپی ہوئی شرافت کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے گھونگھٹ کے قریب جھک کر اس کے کان میں کہا "میرے حلقے میں اٹھائیس ہزار ووٹ دینے والے ہیں۔ حویلی پہنچنے تک یہ میرے وفادار اٹھائیس ہزار گولیاں آسمان کی طرف داغتے رہیں گے اور بھنگڑہ ڈالتے رہیں گے۔ میں نے اسمبلی میں

پہنچنے کی اتنی خوشیاں نہیں منائی تھیں جتنی تمہاری سیج تک پہنچنے کی منا رہا ہوں۔"

وہ ایک فاتح کی شان سے چلنے لگا۔ حویلی کے دروازے پر چودھری شرافت علی ایم این اے کی چودھرائن ماں نفرت اور غرور سے گردن اکڑائے کھڑی تھی۔ بہو حویلی کے اندر جانے لگی تو وہ بولی۔ "گھونگھٹ بدل جانے سے دلہن نہیں بن جاتی۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔"

دلہن گھونگھٹ میں سکڑی ہوئی ہے۔ مجبور ہوتی ہے۔ سلطانہ کفن پھاڑ کر بولنے والوں میں سے تھی مگر خاموش رہی۔ بھابھیوں نے اسے سہاگ کی سیج پر پہنچا دیا۔ پھر باہر آکر دروازے کو بند کردیا۔ بند دروازے کے باہر چودھرائن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اونچی آواز میں کہہ رہی تھی "تم لوگ چار برس پہلے بھی اسی حویلی میں آئے تھے۔ اسی کمرے میں وہ دلہن بنی تھی۔ اگر میرا شرافت بدچلن اور عیاش تھا تو یہ ایک عیاش کے کمرے میں پھر کیسے آگئی ہے۔ جو غیرت مند باپ اسے یہاں سے لے گیا تھا اسی بے غیرت نے اپنی بیٹی پھر یہاں بھیج دی ہے۔"

شرافت نے آکر کہا "امی! خاموش ہو جائیں۔ ایک بار شادی بربادی میں بدل گئی۔ آپ پھر اسی بربادی کا سامان کر رہی ہیں۔"

پھر اس نے رشتے داروں سے کہا "پلیز آپ لوگ اپنے کمروں میں جائیں۔ رات زیادہ ہو گئی ہے' آرام کریں۔"

چودھرائن نے کہا "کوئی آرام نہیں کرے گا۔ یہاں سب میرے ساتھ صبح تک جاگتے رہیں گے اور یہ تماشا دیکھیں گے کہ دلہن سہاگ رات گزار کر کس طرح یہاں سے دھکے کھا کر نکلتی ہے۔"

"آپ کے نکالنے سے پہلے ہی میں اسے دوسری کوٹھی میں لے جاؤں گا۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا دروازہ کھول کر دلہن کے کمرے میں آیا۔ پھر دروازے کو اندر سے بند کرکے بولا "جی چاہتا ہے تمہیں ابھی یہاں سے لے جاؤں مگر تمہیں گھونگھٹ میں دیکھ کر دل بے قابو ہو رہا ہے۔ چار برس پہلے جس گورے گورے پھول جیسے ہاتھ کو چوم لیا تھا' اس کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔"

وہ قریب آکر بیٹھ گیا۔ پھر بولا "سہاگ کی پہلی رات بڑا چودھری منہ دکھائی کے لئے تمہیں انگوٹھی نہ پہنا سکا۔ یہ جذباتی فرض میں نے ادا کیا تھا۔ گھونگھٹ اٹھا کر رخِ روشن بھی دیکھ لیا تھا۔ پھر یہ تکلف کیوں کر رہی ہو؟ تم نے بہت انتظار کرایا ہے۔ بس اب سامنے آجاؤ۔"

اس نے گھونگھٹ اٹھا کر اسے دیکھا۔ کیا منہ دکھائی تھی' پچھلے چار برس کی کمائی تھی۔ اس نے گھونگھٹ کھینچ کر ایک طرف پھینک دیا۔ اس کے ساتھ بستر پر گر پڑا۔ وہ بولی "اب تو میں تمہاری ہوں۔ یہ زیور تو اتارنے دو۔"

"میں اسی طرح پہلو میں رہ کر زیور اتارتی جاؤں۔"

اس کا سر شرافت کے ایک بازو پر رکھا ہوا تھا۔ وہ بولی "ادھر منہ کرو۔ مجھے شرم آتی ہے۔"

"زیادہ نخرے نہ کرو۔ میرے صبر کا امتحان نہ لو۔"

وہ اچانک سخت لہجے میں بولی "چودھری! کیا تم سمجھتے ہو مجھے مجبور کرکے اپنی من مانی کرسکو گے؟ کیا میرے تیور بھول گئے ہو؟ میں آخری بار سمجھاتی ہوں۔ مجھے محبت سے حاصل کرو۔ ورنہ نفرت سے بہت مہنگی پڑوں گی۔"

شرافت نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ بات سمجھ میں آگئی۔ اتنی مشکلوں سے ہاتھ آنے والی پھر ہنگامے برپا کرسکتی تھی۔ اس حسین عورت کو حاصل کرنے کے لئے وہ بولا "ٹھیک بات ہے' منہ پھیر رہا ہوں۔ مگر یہ تمہاری دھمکیاں دینے والی عادت اچھی نہیں ہے۔"

اس نے منہ پھیر لیا مگر سلطانہ کا سر اپنے بازو پر رہنے دیا تاکہ وہ دسترس میں رہے جبکہ وہ دلہن بن کر آئی تھی' بھاگ کے نہیں آئی تھی۔ اس نے محسوس کیا سلطانہ نے اس کے بازو پر سر رکھے ہی رکھے کروٹ لی ہے۔ پھر اسے اپنی کلائی پر ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ اسی لمحے میں کھٹ کی ہلکی آواز کے ساتھ اس کی کلائی جکڑ گئی۔

اس نے چونک کر سر گھماتے ہوئے دیکھا۔ سلطانہ بستر پر سے اٹھ کر دور ہو گئی تھی۔ پلنگ کے دوسری طرف جاکر کھڑی ہو گئی تھی۔ پلنگ کے سرہانے اسٹین لیس فولاد کی جو سلاخیں تھیں اس کی ایک سلاخ میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور ہتھکڑی کے دوسرے حصے میں شرافت کی کلائی گرفتار ہو گئی تھی۔ وہ حیرانی سے بولا "یہ کیا حرکت ہے؟"

"تم نے آج تک جتنی حرکتیں کیں' اس کے جواب میں یہ میری پہلی اور آخری حرکت ہے۔"

وہ غصے سے ہتھکڑی کو جھٹکے دیتے ہوئے بولا "اسے کھولو۔ یہ یہ تم اسے کہاں سے لائی ہو؟"

"جیل سے۔ میرے ابا جی چار برس تک جیلر کی جیب گرم کرتے رہے۔ اتنی رشوت کے بدلے میں نے رہائی کے وقت اس

سے یہ ہتھکڑی ملی تھی۔"

"مگر یہ کیا حماقت ہے؟ مجھے ہتھکڑی پہنا کر تمہیں کیا ملے گا؟"

اس نے سنگار میز سے میک اپ بکس اٹھا کر ایک میز پر رکھا۔ پھر اس کا لاک کھولتے ہوئے بولی "دلہن کے ساتھ اس کے میکے سے بیوٹی بکس آتا ہے۔ میں نے رہائی سے پہلے ہی اپنے میکے والوں کے ذریعے بیوٹی بکس کا انتظام کرایا تھا۔"

اس نے بکس کے اندر سے لوشن، کریم، شیمپو اور ہیر آئل کی شیشیاں نکالیں۔ پھر ایک ہیر آئل کی بوتل کھول کر بولی "ان تمام شیشیوں میں پٹرول ہے۔ ذرا سونگھ لو۔"

اس نے تھوڑا سا پٹرول اس کی طرف چھڑک دیا۔ وہ گھبرا کر بولا "نہیں! ات۔ تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

"ارادہ تو اسے کہتے ہیں جو ابھی پورا نہ ہوا ہو اور دل ہی میں رہ گیا ہو۔ جیسے مجھے حاصل کرنے کا ارادہ تمہارے دل میں رہ گیا۔ دلہن ہے' پھولوں کی سیج ہے' بند کمرا ہے' تمہیں ارادے سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا تھا لیکن میرے میکے نے یہاں تک اٹھا کیس ہزار گولیاں برسانے والے! تمہارا ارادہ صرف ارادہ ہی رہ گیا اور میں جو کرنے والی ہوں اس سے مجھے کوئی باز نہیں رکھ سکے گا۔"

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ہر بازی جیتنے والا' ہر میدان مارنے والا' اسمبلی میں پہنچنے والا' عدالت میں پہنچنے والے مقدمے کو مٹا دینے والا ایک عورت کے بستر پر مات کھا جائے گا۔

اور یہ بھی ایک خواب سا لگ رہا تھا کہ وہ اپنی ہی حویلی کے ایک کمرے میں یوں بے بس ہو جائے گا۔ ابھی آنکھ کھلے گی تو خواب ٹوٹ جائے گا اور سلطانہ کی جوانی اپنے بازوؤں میں کسی ہوئی ملے گی۔

سلطانہ کھلی ہوئی شیشی ہاتھ میں لئے دروازے کے پاس آئی۔ وہ اندر سے اچھی طرح بند تھا۔ اس نے دروازے پر ہاتھ مارتے ہوئے آواز دی "اے چودھرائن! میری آواز سن رہی ہے؟"

دروازے کے دوسری طرف سے چودھرائن نے کہا "اری بے شرم! پہلی رات اپنے کمرے سے بول رہی ہے۔"

سلطانہ نے کہا "یہ دلہن کی پہلی رات نہیں ہے۔ تو اپنے مردہ بیٹے کی بہو کی آواز سن رہی ہے اور اب زندہ بیٹے کی دم توڑتی ہوئی آواز سنے گی۔"

شرافت نے ہتھکڑی والے ہاتھ کو جھٹکے دیتے ہوئے چیخ کر کہا۔ "امی! میں مصیبت میں ہوں۔ ہمارے بندوں کو بلاؤ اور یہ دروازہ توڑ ڈالو۔"

سلطانہ نے سہاگ کی سیج پر پٹرول چھڑکتے ہوئے کہا "اپنی ماں سے کہو' دروازے کو کوئی نہ توڑے۔ ورنہ یہ ٹوٹنے سے پہلے تم زندگی سے ٹوٹ جاؤ گے۔ یہ بچہ بھی سمجھتا ہے کہ آگ کتنی تیزی سے جلاتی ہے۔"

وہ دوسری شیشی کھول کر اس پر پٹرول چھڑکنے لگی۔ وہ لپک لپک کر سلطانہ کی طرف بڑھتا اور اسے پکڑنا چاہتا تھا مگر ہتھکڑی روک رہی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر کہنے لگا "امی! کسی کو نہ بلاؤ۔ کوئی دروازہ نہ توڑے۔ یہ پاگل ہو گئی ہے۔ آگ لگا رہی ہے۔ میں جل جاؤں گا۔ میں مر جاؤں گا۔ کسی کو دروازے کے پاس نہ آنے دو۔ سلطانہ! میری سلطانہ! مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارا دیوانہ ہوں۔"

باہر سے ماں نے کہا "ارے او عورت کے غلام! تو اس کے سامنے کیوں گڑگڑا رہا ہے۔ اسے جوتے مار کر باہر کیوں نہیں لاتا؟"

شرافت جواب دینا چاہتا تھا اسی وقت سلطانہ نے ماچس کی ایک تیلی جلائی۔ وہ حلق پھاڑ کر چیختے ہوئے بولا "نہیں سلطانہ! اسے بجھاؤ۔ بجھاؤ اسے بستر کے پاس نہ لاؤ۔"

"لاؤں گی تو کیا ہو گا؟ بستر میں آگ لگ جائے گی؟ یہ آگ تو میرے سہاگ کی پہلی رات کو تم نے لگائی تھی۔ میں بستر پر سونا بھول گئی' فرش پر سونے لگی۔ دوسری بار وجاہت نے پھر مجھے پھولوں کی سیج پر بٹھایا' تم نے پھر سیج میں آگ لگا دی۔"

"نہیں' تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔"

وہ دوسری تیلی جلاتے ہوئے بولی "اس آگ کے سامنے جھوٹ بولو گے؟"

"ت ت ... نہیں۔ تیلی پھینک دو۔ میں نے قتل کیا تھا۔ مگر تمہارے لئے کیا تھا۔ میری دیوانگی کو سمجھو۔ میں نے جو بھی کیا' تمہیں حاصل کرنے کے لئے کیا۔"

وہ تیسری تیلی جلا کر بستر پر آئی پھر اس کے پہلو میں لیٹتے ہوئے بولی "آؤ مجھے حاصل کرو۔"

اس نے تیلی والے ہاتھ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ ہاتھ ہٹا کر بولی "یہ بجھنے سے پہلے بستر پر گر پڑے گی۔ تیلی کو نہ دیکھو۔ ہوس کو دیکھو' اقتدار کو دیکھو۔ میں تمہاری کرسی جلا رہی ہوں۔ تم اسمبلی تک نہیں پہنچ سکو گے۔ شعلوں کی سیج سجا رہی ہوں' کسی بیوہ کی جوانی کو پا نہیں سکو گے۔"

یہ کہتے ہی اس نے جلتی ہوئی تیلی بستر پر چھوڑ دی۔ یکبارگی شعلے بھڑک گئے۔ وہ چیخنے لگا۔ ہتھکڑی کو جھٹکے دے دے کر دوسرے ہاتھ سے سلطانہ کو مارنے لگا۔ اس کی چیخوں کے دوران باہر سے دروازہ پیٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہی ہوتا ہے' باہر سے بہت شور اٹھا کرتا ہے' باہر سے بہت آگ لگا کرتی ہے لیکن اندر کی آگ دکھائی نہیں دیتی۔ اندر کا شور سنائی نہیں دیتا۔ کبھی کبھی' ہاں ... کبھی کبھی اندر کی آواز اور اندر کی آگ بھڑکتے بھڑکتے بند دروازے کو توڑ کر باہر آجاتی ہے۔

جب دروازہ جل کر گر پڑا تب چودھرائن نے دیکھا' بہو نے بیٹے کا بستر گرم رکھا تھا باقی سب کچھ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

نے کچھ امید نگاہوں سے شیراز
حیرت سے کی طرف دیکھا انہوں نے اپنے
بریف کیس سے بڑے سائز کا ایک سفید لفافہ نکال کر
میز پر سے میری جانب بڑھا دیا میں نے لرزتے کپکپاتے
ہاتھوں سے لفافہ تھام لیا شیراز کے چہرے پر چھائی گمبھیرتا مجھے
ان سے کچھ پوچھنے کی اجازت نہ دے رہی تھی۔ ان کے
چہرے کے تاثرات نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ سب کچھ
جسے الفاظ کی صورت میں سننے کا مجھ میں نہ حوصلہ تھا نہ یارا۔
بے اختیار میری آنکھیں بھر آئیں اور ایک دبی دبی سی آہ مرغ
بسمل کی مانند میرے سینے میں پھڑپھڑا کے رہ گئی یہ قسمت کی
ستم ظریفی نہیں تو اور کیا تھا کہ میں... میں جسے پھولوں،
خوشبوؤں اور بچوں سے عشق تھا۔ شادی کے سات برس گزر
جانے کے بعد بھی بنجر زمین کی طرح بے آب و گیاہ تھی۔
"کیا... کیا ہوا... رازی...؟" میں نے گھٹی گھٹی
آواز میں پوچھا۔
شیراز جو سر جھکائے افسردہ اور اداس بیٹھے تھے گمبیر
لہجے میں بولے "تم خود دیکھ لو۔"
میں انہیں کیسے بتاتی کہ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں
اس سفید لفافے سے اپنی تقدیر کا فیصلہ نکال کر پڑھ سکتی۔
اس لفافے میں میڈیکل رپورٹ تھی جو میں لفافے سے
نکالے بنا شیراز کے خاموش اور اداس چہرے پر پڑھ سکتی تھی۔
میرے دل کی حالت ان کہی تھی پھر یک بیک جانے کہاں
سے ڈھیروں دھواں سا میرے حلق میں بھر گیا۔ میں نے
دلدیدہ نگاہوں سے اپنے روبرو بیٹھے شیراز کو دیکھا اور اگلے
ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان کے اور میرے مابین
آنسوؤں کی ایک خلیج حائل ہو گئی ہو۔
ہاں وہ آنسو ہی تھے۔
میری تیرہ بختی پر میری آنکھوں سے بہنے والے
آنسو۔
میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ شیراز اپنی جگہ سے
اٹھ کر میرے قریب بہت قریب آ بیٹھے اور میرے شانوں
پر اپنا بازو حمائل کر دیا پھر اپنے ہاتھ سے میرا
شانہ دھیرے دھیرے تھپتھپاتے ہوئے بولے "ٹیک اٹ
ایزی... میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے بچے کی
نہیں تمہاری ضرورت ہے تم ماں نہیں بن سکیں نہ سہی۔ آئی
ڈونٹ مائنڈ۔"
"رازی..." میں نے زخم خوردہ نگاہوں سے ان کی
طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا اتنے بڑے صدمے کو آسانی
سے قبول کیا جا سکتا ہے؟"
"یو فولش... ڈونٹ... بی کاؤرڈ... ڈارلنگ یو آر بریو اینف"
شیراز بولے۔
"نہیں... نہیں رازی... میں اتنی بہادر نہیں ہوں"
میں نے صدمے سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔
شیراز نے ایک لمبی سانس کھینچی اور مجھے یوں لگا
جیسے ان کی یہ سانس تیغ کی مانند میرے دل میں اترتی چلی
گئی پھر انہوں نے دھیرے سے میرا شانہ تھپتھپایا اور
یوں جیسے کسی معصوم بچے کو اس کا کھلونا ٹوٹ جانے پر بہلایا
کرتے ہیں بولے "اگر تم چاہو گی تو ہم کوئی بچہ اڈوپٹ کر
لیں گے۔"
"کیا اڈوپٹڈ بچے کو اپنے سینے سے لگا کر میں وہ
گرمی پا سکوں گی رازی... نہیں... نہیں رازی... ہرگز
نہیں... مجھے اپنا بچہ چاہیے... تم جانتے ہو... تم تو
جانتے ہو نا کہ مجھے بچوں سے کتنا پیار ہے" میں صدمے
سے بے حال ہو رہی تھی۔
"آئی نو... آئی نو... مگر خدا اپنے بندوں کو آزماتا
بھی تو ہے۔"
"ایسی آزمائش؟" میری آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی
اور میں اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا کر سسکنے لگی۔
"فار گاڈ سیک بیبی!" شیراز لجاجت سے بولے۔
"پلیز! پلیز رازی! مجھے جی بھر کر رو لینے دیں ورنہ میں
پاگل ہو جاؤں گی۔" میں نے اپنے بال پوری شدت سے
دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیے۔ اس وقت میں خود کو شدید
ذہنی ہیجان سے دوچار پا رہی تھی۔
"او کے... او کے... اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ رو لینے
سے تمہیں کچھ سکون مل سکتا ہے تو رو لو۔ میں کمرے کا دروازہ
بند کیے دیتا ہوں تاکہ ملازموں میں سے کوئی تمہیں روتے
ہوئے نہ دیکھ سکے۔ تم جانتی ہو نا گھر کے ملازم تو رائی کا
پہاڑ اور ذرا سی بات کا افسانہ بنا لیتے ہیں... وی شُڈ بی
کیئر فل" یہ کہتے ہوئے شیراز اٹھے اور انہوں نے کمرے
کا دروازہ بند کرنے کے بعد کھڑکیوں کے پردے کھینچ دیے۔
کمرے میں نیم تاریکی سی پھیل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں
گمنام سے اندھیاروں میں ڈوبتی چلی جا رہی ہوں۔ سفید لفافہ
میری آغوش میں پڑا تھا اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے
والے آنسو اس لفافے کو بھگوتے چلے جا رہے تھے۔

اس لفافے میں میری تقدیر کا فیصلہ تھا۔
میری بدقسمتی دانت نکوسے مجھ پر ہنس رہی تھی۔
اور میں سوچ رہی تھی کہ اس ایک محرومی نے کس بے دردی سے زندگی سے اس کا تمام تر حسن چھین لیا تھا۔ میں جو اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھا کرتی تھی، اس وقت اپنے آپ کو دنیا کی سب سے زیادہ تیرہ بخت عورت محسوس کر رہی تھی۔ یہ احساس کہ میں شیراز کو، جنھوں نے مجھے ہر ممکن آسائش فراہم کی تھی، مجھے محبت اور چاہت جیسی انمول دولت سے نوازا تھا، کچھ نہ دے سکوں گی، مجھے کچوکے دے رہا تھا۔ میں ان سے نگاہیں ملانے کی ہمت نہ کر پا رہی تھی اور کسی مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی۔
کاش!
کاش! کوئی معجزہ مجھے سرخرو کر سکتا۔

شیراز سے میری پہلی ملاقات یونیورسٹی کے پُرسحر ماحول میں ہوئی تھی۔ میں ہفتہ واری چھٹی بجیا کے سنگ گزارنے کے لیے ہاسٹل سے شہر جانے کو نکلی تھی اور بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی کہ ایک چمکیلی گاڑی زوردار دھچکے کے ساتھ میرے قریب آ رکی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ایک نوجوان نے گردن کھڑکی سے نکالتے ہوئے بڑی تہذیب کے ساتھ پوچھا۔
"محترمہ! آپ کہاں جائیں گی؟"
میں جو امی کی موت، ابو کی دوسری شادی، سوتیلی ماں کی زیادتیوں اور ابو کی بے اعتنائی کے سبب ان دنوں بڑی مضمحل، دل شکستہ اور تلخ گو ہو چکی تھی، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے نوجوان کی وجاہت سے رتی بھر بھی مرعوب نہ ہوتے ہوئے جلے بھنے لہجے میں بولی "جہنم میں"
وہ مسکرایا اور خوشگوار لہجے میں بولا "اگر آپ اجازت دیں تو میں چھوڑ دوں آپ کو جہنم تک"
"جی نہیں شکریہ... میں خود چلی جاؤں گی"
"جہنم تک" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔
میں نے ان سُنی کرتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے مگر اس کی کار رینگتے ہوئے پھر میرے نزدیک اس طور آ رکی کہ اب کی بار میرا راستہ رک گیا۔
"ویسے بظاہر تو آپ کا تعلق فردوسِ بریں سے لگتا ہے" وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔
میں نے اسے بری طرح گھورا۔
"حوروں کے بارے میں تو ہم نے یہی سنا اور پڑھا ہے کہ وہ جنت میں رہا کرتی ہیں" اس نے کہا۔
"ایڈیٹ!" میں نے دانت پیسے۔
"غالباً آپ گرلز ہاسٹل میں رہتی ہیں" اس کا لہجہ استفہامیہ تھا۔
"آپ کو مطلب" مجھے تاؤ آ گیا۔
"مطلب ہے جبھی تو پوچھ رہا ہوں"
"اسٹیوپڈ!" میں نے پھنک کر کہا۔
"ٹھیک ہے" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
"آئی ول کل یو" میں نے پھر دانت پیسے۔
"آپ کو زحمت فرمانے کی ضرورت نہیں۔ ہم تو پہلے ہی مارے گئے ہیں"
چار بج چکے تھے اور یونیورسٹی کی رونقیں ماند پڑ چکی تھیں، اور میں جی ہی جی میں خود کو برا بھلا کہتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اگر میں کچھ دیر قبل عالیہ کے ساتھ ہاسٹل سے نکل آتی تو اس وقت یہ کار نشین آوارہ گرد راستہ سنسان دیکھ کر مجھے یوں تو نہ آ گھیرتا۔
"آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"
"ایڈیٹ!"
"اچھا نام ہے"
میں نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا، وہ مسکرایا پھر اس نے اسٹیئرنگ وہیل پر اپنی گرفت جمائی اور میرے بازوؤں کی جانب جو ایک حلقے کی صورت میرے سینے سے لگی کتابوں اور جرنل کو دبوچے ہوئے تھے، دیکھتے ہوئے اس کی نگاہوں میں ایک مخصوص چمک ابھری اور وہ میری جانب الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا "اوکے مس قرۃ العین، بائی...!"
میں بھونچکا رہ گئی۔
اسے میرا نام کیونکر معلوم ہو گیا تھا۔
اور اس سے پہلے کہ مجھے اپنی اس الجھن کا جواب ملتا وہ اپنی گاڑی گزار لے گیا۔ میں نے یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ میرے بازوؤں کے حلقے کی جانب اس قدر انہماک سے کیوں دیکھ رہا تھا گردن کو دائیں جانب ایک مخصوص زاویے پر جھکا کر دیکھا اور مجھے اپنی الجھن کا حل مل گیا۔ میرے جرنل پر چڑھے خاکی کاغذ پر سنہری روشنائی سے جلی حروف میں میرا نام لکھا ہوا تھا اور یوں اسے میرا نام معلوم ہو گیا تھا۔
اس واقعے کو چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک روز میری ایک استاد مسز حمیرہ فاطمی نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر کہا۔ "قرۃ العین! کیا آپ مجھے اپنے والدین سے ملانا پسند کریں گی؟"

میں ایک دبی دبی سی سرد آہ بھر کر رہ گئی پھر دھیمے سے مدھم سُروں میں مسز فاطمی سے کہا: "میڈم! میری والدہ تو انتقال کر چکی ہیں اور ابو... وہ... اس شہر میں نہیں رہتے۔"

"پھر... کہاں رہتے ہیں وہ؟"

میں مسز فاطمی کو کیسے بتاتی کہ وہ جہاں بھی رہتے تھے، میرے نہیں تھے۔ امی کے انتقال کے چھ ماہ بعد ہی انھوں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ تقریباً تین برس تک میں اور بجیا سوتیلی ماں کی زیادتیوں کا شکار بنے رہے پھر جب بجیا کو کراچی کے ایک کالج میں لیکچرر شپ مل گئی تو وہ مجھے لے کر ابو اور ان کی اہلیہ کی زندگی سے نکل آئی تھیں۔ یہاں کچھ عرصے ہم دونوں بہنیں دو کمروں کے ایک کرائے کے فلیٹ میں ساتھ رہیں پھر جب مجھے آنرز میں داخلہ مل گیا تو بجیا نے یونیورسٹی ہاسٹل میں میری رہائش کا بندوبست کر دیا اور خود اپنی ایک ساتھی لیکچرر کے ہاں پے اِنگ گیسٹ کے طور پر رہنے لگیں۔ زندگی کے اس نئے ڈھب سے بجیا نے تو سمجھوتا کر لیا یا شاید وہ ایسا ظاہر کرتی تھیں مگر میں سمجھوتا نہ کر پائی۔ ہفتے کے چھ دن ساتویں دن کے انتظار میں گزارنا بڑا ہی مشکل اور صبر آزما کام تھا۔ چھ دن ہاسٹل میں گزارنے کے بعد جب میں ساتواں دن بجیا کے سنگ گزارنے جاتی تو لمحہ لمحہ دکھ کی آنچ میں پگھلنے والے دل پر صبر و ضبط کی ٹھنڈی سِل دھر کر جاتی۔ میں بجیا کو اپنے دکھ کی جھلک دیے بغیر چھٹی کا دن ان کے ساتھ گزارتی اور پھر ہاسٹل واپس آ جاتی جہاں میری کلاس فیلوز مجھے مغرور، بد دماغ اور بد مزاج جیسے خطابات سے نوازنے کے لیے میری منتظر ہوتیں۔

ان خطابات سے نوازے جانے کے سلسلے میں نہ قصور میرا تھا نہ میری ان ساتھیوں کا جو مجھے مغرور اور بد دماغ سمجھا کرتی تھیں بلکہ قصور ان حالات کا تھا جنھوں نے ان دنوں مجھے دل شکستہ اور ملول کر رکھا تھا۔ میں امی کے پیار، ابو کی شفقت اور بجیا کی چاہت کے حصار میں پلی بڑھی تھی۔ امی کے انتقال کے باعث ان کے پیار اور ابو کی دوسری شادی کے بعد ان کی شفقت سے محرومی کے نتیجے میں میرے پاس بچا ہی کیا تھا سوائے بجیا کی چاہت کے۔

چنانچہ جب مسز فاطمی نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو میں نے آہستہ سے کہا: "میڈم! وہ ہمارے ساتھ نہیں رہتے۔"

"کیوں؟"

"امی کے انتقال کے بعد انھوں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ وہ ہماری سوتیلی والدہ کے ساتھ رہتے ہیں۔"

"اور تم؟"

"میں یہاں ہاسٹل میں رہتی ہوں۔"

"تمھاری سرپرست تو بہر حال وہی ہیں نا؟"

"نو میڈم... میری سرپرست میری بجیا ہیں۔"

"وہ کہاں ہوتی ہیں؟"

"یہیں کراچی میں رہتی ہیں۔ کالج میں پڑھاتی ہیں۔"

"کس کالج میں؟"

جواب میں میں نے مسز فاطمی کو بجیا کے کالج کا نام بتا دیا لیکن میں حیران تھی کہ مسز فاطمی مجھ سے یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہی تھیں۔

زیادہ نہیں صرف چند دن بعد ہی مجھ پر مسز فاطمی کے اس تجسس کا سبب اس وقت کھل گیا جب بجیا نے مجھ سے کہا: "جینی! تمھاری ایک پروفیسر مجھ سے ملنے میرے کالج آئی تھیں۔"

"میری پروفیسر؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں... کوئی مسز فاطمی ہیں تمھارے ڈپارٹمنٹ میں؟"

"جی ہاں۔"

"وہی آئی تھیں میرے پاس۔"

"کیوں؟"

میرے اس سوال پر بجیا کچھ دیر تو چپ رہیں پھر حسب عادت اپنے مخصوص لہجے میں بولیں: "وہ اپنے کسی کزن کے لیے تم میں انٹرسٹڈ ہیں اور مجھے ان کی یہ بات اچھی لگی کہ گول مول بات کرنے یا ادھر ادھر کی ہانکنے کے بعد اپنے مدعا پر آنے کے بجائے انھوں نے بلا تمہید اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا۔"

"او مائی گاڈ! تو اس لیے وہ مجھ سے آپ کا محلِ وقوع پوچھ رہی تھیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں انھوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ میرا اتا پتا انھوں نے تم ہی سے معلوم کیا تھا۔ جلد ہی وہ دوبارہ آنے کو کہہ گئی ہیں۔"

"کیوں؟"

"یہ جاننے کے لیے کہ ہم ان کے دیے ہوئے پیغام پر غور کر رہے ہیں یا نہیں۔"

"آپ صاف انکار کر دیجیے گا۔" میں نے کڑے تیوروں سے کہا۔

"کیوں؟"

میں نے چونک کر بجیا کی طرف دیکھا پھر کہا: "کیوں کہ

یہ کیوں کر ممکن ہے؟"
"لیکن ناممکن ہونے کی کیا بات ہے؟"
اب میں نے متوحش ہو کر بجیا کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائیں، میری جانب بڑھیں پھر بڑے پیار سے اپنا دایاں بازو میرے شانوں پر دراز کرتے ہوئے بولیں۔
"لڑکے کی تصویر بھی لائی تھیں۔ بڑا ہینڈسم اور اسمارٹ ہے۔ بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز ڈگری لے رکھی ہے۔ یہاں سے نہیں انگلستان سے۔ اپنا بزنس ہے۔ لڑکے کے والدین حیات نہیں۔ ایک بڑی بہن ہیں جو اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ امریکا میں مقیم ہیں۔ مسز فاطمی لڑکے کی بابت ہر قسم کی ضمانت دینے کو تیار ہیں۔"
"بجیا...!" میں نے کان کھجاتے ہوئے بے بسی سے بجیا کی طرف دیکھا اور کہا۔ "مجھے آپ کے ارادے نیک نظر نہیں آتے۔"

بجیا مسکرا دیں پھر بولیں۔ "میرے ارادے بالکل نیک ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے عینی کہ میں تمہیں اپنی سب سے بڑی ذمے داری سمجھتی ہوں اور میری خواہش ہے کہ تمہیں جلد از جلد اس منزل پر پہنچا دوں جو ہر لڑکی کی آخری اور سچی منزل ہوتی ہے۔"
"بجیا! اگر آپ اس منزل کو ہر لڑکی کی آخری اور سچی منزل سمجھتی ہیں تو پہلے خود کیوں نہیں ہمکنار ہوتیں اس منزل سے؟" میں نے کہا۔

"تم میری بات چھوڑ دو۔" بجیا نے نظریں چرانے کی کوشش کی۔
"ہرگز نہیں۔" میں جو بجیا سے بے حد بے تکلف تھی، مچل کر بولی۔
"پلیز!" بجیا لجاجت سے بولیں۔ "بہتر ہو گا کہ ہم اصل موضوع سے نہ ہٹیں۔"
"فی الحال اس موضوع پر گفتگو کی کوئی گنجائش نہیں۔" میں نے صاف صاف کہا۔
"کیوں؟"
"کیونکہ ابھی میں پڑھ رہی ہوں، مجھے ماسٹرز ڈگری لینا ہے۔"
"تعلیم شادی کے بعد بھی جاری رکھی جا سکتی ہے۔ مسز فاطمی نے از خود یہ بات کہہ دی ہے کہ ان کے کزن کا کہنا ہے کہ اگر تم شادی کے بعد بھی سلسلۂ تعلیم جاری رکھنا چاہو گی تو اسے کوئی تردد نہ ہو گا۔"
"نہیں... نہیں... ہرگز نہیں بجیا۔ میں فی الحال شادی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتی۔"
"فارمالٹی نبھا رہی ہو؟" بجیا نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔
میں نے گہری نگاہوں سے بجیا کو دیکھا اور بولی۔ "کیا میں آپ پر بہت بوجھ بن گئی ہوں؟"
"ارے تو!" بجیا نے مجھے گلے سے لگا لیا اور جذبات سے بوجھل آواز میں بولیں۔ "عینی! تمہارے سوا میرے لیے اس دنیا میں ہے ہی کیا؟"
"تو پھر آپ مجھے اپنے سے دور کیوں کر دینا چاہتی ہیں؟" میں نے شاکی لہجے میں کہا۔
"دور کہاں... تم تو میرے دل میں رہتی ہو اور سدا بسی رہو گی... کوئی... کوئی بھی تمہیں وہاں سے کبھی بھی بے دخل نہیں کر سکے گا۔"
"بس تو آپ فوراً سے پیشتر مسز فاطمی سے انکار کر دیں۔" میں نے بجیا سے کہا۔
وہ کچھ دیر چپ رہیں پھر دھیمے سُروں میں بولیں۔
"عینی! میں تمہارے لیے اسی انداز میں سوچتی ہوں جس طور مائیں اپنی بیٹیوں کے لیے سوچا کرتی ہیں۔ کیا تم مجھے یاد دلانا پسند کرو گی کہ میں جو تمہاری بہن ہوں مگر ایک ماں کی طرح تم سے پیار کرتی ہوں۔"
بجیا کی اس جذباتی بات پر میرا جی بھر آیا۔ کیسے بتاتی میں انہیں کہ میرے لیے بھی دنیا میں اگر کوئی سچی خوشی تھی تو وہ انہی کی ذات تھی۔ ان کی خاطر تو میں ہر ویک اینڈ پر اپنے سارے دکھ ہاسٹل میں چھوڑ آتی تھی۔
میں کچھ دیر سر جھکائے بیٹھی رہی پھر میں نے کہا۔ "کیا آپ ایک ایسے شخص سے جسے نہ آپ جانتی ہیں اور نہ میں، میری شادی کر دینا پسند کریں گی؟"
"میں ہر ممکن ذریعے سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گی اور مطمئن ہو جانے پر ہی ہاں کروں گی۔ فی الحال تو اس سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے تمہاری رضا درکار ہے۔"
"اور ابو کی رضا؟"
میرے اس سوال پر بجیا کا چہرہ دھواں دھواں نظر آنے لگا پھر وہ بوجھل آواز میں بولیں۔ "ہم ابو کی زندگی سے نکل آئے ہیں عینی اور شاید وہ بھی یہی چاہتے تھے ورنہ گزشتہ دو ڈھائی برسوں میں وہ کبھی تو ہماری خیر خبر لینے آتے۔"

بلکہ چپ ہو رہی۔
بجیا نے غلط تو نہ کہا تھا۔
بالآخر میں نے بجیا کے اصرار اور منت کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔

پھر بجیا اور مسز فاطمی کی دوسرے تیسرے دن ملاقاتیں ہونے لگیں۔ بجیا نے مختلف ذرائع سے مسز فاطمی کے کزن کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ میرا خیال تھا حسب دستور مجھے موصوف کی جانب سے منظوری حاصل کرنے کے لیے ان کے سامنے جانا پڑے گا یا شاید کوئی اور طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ ایسے کسی مرحلے کی نوبت نہ آنے پائی البتہ ان کی تصویر بجیا نے ایک بند لفافے میں میرے حوالے ضرور کی جسے میں نے اسی وقت بجیا کو واپس لوٹاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تصویر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔"

"کیوں؟" بجیا نے تشویش سے میری جانب دیکھا تھا۔ وہ یہ اندازہ کرنا چاہتی تھیں کہ میں نے یہ بات خفا ہو کر تو نہ کہی تھی۔

بجیا کے اطمینان کے لیے مجھے مسکرانا پڑا۔

"تصویر دیکھنے کی ضرورت کیوں نہیں؟" بجیا نے پیار سے پوچھا۔

"کیونکہ... مجھے آپ کی پسند پر پورا اعتماد ہے۔"

"تھینک یو ڈیئر۔" بجیا نے کہا۔

اور بجیا پر میرا اعتماد سو فی صد درست ثابت ہوا۔

شب عروسی رونمائی کے موقع پر جب شیراز نے میرا گھونگھٹ سرکا کر میری ٹھوڑی تھامتے ہوئے میرا چہرہ اونچا کیا تو میری پلکوں پر لرزش طاری تھی اور دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ چند لمحے دبے پاؤں گزر گئے پھر میرے کانوں میں ایک آواز پڑی۔

"میں نے غلط تو نہ کہا تھا اس دن کہ آپ کا تعلق تو فردوس بریں سے لگتا ہے۔"

گھبرا کر میں نے پلکوں کی چلمنیں اٹھا دیں۔

اوہ!

یہ تو وہی تھا۔

وہی جو ایک روز چلچلاتی دھوپ میں اپنی کار میرے نزدیک روک کر بولا تھا "محترمہ! آپ کہاں جائیں گی؟"
اور میں نے جلتے بھنتے لہجے میں جواب دیا تھا "جہنم میں۔"
مگر اس وقت میں خود کو جنت میں موجود پا رہی تھی۔

جیسے بڑے شاہانہ انداز میں سجا ایئر کنڈیشنر سے یخ ہوتا ہوا کمرہ بلاشبہ چھوٹی سی جنت لگ رہا تھا اور یونیورسٹی گراؤنڈ سے بس اسٹاپ کو جانے والے راستے پر اچانک ہی آٹکرانے والا وہ نوجوان اس وقت شہزادوں کی سی وجاہت چہرے پر لیے زندگی کے ایک نئے راستے پر پہلا قدم اٹھانے کے لیے میری جانب ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا۔

پھر زندگی کسی البیلی دوشیزہ کی مانند اپنی پازیبیں چھنکاتی نئے راستوں پر چل پڑی۔ میں خوش تھی، بے پناہ خوش! میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ زندگی یک بیک اس قدر دل نواز اور اتنی مہربان ہو جائے گی کہ میں اپنے سارے دکھ قصۂ پارینہ کی صورت بھلا جاؤں گی۔ محرومیوں کا گڑھا پٹ جائے گا، روز و شب بدل جائیں گے... اور... اور... شیراز کی محبت کے سامنے بجیا کی چاہت ثانوی حیثیت اختیار کر جائے گی۔

شیراز مجھے اس قدر چاہتے تھے کہ میں خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت تصور کرتی تھی۔ روپیہ پیسہ، نوکر چاکر، آسائشیں، ایک چاہنے والا مرد جو میرا اپنا تھا۔ بلا شرکت غیرے میرا اپنا۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں جب ہم دونوں کو دیکھتیں تو رشک سے لبریز ہو جاتیں۔ اپنے حلقۂ احباب میں ہمارا جوڑا مثالی جوڑا کہلاتا۔ ہم دونوں اکٹھے جس محفل میں جاتے مرکز نگاہ بن جاتے۔ بقول بجیا کے ہماری جوڑی چاند سورج کی جوڑی تھی۔ شیراز واقعی وجیہہ و شکیل مرد تھے جہاں تک میرا تعلق تھا تو میں کسر نفسی سے کام لیے بغیر یہ کہوں گی کہ میں بھی حسین اور پرکشش تھی۔

تین چار برس تو سرور و کیف کے عالم میں گزر گئے پھر مجھے ایک خلا، ایک کمی کا احساس گاہے گاہے ستانے لگا۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس شدید سے شدید تر ہونے لگا۔ میرا زیادہ تر وقت یہ سوچتے ہوئے گزرنے لگا کہ اگر ہمارے گھر میں ایک دو اور پھر تین بچے قلقاریاں مارتے پھرنے لگیں تو زندگی اور حسین ہو جائے۔ تین بچے میں بہت کافی سمجھتی تھی۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ ہاں ایک بہن کے ناز اٹھانے کے لیے دو بھائی تو ہونے چاہئیں۔

پانچواں برس بھی بے ثمر گزر گیا تو مجھے فکر کے ساتھ کچھ وحشت سی بھی ہونے لگی اور میں گاہے گاہے اس وحشت اور فکر کا اظہار شیراز سے بھی کرنے لگی۔ شیراز میری پریشانی پر مسکرا دیتے اور اکثر کہتے "بھئی! ایسی جلدی بھی کیا ہے اچھا ہے... اچھا ہے جتنی دیر ہو کیونکہ پھر تم ہم پر توجہ کہاں دو گی۔"

"دیکھو رازی! یہ اچھی بات نہیں ہے کہ تم ہمارے بچوں کے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی ان سے جلنے لگے ہو" میں منہ بنا کر کہتی۔

"سوری میم" وہ مسکرانے لگتے۔

اور میں یہ سوچ کر کہ شیراز کتنے اچھے ہیں کس قدر محبت کرتے ہیں مجھ سے کہ میری خفگی خواہ بناوٹی سہی، فوراً مجھے مناتے ہیں بڑے جذباتی لہجے میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی کہ میری زندگی میں ان کا مقام اور ان کی اہمیت سدا یکساں رہے گی۔ وہ ہمیشہ میرے من مندر کے دیوتا رہیں گے۔ ان کی محبت کا پرچم سدا میری قلمرو کے دل پر لہراتا رہے گا۔

جب کبھی شیراز مجھے اس سلسلے میں زیادہ متفکر اور مغموم پاتے تو مجھے دلاسے دینے بیٹھ جاتے "بیبی! تم فکرمند کیوں ہوتی ہو۔ پانچ چھ برس کوئی غیر معمولی دیر تو نہیں۔ بعض بچے تو اتنے شوخ ہوتے ہیں کہ پندرہ پندرہ بیس بیس سال انتظار کرواتے ہیں اپنے والدین کو"

"خدا نہ کرے... خدا نہ کرے رازی..." میں دہل کے رہ جاتی "میں اتنا لمبا انتظار نہ کر سکوں گی۔ میں جھکنے سے پہلے اپنے بچوں کو جوان دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ لوگ مجھے میرے بچوں کی نانی یا دادی سمجھیں۔ میں چاہتی ہوں وہ فخر سے اپنے دوستوں کو بتائیں کہ یہ گریس فل جوڑا ان کے ممی اور پاپا ہیں"

"ڈونٹ وری بیبی... میں تو خیر ساٹھ برس کی عمر تک جوان رہنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور تم... تم ان عورتوں میں سے ہو جو سدا بہار رہتی ہیں"

شیراز کی اس بات پر مجھے بے اختیار اپنے کالج کی ایک لیکچرر جو ہمیں سیکنڈ ایئر میں اردو پڑھایا کرتی تھیں، یاد آنے لگتیں۔ انھوں نے ایک روز کلاس لینے کے بعد خوش گپی سی باتیں کرتے ہوئے نہ جانے کس بات پر کہا تھا۔

"عورت پر خزاں آتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ حالات کا ایک تھپیڑا اس سے رنگ روپ، جوانی سب کچھ چھین لے جاتا ہے"

ہماری شادی کی چھٹی سالگرہ کے چند دن بعد ہی بجیا بھی اس منزل سے ہمکنار ہو گئیں جسے وہ ہر لڑکی کی آخری اور سچی منزل کہا کرتی تھیں۔ کسی سیمینار میں ان کی ملاقات کینیڈا سے آئے ہوئے ایک پاکستانی نژاد پروفیسر سے ہوئی جو کینیڈا کی ایک یونیورسٹی سے بحیثیت ایک ریاضی دان وابستہ تھے۔ شادی خاصے غیر روایتی انداز میں ہوئی۔ قطعاً سادگی سے نکاح ہوا اور دولہا بھائی بجیا کو ان کی اس انیکسی سے جہاں وہ پے انگ گیسٹ کے طور پر رہا کرتی تھیں رخصت کر کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ایک کمرے میں لے گئے پھر وہاں سے وہ انھیں اپنے بھائی کے گھر لے گئے۔ چند روز بجیا کو اپنے جیٹھ کے ہاں رہنا تھا۔ دولہا بھائی نے کینیڈا جاتے ہی بجیا کو کینیڈا بلوانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس ضمن میں بجیا کو دو تین مرتبہ اسلام آباد بھی جانا پڑا اور بالآخر وہ کینیڈا سدھار گئیں۔ میں ان کے اتنی دور چلے جانے سے وقتی طور پر بے حد ملول ہوئی لیکن پھر اس طمانیت نے ملال کی جگہ لے لی کہ بجیا اس منزل سے ہمکنار ہو گئی تھیں جسے وہ ہر لڑکی کی آخری اور سچی منزل کہا کرتی تھیں۔

دعا اور دوا کے باوجود شادی کے ساتویں برس بھی اپنے آنگن میں کوئی پھول کھلنے کی امید نہ پا کر میں نے شہر کے ایک معروف مرد گائناکالوجسٹ ڈاکٹر بدریال سے رجوع کرنے کی خواہش کا اظہار شیراز کے سامنے کیا۔ حسب سابق انھوں نے مجھے بہلانے اور دلاسے دینے کی کوشش کی مگر اب میرے صبر و انتظار کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں کسی ضدی بچے کی طرح مچل گئی۔ ڈاکٹر بدریال کی میں نے بہت تعریف سن رکھی تھی۔ بظاہر لاعلاج نسوانی امراض میں مبتلا اپنے حلقۂ احباب میں دو دو سال ڈاکٹر صاحب کے زیر علاج رہنے کے بعد بالآخر ثمر پا چکے تھے۔ جب میں نے شیراز سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں بھی ڈاکٹر بدریال سے رجوع کرنا چاہتی ہوں تو پہلے تو انھوں نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن میرے انتہائی اصرار پر مجبور ہو کر وہ مجھے ڈاکٹر بدریال کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر بدریال نے ہماری روئیداد سنی پھر پرسکون مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

"آپ دونوں ہی کے ٹیسٹ لینے ہوں گے"

"دونوں کے؟" شیراز چونکے۔ ان کے لہجے میں حیرت اور استفہام کی ملی جلی کیفیت تھی۔

"جی ہاں...؟" ڈاکٹر بدریال مسکرائے پھر بولے "تولید کے عمل میں عورت اگر ایک فریق ہے تو مرد دوسرا۔ نقص کہیں بھی ہو سکتا ہے"

شیراز چپ رہے۔

پھر ڈاکٹر بدریال نے ہم دونوں کے لیے متعدد لیبارٹری ٹیسٹ اور ایکسریز تجویز کیے اور ہمیں ایک مقامی لیبارٹری سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا جہاں ایکسرے کا بھی معقول انتظام تھا۔ ہم دونوں ہی ڈاکٹر بدریال کی تجویز کردہ آزمائشوں سے گزرے۔

جس روز لیبارٹری سے رپورٹ ملنا تھی، مجھ پر ایک اضطراری کیفیت طاری تھی۔ شیراز کہہ گئے تھے کہ رپورٹ لینے کے لیے

دفتر سے گھر آتے ہوئے وہ لیبارٹری سے رپورٹس لیتے آئیں گے اور شام کو ہم ڈاکٹر بہرام کو یہ رپورٹس دکھانے ان کے کلینک جائیں گے۔ اس بچے کی طرح جس کا باپ اس سے کھلونا خرید کر لانے کا وعدہ کر کے گھر سے نکلا ہو، سارا دن میں بار بار گھڑی پر نگاہ ڈالتی اور میری نظریں اپنے گھر کے سامنے سے گزرتی ہر گاڑی کا تعاقب کرتیں، شیراز کی گاڑی کی تلاش میں دور تک نکل جاتیں لیکن دوپہر کو جب شیراز گھر لوٹے تو ان کے ہاتھ خالی تھے۔ میرے استفسار پر انھوں نے مجھے بتایا کہ جب وہ لیبارٹری پہنچے تو لنچ کا وقفہ ہو چکا تھا اور انچارج رپورٹس دینے والا عملہ موجود نہ تھا۔

" پھر اب کیا ہوگا؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

" ہوگا کیا... " شیراز مسکراتے ہوئے بولے " میں شام کو رپورٹس لیتا ہوا گھر آؤں گا پھر ہم ڈاکٹر بہرام کے پاس چلیں گے۔"

کھانا کھانے کے بعد جب شیراز واپس جانے لگے تو میں نے کہا " ڈارلنگ! کیا رپورٹس دکھانے کے لیے ڈاکٹر بہرام کے پاس جانا ضروری ہے؟"

" ناٹ ایٹ آل... " شیراز نے کہا پھر وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو میرے شانوں پر دھرتے ہوئے بولے " تم اتنی پریشان کیوں ہو؟"

" بس... ڈر لگ رہا ہے دل " میں نے دھیرے سے کہا۔

" کس بات سے؟"

" خدا نخواستہ اگر رپورٹ گڑبڑ ہوئی تو میں مر جاؤں گی " میں نے ان کے سینے سے اپنا سر لگا کر ان آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کی جو بے اختیار میری آنکھوں میں امڈ آئے تھے۔

" اوہ ڈونٹ بی فول " شیراز میری پیٹھ تھپتھپانے لگے پھر انھوں نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر مجھے وارفتہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا " مجھے بچے کی نہیں تمھاری ضرورت ہے "

" آپ خود ہو کے آئیے گا ڈاکٹر بہرام کے پاس " میں نے کہا۔

" او کے... او کے ڈارلنگ... " شیراز نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔

شام کو جب شیراز واپس لوٹے تو رپورٹس سمیت ایک لفافہ انھوں نے خاموشی سے اپنے بریف کیس سے نکال کر مایوسی سے میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے شیراز کے خاموش اداس چہرے کی طرف دیکھا اور ان سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی۔ ان کے چہرے کی سنجیدگی نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ پھر جب انھوں نے یہ کہا کہ " مجھے بچے کی نہیں تمھاری ضرورت ہے۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ تم ماں بننے کی اہلیت سے محروم ہو " تو میرا رہا سہا حوصلہ بھی اکھڑ کر منہ کے بل اوندھا گر پڑا۔

" اگر تم چاہو گی تو ہم کوئی بچہ اڈوپٹ کر لیں گے " شیراز نے دلاسا دینے کی کوشش کی۔

مگر مجھے تو اپنا بچہ چاہیے تھا۔

وہ بچہ جس نے میری ہی کوکھ سے جنم لیا ہوتا۔

میں تخلیق کے کرب سے گزر کر سرخرو ہونا چاہتی تھی۔

اس رات جب شیراز خواب گاہ کی بتیاں گل کرنے کے بعد بستر پر آ لیٹے تو میں نے بھرائی ہوئی آواز میں ان سے پوچھا " ڈاکٹر بہرام نے آپ سے کیا کہا؟"

" فارگیٹ اٹ ہنی... کیا یہ کافی نہیں کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں "

میرے دل پر بوجھ لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگا۔ میں کیسے بتاتی شیراز کو کہ رشتے کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں انھیں باہم جوڑنے کے لیے سیمنٹ اور بجری کی طرح ان کے درمیان فرد بچھانا پڑتی ہے تب ہی... تب ہی جنم لیتا سر سبز ملائم سی دھرتی کے سینے پر سے زم زمے کھل کر آسمان سے نظریں ملا سکتی ہیں... میں کیسے کہتی شیراز سے کہ اولاد عورت اور مرد کے بندھن کو تقویت اور استحکام بخشتی ہے... میں کیسے بتاتی انھیں کہ محبت کو بھی پائیداری کے لیے سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔

" کیا کوئی امید نہیں دلائی ڈاکٹر بہرام نے؟" میں نے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں پوچھا۔

شیراز نے کوئی جواب نہیں دیا۔

" پلیز بولو نا "

تاریکی مجھے حوصلہ دیے ہوئے تھی روشنی میں تو شاید میں شیراز سے آنکھیں بھی نہ ملا پاتی۔

شیراز نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کروٹ لے کر اپنا دایاں بازو سائبان کی صورت مجھ پر تانتے ہوئے بولے " نہیں "

لفظ نہیں کو سن کر میں سن ہو گئی پھر یک بیک پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ شیراز مجھے دلاسے دینے لگے اور اپنی محبت کا یقین دلانے لگے۔ مجھے قرار نہ آ رہا تھا۔ اس دلخراش انکشاف نے کہ میں ماں بننے کی اہلیت سے محروم ہوں میرے سینے میں آگ سی بھر دی تھی۔

اگلی صبح شیراز کے جانے کے بعد میں نے اس بڑے سفید لفافے کو کھولا جس میں لیبارٹری کے دو لفافے تھے جن میں سے ایک میں میری ایکسرے فلمیں اور عام سائز کے ایک لمبے لفافے میں لیبارٹری رپورٹ تھی اور دوسرے

نندو لفافے میں شیراز کا ایکسرے تھا اور لیبارٹری کی رپورٹ تھی۔
شیراز کی رپورٹ حوصلہ افزا تھی جبکہ میری بابت دی جانے
والی رپورٹ زبانِ حال سے بتا رہی تھی کہ
"تولیدی صلاحیت کے عنصر کی بدشگونیت کی
کسوٹی پر میں کھوٹی ثابت ہوئی تھی۔"
گیارہ بجے کے لگ بھگ میں نے ڈاکٹر ہیرلڈ سے
فون پہ بات کی اور امید کی کوئی ایسی قندیل تلاش کرنا چاہی جو
میری مایوسی میں کمی کا کام کر سکتی۔
ڈاکٹر ہیرلڈ نے کہا "مسز شیراز! میں نے آپ کی اور آپ
کے شوہر کی رپورٹس دیکھی ہیں اور مجھے یہ کہتے ہوئے انتہائی افسوس
محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کا کیس انتہائی پیچیدہ ہے۔"
"کوئی علاج کوئی تجویز ڈاکٹر... مجھے اپنی جان کی کوئی
پروا نہیں۔"
"آئی ایم سوری مسز شیراز! میرے پچیس سالہ پیشہ ورانہ دور میں
ایسے چند ہی کیس میرے سامنے آئے ہیں اور ہر کسی کو نا امید لوٹنا
پڑا، نہ اس کے لیے کچھ کر سکے۔"
میں فون پر رو دی۔
"مجھے افسوس ہے مسز شیراز کہ آپ کو دکھ پہنچا، اپنے پیشے کو
میں اسی لیے بے حد مقدس سمجھتا ہوں کہ ہم جھوٹی امید نہیں دلا سکتے۔ مجبوراً
میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں اور میں آپ کے لیے انتہائی
دکھ محسوس کر رہا ہوں۔"
اور
میں اپنے سینے میں رستے زخم کی آگ دہکتی محسوس کر رہی تھی۔

پھر احساسِ محرومی دھیرے دھیرے میری خوشیوں کو چاٹنے
لگا۔ میں ہر آنے والے دن پچھلے دن سے زیادہ ملول اور دل شکستہ
ہوتی چلی گئی۔ یہ احساس کہ میں شیراز کو کچھ نہ دے سکوں گی۔ مجھے
اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ شیراز کی وارفتگی اور چاہت مجھے سراب
لگنے لگی۔ مجھے یوں لگتا جیسے ایک دن جب ڈھونڈتے ڈھونڈتے
میں آخری حد پر جا پہنچوں گی تو یہ حقیقت عریاں ہو کر میرے
سامنے آ جائے گی کہ اس انکشاف کے بعد کہ میں ماں بننے
کی صلاحیت سے محروم ہوں، شیراز نے مجھ سے اپنی محبت
کو مصنوعی سہاروں پر زندہ رکھا ہوا تھا بالکل ایسے ہی جیسے بعض
ہسپتالوں میں مریضوں کو طبی طور پر مردہ قرار دیے جانے کے باوجود
ناگزیر وجوہات کی بنا پر مصنوعی طریقوں سے زندہ رکھا جاتا ہے۔
دھیرے دھیرے میرے اور شیراز کے مابین ایک سرد خلیج
حائل ہونے لگی۔ انتہائی جذباتی لمحوں میں بھی میں خود کو اس
سرد خلیج کے دوسرے کنارے پر شیراز سے دور بہت دور
کھڑا پاتی۔ ہماری ازدواجی زندگی کی خوشیاں ماند پڑنے لگیں۔
چاند سورج کی وہ جوڑی جو دیکھنے والی آنکھوں میں رشک و
ستائش کی لہریں برپا کر دیا کرتی تھی، گہنانے لگی۔ شیراز میری بدلتی
ہوئی روش اور گرم جوشی کی جگہ لینے والی سرد مہری پر پہلے حیران
ہوئے پھر شاکی اور بعد میں جھنجھلانے لگے۔
"تمھیں آخر کیا ہوتا جا رہا ہے؟" وہ جھنجھلا کر کہتے۔
کبھی میں چپ رہتی، کبھی ادھر ادھر ہو جاتی اور کبھی مری مری سی
آواز میں کہتی "کچھ بھی تو نہیں رازی۔"
"تم بدل گئی ہو۔" وہ شکوہ کرتے۔
"نہیں... نہیں تو رازی۔"
"کھوئی کھوئی سی رہنے لگی ہو تم۔"
"آں... نہیں... نہیں تو۔"
"میں تمھاری اس کیفیت کا سبب بھی جانتا ہوں۔"
میں سراسیمہ ہو کر ان کی جانب دیکھنے لگی۔ وہ بانہیں
وا کیے میری طرف بڑھ آتے۔
"ڈارلنگ! آئی لو یو... آئی لو یو... میں صرف تمھیں
چاہتا ہوں، نہ مجھے بچے کی پروا ہے نہ کسی اور چیز کی۔"
"اب تو لوگ بھی پوچھنے لگے ہیں رازی!"
"لوگوں کی تم پروا کیوں کرتی ہو۔"
"کیونکہ ہم ان سے کٹ کر نہیں رہ سکتے۔"
"لوگوں کی تمھیں پروا ہے اور مجھے نظر انداز کرنے لگی ہو۔"
ایک روز وہ شکوہ کر ہی بیٹھے۔
میں نے گھبرا کر ان کے منہ پر اپنا ہاتھ دھر دیا۔
"نہیں رازی... میں بھلا کر سکتی ہوں ایسا۔"
"پھر دور دور کیوں رہنے لگی ہو۔"
"مجھے ڈر لگتا ہے۔"
"ڈر! کیسا ڈر؟"
میں کیسے بتاتی انھیں کہ مجھے ڈر لگتا تھا اس وقت
سے جب میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے آخری حد پر جا پہنچوں گی
اور مجھے معلوم ہوگا کہ سب کچھ سراب تھا۔ مجھ سے اپنی محبت
کو انھوں نے مصنوعی سہاروں پر زندہ رکھا ہوا تھا۔
بہت دنوں تک میں اس دکھ کو تنہا ہی گھونٹ
گھونٹ پیتی رہی پھر ایک روز جب دل بہت بھر آیا تو
میں نے بجیا کو جلد روئیداد لکھ بھیجی۔ بجیا اس وقت تک
ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھیں۔ میری محرومی کا قصہ ان تک
پہنچا تو انھوں نے لکھا۔

"عینی! تم نے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر مجھے صدمہ پہنچا لیکن نا امیدی کفر ہے۔ نئی نئی تحقیقات نے لاولدوں کے لیے امید کے نئے دروازے کھول دیے ہیں۔ ڈاکٹر ہیرا جن کا تم نے اپنے خط میں تذکرہ کیا ہے یقیناً ایک لائق اور ماہر ڈاکٹر ہوں گے مگر یہاں کینیڈا میں ایک سے بڑھ کر ایک ماہر موجود ہے۔ تم اگر اپنی اور شیراز کی میڈیکل رپورٹس مجھے بھجوا سکو تو میں یہاں کسی ماہر ڈاکٹر سے مشورہ کروں گی۔ خدا کو منظور ہوا تو ضرور کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ میں تمھاری رپورٹس کی بے چینی سے منتظر ہوں۔ ہو سکے تو یہ رپورٹس کسی کے ساتھ دستی بھجوا دینا۔"

میں نے بجیا کا یہ خط شیراز کو دکھایا تو انھوں نے نیم دلی سے پڑھا۔۔۔ پڑھنے کے بعد جب انھوں نے خط مجھے لوٹایا تو میں نے کہا "شیراز! ہمیں بجیا کو فوری طور پر یہ رپورٹس بھجوا دینا چاہئیں۔"

شیراز نے تیوری چڑھا کر میری طرف دیکھا مگر میں جو بجیا کے اس خط کو امید کی نئی کرن سمجھ رہی تھی شیراز کے تیوروں پر زیادہ توجہ دیے بنا جوش کے عالم میں بولی "ہو سکتا ہے اداری کوئی راستہ نکل آئے۔ مغرب میں تو میڈیکل سائنس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔"

"ڈاکٹر ہیرا بھی فارن سے میڈیکل ڈگری یافتہ ہیں۔ کئی برس انگلستان میں پریکٹس کرتے رہے ہیں اور اب بھی گاہے گاہے باہر آتے جاتے رہتے ہیں۔ کیا میڈیکل سائنس کی نئی دریافتیں ان کے علم میں نہ ہوں گی۔ میں نے خود ان سے پوچھا تھا کہ کیا بیرون ملک اس کیس کا کوئی علاج ممکن ہے مگر انھوں نے کوئی امید نہیں دلائی۔"

میرا دل بجھنے لگا لیکن امید کا ایک جھونکا پا کر لو بھڑک اٹھی تھی۔

"کیا حرج ہے اگر ہم بجیا کو رپورٹس بھجوا دیں۔" میں نے شیراز سے کہا۔

"نہیں۔۔۔ کوئی ضرورت نہیں۔" شیراز کے لہجے میں ایک اٹل کیفیت تھی۔

"آخر حرج کیا ہے؟"

"بس میں نے کہہ جو دیا نہیں۔" شیراز ناگواری سے بولے۔

میں نے چونک کر شیراز کی جانب دیکھا۔ اس سے پہلے انھوں نے کبھی مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی وہ تو میرا دم بھرا کرتے تھے، میرا دل بہلایا کرتے تھے، مجھے تسلیاں اور دلاسے دیتے تھے۔

"آخر کیوں نہیں؟" میں نے بھی تندی سے پوچھا۔

شیراز نے زہرخند نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولے "دیکھو میں نہیں چاہتا کہ تم اپنی محرومی کا اشتہار دیتی پھرو۔ تم میری بیوی ہو جب میں اولاد سے محرومی کا صدمہ چپ چاپ برداشت کر سکتا ہوں تو تم کیوں نہیں کر سکتیں۔"

میرا جی بھر آیا اور آنکھیں بھی۔

"میں عورت ہوں شیراز۔۔۔ بہت کمزور اور بے بس۔ تمھارے جتنا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔۔۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ جب میں کسی ماں کے سینے سے اس کا بچہ چمٹا ہوا دیکھتی ہوں تو میرے دل پر کیا گزرتی ہے۔ میں لمحہ لمحہ جلتی رہتی ہوں۔ میرے سینے میں آگ سی بھر جاتی ہے۔"

"بہرحال تمھیں یہ صدمہ چپ چاپ سہنا ہوگا۔" شیراز میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کچھ نرم پڑ گئے تھے۔

"چپ چاپ ہی تو سہہ رہی ہوں۔۔۔ لیکن امید کی کسی کرن سے نظریں چرانا میرے اختیار میں نہیں۔ بجیا نے رپورٹس منگوائی ہیں۔ میں انھیں ضرور بھیجوں گی خواہ تم چاہو یا نہ چاہو۔"

"تم نہیں بھجواؤ گی انھیں وہ رپورٹس۔" شیراز بھڑک گئے۔

"بجیا میری ہمدرد ہیں۔"

"اور میں دشمن ہوں تمھارا؟" وہ آنکھیں نکال کر بولے۔

"یہ میں نے کب کہا۔"

"بعض باتیں کہے بنا ہی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ بجیا کو تم اپنا ہمدرد سمجھتی ہو اور مجھے۔۔۔ جہنم میں جائیں تمھاری بجیا اور تم بھی۔" شیراز چلائے۔

میں نے خوفزدہ ہو کر شیراز کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ "کیا میں اس آخری سرے پر پہنچ چکی ہوں۔"

اگلے روز میں نے شیراز کی ناراضگی کی پروا نہ کرتے ہوئے لیبارٹری رپورٹس بجیا کو بذریعہ ڈاک ارسال کر دیں۔ دستی طور پر کسی کے ہاتھ بھجوانے کی امید میں وقت ضائع کرنا عقلمندی نہ ہوتی۔

شیراز دو تین روز خفا خفا سے رہے پھر میں نے انھیں منا لیا۔ یہ میرا فرض بھی تھا اور مجبوری بھی۔ شیراز اگر مجھ سے محبت کرتے تھے تو میں ان سے عشق کرتی تھی۔ خفا ہونا شیراز کا حق بنتا تھا۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ میں گزشتہ چند ماہ سے ذہنی گرداب میں الجھی ہوئی تھی اور وہ بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ میرے اعصابی تناؤ اور ذہنی ہیجان کو برداشت کر رہے تھے۔

اس روز انھوں نے بڑے پیار سے کہا "عینی! کیا تم یہ خیال اپنے ذہن سے نکال کر نہیں پھینک سکتیں؟"

"کون سا خیال؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

دیں کہ تمہیں اپنا بچہ چاہیے۔ ہم کوئی بچہ اڈوپٹ کر لیتے ہیں۔ کل میں نے کاشانہ فون کیا تھا اور اس کی انچارج سے بات کی تھی۔ بے اولاد جوڑے مناسب ضمانت کے بعد وہاں سے بچے حاصل کر سکتے ہیں۔"

"نہیں راضی" میں نے جواب دیا۔

"اس میں قباحت کیا ہے؟"

"میں نے بجیا کو پوزیشن سمجھا دی ہے۔ ان کا جواب آنے دو۔"

"کیا... ؟" شیراز کے چہرے کا رنگ، آنکھوں کا انداز اور تاثرات یکدم بدل گئے۔ "تم نے میری مرضی کے خلاف کیا نا؟"

وہ اکڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔

میں آخری حد پہ پہنچ چکی تھی۔

سراب نظر حقیقت بن کر میرے سامنے آچکا تھا۔

"قرۃ العین بیگم میں شیراز احمد تمہاری اس نافرمانی پر بقیدِ ہوش و حواس تمہیں طلاق دیتا ہوں۔" شیراز دہاڑے۔

میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"میں تمہیں طلاق دیتا ہوں......"

میں متوحش ہو کر ان کی طرف بڑھی۔

"میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔"

مجھے یوں لگا جیسے میں تاریکیوں کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتی چلی جا رہی ہوں۔

پھر چہار سُو اندھیرا چھا گیا اور چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

گو خدشات اور اندیشے کافی دنوں سے میرا پیچھا کر رہے تھے اور مجھے سہما رہے تھے لیکن میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں آناً فاناً سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ شیراز اپنی زبان سے ایک جملے کی تین مرتبہ گردان کر کے مجھ سے اپنی محبت کے دعووں پر یک بیک خطِ تنسیخ کھینچ دیں گے اور میں کارزارِ حیات میں تنہا، بے کس و بے بس، افسردہ اور رنجور کھڑی رہ جاؤں گی۔

وہ گھر جسے میں فخر سے اپنا گھر کہا کرتی تھی اس گھر میں میرے لیے کوئی جگہ نہ رہی تھی۔ اس گھر کے در و بام میری تیرہ بختی پر ہونٹ نکالے رو رہے تھے۔ شدتِ غم سے میرا انگ انگ لرز رہا تھا اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ خود اپنے گھر کے دروازے اپنے اوپر بند ہو جانے کے بعد میں کہاں پناہ پا سکوں گی۔

وہی اینکسی جہاں کبھی بجیا رہا کرتی تھیں، میری جائے پناہ ٹھہری۔

مسز ہمدانی بجیا کے کالج کی ساتھی ہوا کرتی تھیں مگر بجیا کی شادی اور ان کے کینیڈا چلے جانے کے بعد مسز ہمدانی سے وہ مستقل تعلق قائم نہ رہا تھا مگر کبھی کبھار فون پہ بات ہو جایا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ بجیا نے کینیڈا سے پاکستان آنے والے اپنے کسی آشنا کے توسط سے مسز ہمدانی اور ان کے بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی چند سوغاتیں بھی بھجوائی تھیں جنھیں مسز ہمدانی تک پہنچانے کے سلسلے میں شیراز کے ساتھ ان کے گھر بھی گئی تھی۔ جواباً مسز ہمدانی بھی دو مرتبہ ہمارے ہاں آئی تھیں۔ یوں بجیا کے حوالے سے مسز ہمدانی سے میرا تعلق ہنوز قائم تھا۔ علاوہ ازیں مسز ہمدانی میل میلاپ رکھنے والی ایک ہمدرد طبع خاتون تھیں۔ ہم دونوں بہنوں کی ذاتی زندگی کے اس المیے سے کہ اتنا عرصہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے بچے نہ تھے وہ بخوبی آگاہ تھیں۔ میری شادی کے موقع پر انھوں نے بجیا کو نہ صرف صلاح مشورے دیے تھے بلکہ ان کا بہنوں کی طرح ہاتھ بٹایا تھا۔ ہمدانی صاحب نکاح کے موقع پر ہماری جانب سے گواہ تھے۔ بجیا کی شادی اور ان کے کینیڈا چلے جانے کے بعد مسز ہمدانی سے میرا وہ پہلا سا تعلق تو قائم نہ رہا تھا مگر اسی سابقہ تعلق کے بل بوتے پر میں اپنے گھر کے دروازے بند پا کر ان کے دروازے پہ دستک دینے کی جرأت کر سکتی تھی۔

مسز ہمدانی کو میں نے ساری روداد سنانا مناسب نہ سمجھی بس اتنا کہا کہ ایک معمولی سی بات پر اختلافِ رائے نے ہمارے درمیان کبھی نہ پٹ سکنے والی ایک خلیج حائل کر دی ہے۔ مگر مسز ہمدانی جہاندیدہ خاتون تھیں معاملے کی نوعیت کو بڑی حد تک سمجھ گئیں اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولیں۔

"بی بی! اسی لیے تو بڑی بوڑھیاں شادی کے دوسرے برس بھی بہو بیٹیوں کی گود نہ بھرنے پر متفکر ہو جایا کرتی ہیں۔"

میرے دل کا لہو آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت بہنے لگا۔

"تم گھبراؤ مت۔ میں تمہارے میاں سے خود بات کروں گی۔" مسز ہمدانی نے میرے سر پر بڑی بہن کی طرح ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اب کوئی فائدہ نہیں آپا۔" میں نے کپکپاتی ہوئی

آواز میں کہا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ وہ مجھے طلاق دے چکے ہیں۔" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

مسز ہمدانی نے چونک کر قدرے بے یقینی سے میری طرف دیکھا پھر بولیں "زبانی یا تحریری؟"

"زبانی۔"

"رجعی یا... ؟"

میں نے آنکھیں رومال سے خشک کیں اور مسز ہمدانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"مطلب یہ کہ ایک یا دو طلاقوں کی صورت میں واپسی کا دروازہ کھلا رہ جاتا ہے لیکن تین طلاقوں کی صورت میں واپسی کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔"

"آپا! انھوں نے یک لخت سارے راستے سارے دروازے بند کر دیے ہیں۔" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دکھ کے دباؤ سے میرے حلق کی ساری رگیں پھٹ جائیں گی۔

مسز ہمدانی میرے نزدیک آ بیٹھیں اور مجھے تسلی دینے لگیں۔

"تم فکر نہ کرو، میں آج ہی... نورالعین کو سب کچھ لکھے دیتی ہوں۔"

"نہیں آپا..." میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے ملتجی لہجے میں کہا "بجیا کو آپ ہرگز کچھ مت لکھیے گا۔ انھیں دکھ ہوگا۔"

"تو کیا تم تنہا یہ صدمہ سہو گی۔" مسز ہمدانی بولیں۔

میری آنکھوں میں پھر آنسو امڈ آئے۔

"عورت ذات بہت کمزور، بڑی بے بس ہوتی ہے بی بی۔"

"ہاں آپا! مجھے اس کا اندازہ ہے مگر مقدر میں جو آزمائش لکھی ہو، اس سے مفر بھی تو ممکن نہیں۔"

"پھر اب کیا کرو گی؟"

اس سوال کا جواب دینے کے بجائے میں نے مسز ہمدانی سے خود ایک سوال کر ڈالا۔

"آپا! کیا آپ مجھے اپنے گھر میں پناہ دے سکیں گی؟"

"بی بی! اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔ تمھیں اور نور کو میں بہنوں کی طرح سمجھتی ہوں اور جب سے میرے میاں ڈیپوٹیشن پر سعودی عرب گئے ہیں، تب سے تو یہ اتنا بڑا گھر مجھے بہت خالی خالی سا لگنے لگا ہے مگر ایک بات ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میں نور کو ضرور لکھوں گی۔"

"ابھی نہیں... ابھی نہیں آپا... ذرا مجھ میں حوصلہ آ جائے۔ عادت پڑ جائے اس قسم کی چیزیں، خود لکھوں گی بجیا کو۔" میں نے لجاجت سے کہا۔

"بی بی! برے دنوں میں کہیں جا کے تم اس صدمے کی عادی ہو پاؤ گی۔ مجھے اگر پتا نہ چلتا تو کوئی بات نہ تھی لیکن اب جبکہ میں حقیقت حال سے باخبر ہو چکی ہوں، نور کو فوری طور پر مطلع کرنا میرا فرض بنتا ہے ورنہ بعد کو وہ شکوہ کرے گی کہ میں نے اسے فوراً ہی اطلاع کیوں نہ کی۔"

"آپا..." میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا۔ اب بجیا کو فوراً مطلع کیا جائے یا تاخیر سے کیا فرق پڑ جائے گا۔"

"ہاں اگر شیراز نے تین طلاقیں دے دی ہیں تب تو اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا مگر پھر بھی نور کو اطلاع کرنا ضروری ہے۔" مسز ہمدانی اپنے موقف پر ڈٹی رہیں۔

"آپا! تھوڑی سی مہلت دیجیے مجھے تاکہ بجیا کو تفصیل سے سب کچھ لکھ سکوں۔"

"آج ہی لکھ دو نا۔"

"آج... آج تو اگر میں لکھنے بھی بیٹھی تو نہ انگلیاں ساتھ دیں گی نہ ذہن۔" میری آنکھیں پھر بھر آئیں۔

"اچھا ٹھیک ہے جیسی تمھاری مرضی۔" مسز ہمدانی نے مجھے ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپا..." میں نے سر جھکا کر کہا "مجھے آپ اپنی انیکسی میں رہنے کی اجازت دے دیں گی نا؟"

"انیکسی میں کیوں، تم ہمارے ساتھ رہو۔"

"نہیں آپا ایک دو روز کی بات تو نہیں، اب تو مجھے انڈیپنڈنٹ زندگی گزارنا ہے۔ جس طرح آپ نے بجیا کو انیکسی دے رکھی تھی اسی طور اب مجھے دے دیں۔"

میری مراد یہ تھی کہ میں پے انگ گیسٹ کے طور پر انیکسی میں رہوں گی۔

"بی بی! نور کی بات اور تھی۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی تھی۔ خود کفیل تھی۔" مسز ہمدانی میری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بولیں۔

"فی الحال تو میرے پاس ان زیورات کے سوا اور کوئی

اثاثہ نہیں جو بجیا نے مجھے جہیز میں دیے تھے مگر میں کوشش کروں گی کہ جلد ہی کوئی چھوٹی موٹی ملازمت تلاش کر سکوں۔۔۔ کاش! میری تعلیم ادھوری نہ رہ گئی ہوتی۔"

"تم دل چھوٹا مت کرو۔" مسز ہمدانی نے تسلی دی پھر بولیں۔ "اب جتنی جلدی ہو سکے بہن کو سارے حالات تفصیل سے لکھنے کی ہمت پیدا کرو اپنے آپ میں۔"

پھر مسز ہمدانی نے میری خواہش کے مطابق انیکسی میرے لیے کھلوا دی۔ اس انیکسی میں داخل ہوتے وقت میرے دل کی عجیب حالت تھی۔ بجیا مجھے بری طرح یاد آ رہی تھیں۔ کبھی ان دیواروں کے بیچ ہم دونوں بہنیں ایک دوسرے سے اپنے دل کی کہتے سنتے تھے، ایک دوسرے کے دل کا درد بانٹنے کی کوشش کیا کرتے تھے مگر آج میں دکھ کے الاؤ میں تنہا جل رہی تھی۔ بجیا مجھ سے ہزاروں میل دور بیٹھی تھیں۔

دو تین دن خاموش اور سوگوار سے گزر گئے۔ پھر ایک روز مسز ہمدانی نے مجھ سے دبی زبان میں پوچھا۔ "تم نے مہر کا تقاضا کیا تھا؟"

میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا پھر سر جھکا کر کہا۔ "جی نہیں۔"

"مطالبہ کرو گی تو سہی کیونکہ یہ تو تمہارا حق بنتا ہے۔"

"پتا نہیں۔۔۔" میں نے آنسو پینے کی کوشش کی اور رقت کے عالم میں کہا۔ "آپا! اب تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا کچھ بھی حق نہ تھا شاہ میر پر اس شخص پر۔ ورنہ آن کی آن اس نے مجھے اپنی زندگی سے یوں نہ نکال پھینکا ہوتا۔ اس نے تو مجھے بالکل تہی دامن اور بے بس کر دیا۔ محرومی کا احساس مجھے سانپ کی طرح ڈسے لیتا ہے۔"

"تمہارے شرعی حق سے تو وہ تمہیں ہرگز محروم نہیں کر سکے گا۔۔۔ یاد نہیں رہا کتنا مقرر ہوا تھا مہر؟"

میں چپ رہی۔

مگر مسز ہمدانی کے دوبارہ پوچھنے پر مجھے بتانا پڑا۔

"سوا لاکھ روپے۔"

"تم کہو تو میں فون کروں شیراز کو اس سلسلے میں؟"

"نہیں آپا! رہنے دیں۔"

"کیوں؟"

"میں اپنے اس شرعی حق سے دستبردار ہوتی ہوں۔"

"ارے! ایسی حماقت بھی نہ کرنا۔ جس شخص نے تمہارا خیال نہ کیا، تمہاری زندگی برباد کر دی اس کا خیال کیوں؟ اس کا خیال!"

میرے دل نے کہا۔ "اس کا خیال تو دبے پاؤں ساری زندگی ساتھ چلے گا اور اب اسی ایک خیال کے سہارے تو بقیہ زندگی کٹے گی۔"

حقیقت یہ تھی کہ شیراز کی اس ناقابلِ معافی زیادتی کے باوجود شیراز کا خیال میں اپنے دل سے نہ نکال پا رہی تھی۔ جن سے محبت کی جاتی ہے دل ان کا مسکن ہوتا ہے اور اس مسکن سے ان کے خیال کو بے دخل کر دینا کار آسان تو نہیں ہوتا۔ پھر میں شیراز کے خیال کو اپنے دل سے کیوں کر نکال سکتی تھی۔

"بولو کہو تو میں فون کروں شیراز کو؟" مسز ہمدانی نے پھر سوالیہ انداز میں کہا۔

"نہیں آپا رہنے دیں۔"

"تم نے اب تک خط بھی نہیں لکھا نور کو۔"

"لکھوں گی، دو چار روز میں لکھوں گی۔" میں نے انھیں اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

"اور یہ کیا۔۔۔ سارا سارا دن تم انیکسی میں بند پڑی رہتی ہو۔۔۔ باہر بھی نکلا کرو۔"

"باہر نکلنے کی سوچ تو رہی ہوں۔"

"ابھی سوچ ہی رہی ہو۔" مسز ہمدانی نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں۔۔۔ فیصلہ کر لیا ہے۔"

"اچھا۔" مسز ہمدانی کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔

"آپا! کیا آپ مجھے چھوٹی موٹی کوئی نوکری دلوا سکتی ہیں؟" میں نے مسز ہمدانی سے کہا۔

"کیا نوکری کرو گی تم؟"

"جی ہاں۔"

"اور نور سے لعنت ملامت پڑواؤ گی مجھ پر۔ جانتی ہو وہ میری جان کو آ جائے گی۔ شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ وہ تم سے کس قدر محبت کرتی ہے اور مجھ پر اسے کتنا مان ہے۔"

"مجھے بخوبی اندازہ ہے آپا۔"

"تب ہی اس سے صلاح مشورہ کیے بغیر ملازمت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"آپا! زندگی گزارنے کا کوئی بہانہ تو چاہیے۔"

"سیدھا سیدھا ایک کام کرو۔"

"وہ کیا؟"

"نور کو تفصیل سے لکھ دو۔ یا تو وہ خود آ جائے گی حالات کا جائزہ لینے یا تمہیں اسپانسر کر کے وہاں بلا لے گی مگر شیراز سے مہر ضرور وصول کر کے جانا۔"

"فی الحال تو آپ کوئی نوکری دلوا دیں مجھے۔"

"ہرگز نہیں۔"

"پلیز۔" میں خوشامد پر اتر آئی اور میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"بی بی! جو راستہ میں بتا رہی ہوں وہ اختیار کرو۔ باہر نکلو گی تو بڑی مشکلیں ہیں۔"

"جس مشکل سے زندگی نے مجھے دوچار کر دیا ہے کیا اس سے بڑی مشکل بھی کوئی ہو سکتی ہے۔" میں نے رنجور ہوتے ہوئے کہا۔

"سو سو طرح کے سوال کرتے ہیں لوگ طلاق یافتہ خواتین سے اور عجیب عجیب قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔"

"آپا! آپ تو تعلیم یافتہ، باشعور اور ملازمت پیشہ خاتون ہیں سو آپ ہی حوصلہ شکنی کر رہی ہیں میری۔"

"باہر نکلتی ہوں۔ باہر کے حالات سے واقف ہوں تب ہی تو تمھیں بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ہم ایک ترقی پذیر ملک کے قدامت پسند معاشرے میں سانس لینے والی عورتیں ہیں بی بی... لوگوں کی نگاہیں جب چاہتی ہیں حلقۂ حیات تنگ کر دیتی ہیں ہم پر... معاف کرنا تم جیسی حسین و جمیل، دلکش اور جوان سال عورت جب طلاق کا ٹیکا اپنی پیشانی پر لگا کر باہر نکلے گی تو جو جس کے جی میں آئے گا کہے گا۔"

میں نے ایک سرد آہ کھینچنے کے بعد کہا: "آپا! مجھ جیسی بہت سی عورتیں یہ عذاب سہہ رہی ہیں۔ میں بھی سہوں گی۔ مجھ میں اتنا حوصلہ ہے آپا۔"

"بی بی! میں نے جو کچھ کہا ہے تنگ نظری کی بنا پر نہیں اپنے طویل تجربے کی بنا پر کہا ہے۔ تم سوچ لو۔" مسز ہمدانی بولیں۔

"سوچ لیا ہے آپا اور اب مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

مسز ہمدانی نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے اثبات میں یوں سر ہلایا جیسے کہتی ہوں: "ٹھیک ہے میں تمھاری مدد کروں گی۔"

اور

واقعی انھوں نے میری مدد کی بھی۔

مسز ہمدانی کے ایک عزیز ملک بھر میں واقع ایک تشہیری ادارے کے مالک تھے۔ مسز ہمدانی نے میری ملازمت کے ضمن میں انھی سے محض اس خیال سے بات کی کہ اپنے وسیع اثر و رسوخ سے وہ مجھے کہیں نہ کہیں ملازمت دلوا ہی دیں گے۔ خوش قسمتی سے ان دنوں خود ان کے اپنے ادارے کے کلائنٹ سروس ڈپارٹمنٹ کے لیے ایک خوش شکل، خوش لباس، روانی سے انگریزی بولنے کی اہلیت رکھنے والی، نوجوان خاتون کی ضرورت تھی جو کلائنٹس کو بہترین خدمت کا یقین دلا سکتی۔ میں محض خوش شکل ہی نہیں، خوبصورت تھی، خوش لباس تھی، فرفر انگریزی بول سکتی تھی اور شاید گفتگو کا سلیقہ بھی رکھتی تھی۔ مسز ہمدانی کے توسط سے ہونے والی پہلی ہی ملاقات میں مینیجنگ ڈائریکٹر عسکری صاحب نے جو مسز ہمدانی کے عزیز ہوتے تھے، مجھے پروانۂ تقرری تھما دیا۔ نہ مجھے درخواست دینے کی ضرورت ہوئی نہ تعلیمی اسناد پیش کرنے کی۔ ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی کیونکہ میری تعلیمی اسناد تو اس گھر میں رہ گئی تھیں جس سے میرا ناتا ٹوٹ چکا تھا۔

ملازمت ملنے سے میرے دل کو بڑی ڈھارس ہوئی۔ بے یقینی کے خوفناک حصار سے نکل کر میں یقین، خود اعتمادی اور خود کفالت کے راستے پر قدم رکھ چکی تھی۔ دل بھی کس حد تک اس صدمۂ گراں کا عادی ہو چکا تھا۔ اوسان بحال ہونے کے بعد میں نے بجیا کو خط لکھا مگر اس المیے کی اطلاع دینے کے بجائے میں نے انھیں لکھا کہ زندگی کی یکسانیت سے اکتا کر میں نے ملازمت کر لی ہے اور اب دن کا بڑا حصہ میں دفتر ہی میں گزارتی ہوں لہٰذا بہتر ہو گا اگر وہ مجھے میرے دفتر کے پتے پر خط لکھیں۔ بجیا کو یہ خط ارسال کرنے سے قبل میں نے مسز ہمدانی کو بھی اس خط کا مضمون پڑھ لیا۔

"یہ کیا لکھ دیا تم نے؟" مسز ہمدانی خط پڑھنے کے دوران بولیں۔

"آپ پورا خط پڑھ تو لیں۔" میں نے کہا۔

خط کی آخری سطر پڑھنے تک مسز ہمدانی کا چہرہ متغیر کیفیات کا آئینہ دار نظر آیا۔ خط پڑھنے کے بعد مجھے خط لوٹاتے ہوئے انھوں نے تیز معنی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کہا: "حقیقت کیوں چھپانا چاہتی ہو تم نور سے؟"

"آپا! حقیقت سے آگاہ ہو کر وہ بہت ملول ہوں گی اور یہ میں نہیں چاہتی کیونکہ جو میرے مقدر میں لکھا تھا، وہ تو ہو چکا۔" میں نے آزردہ ہوتے ہوئے کہا۔

"کب تک چھپا سکو گی تم یہ بات نور سے؟" مسز ہمدانی بولیں۔

"جب تک ممکن ہو سکے گا۔"

"اس کا مطلب ہے، مجھے خود لکھنا پڑے گا نور کو۔"

"پلیز! ایسا نہ کیجیے گا۔" میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔

بجیا کو اس المیے کی روداد سے لاعلم رکھنے کا صرف ایک سبب تھا اور وہ یہ کہ میں بجیا کو اپنی جانب سے دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ابو کی دوسری شادی کے بعد بجیا نے کافی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ اب کچھ سکھ ملا تھا انھیں اور میں نہیں چاہتی تھی کہ اب انھیں کوئی دکھ پہنچے۔

میری منت سماجت نے مسز ہمدانی کو بجیا کو میری ازدواجی زندگی کی ناکامی کی بابت کچھ لکھنے سے باز رکھا اور میں

پر تعینات نوجوان اور ہنس مکھ کیتھرین سے تو میرے دوستانہ مراسم استوار ہو چکے تھے۔ عسکری صاحب کے احترام سے قطع نظر مردوں میں میری دوستی کریٹیو ڈپارٹمنٹ کے بلال مصطفیٰ سے ہو سکی اور وہ بھی محض اس لیے کہ مجھے دیکھ کر نہ تو اس کے لبوں پر کوئی معنی خیز مسکراہٹ آوارہ گردی کرنے کو نکل آتی تھی نہ اس کی نگاہوں میں ستائش ابھرتا تھا اور نہ ہی وہ مجھے دیکھ کر دوسروں سے سرگوشیوں میں مصروف ہونے کی کوشش کرتا تھا۔

بلال مصطفیٰ بلحاظِ عمر اگرچہ مجھ سے بڑا نہ تھا تو چھوٹا بھی نہ تھا مگر سنجیدگی اور متانت کے لحاظ سے وہ اپنی عمر کے مردوں سے خاصا ممتاز نظر آتا تھا۔ وہ الفا کے کریٹیو ڈپارٹمنٹ سے بحیثیت کمرشل آرٹسٹ منسلک تھا۔ دفتر کے اوقاتِ کار صبح نو تا سہ پہر پانچ تھے لیکن بلال دوپہر بارہ بجے کے بعد آتا اور چار بجے واپس چلا جاتا۔ یوں اس کی ملازمت جز وقتی کہی جا سکتی تھی اگرچہ معاوضہ خاصا معقول ملتا تھا۔ اس پر عسکری صاحب کی یہ مرحمت اس لیے تھی کہ وہ غضب کا آرٹسٹ تھا اور شہر بلکہ ملک کے معروف ترین مصور سجاد منصور کا چہیتا شاگرد تھا۔ الفا سے جز وقتی وابستگی کے علاوہ وہ آرڈر پر بھی تصویریں بنایا کرتا تھا خصوصاً پورٹریٹ بنانے میں وہ بلا کا کمال رکھتا تھا۔ میں شروع شروع میں اسے عام سا آرٹسٹ سمجھا کرتی تھی مگر دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے جوہر کچھ ادارے کے مختلف لوگوں کی زبانی اور کچھ اس کی فنکارانہ مہارت دیکھ کر مجھ پر کھلتے چلے گئے۔ رہی سہی کسر میری ملازمت کے چوتھے ماہ کے دوران آرٹس کونسل میں ہونے والی بلال مصطفیٰ کی تصاویر کی نمائش نے پوری کر دی۔ وہ اگر بے مثل نہیں تو برش اور رنگوں پر کامل فنکارانہ قدرت رکھنے والا ایک فنکار ضرور تھا۔

میں اگرچہ مصور تو نہ تھی مگر رنگوں کی زبان سمجھتی تھی۔ خطوط و دائروں کی نفاست کو سراہنے کا ذوق رکھتی تھی۔ مختصر الفاظ میں میری جمالیاتی حس مردہ نہ تھی۔ میں حسن سے خواہ وہ اشیا میں ہو یا انسانوں میں پیار کرتی تھی اور انھیں عزیز رکھتی تھی۔ اچھی چیز کو ایک بار دیکھ کر میں اسے ہمیشہ یاد رکھتی۔ شاید اسی لیے میں شیراز سے ناتا ٹوٹ جانے اور ان کی زندگی سے نکل آنے کے باوجود انھیں اب تک یاد رکھے ہوئے تھی۔

مسز ہمدانی کی انیکسی میں رات گئے تک بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے میں اکثر اپنے آپ سے پوچھتی: کیا میں اس جفاجو، بے مروت کو بھلا پاؤں گی؟

اس سوال کے جواب میں میرے دل سے صرف ایک صدا آتی۔

"کبھی نہیں۔"

بڑی عجیب بات تھی کہ شیراز سے ناتا ٹوٹ جانے کے باوجود میں شیراز کے خیال کو اپنے دل سے بے دخل نہ کر پائی تھی اور نہ ایسا ہو سکنے کے کوئی امکانات نظر آتے تھے۔ بلکہ جب شیراز کا خیال میرے دل کو تڑپانے لگتا اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے سنہری دنوں اور روپہلی راتوں کی یادیں مجھے مجبور کرنے لگتیں تو میں خود اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے بیٹھ جاتی۔ میں سوچتی غلطی میری ہی تھی جو میں نے شیراز کی مرضی کے خلاف اپنی اور شیراز کی میڈیکل رپورٹس بھیا کو بھیجی جنھیں شیراز نادانی سے تعبیر کرتے اور نہ یوں بیدردی سے مجھے اپنی زندگی سے نکال پھینکتے۔ میں کتنی احمق اور عاقبت نااندیش تھی کہ بھیا کو ان کی مرضی کے خلاف رپورٹس ارسال کرتے وقت یہ بھول گئی تھی کہ ازدواجی زندگی ایک ایسی بازی ہوتی ہے جس میں ترپ کی چالیں ہمیشہ مرد کے حق میں محفوظ رہتی ہیں۔ شیراز سے جدا ہو کر میں انتہائی دل گرفتہ اور مجبور تھی۔ میری بدقسمتی نے مجھے ان سے دور کر دیا تھا۔ میں جو شیراز کے ساتھ زندگی کے ایک دھنک رنگ بندھن میں بندھ جانے کے بعد ایک دن بھی ان سے دور نہ رہی تھی اب مجھے ان سے جدا ہوئے چھ ماہ ہونے کو آ گئے تھے۔

اس روز جب میں دفتر سے گھر لوٹی تو مسز ہمدانی نے مجھے ایک ایسی خبر سنائی جس نے میرا دل بالکل تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ شیراز نے سلطان کے گھر کے نمبر پر کچھ دیر قبل ہی فون کیا تھا۔

"کیا کہہ رہے تھے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"رسمی علیک سلیک کی اور تم سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا میں نے بتا دیا کہ وہ تو جاب کر رہی ہے۔ چھ ساڑھے چھ بجے تک واپس ہوتی ہے۔"

"حیران ہوئے ہوں گے یہ سن کر تو؟"

"ہاں بی بی! حیران تو تب ہوتے کہ جب انھیں یہ بات پہلے سے معلوم نہ ہوتی۔"

"انھیں کیسے معلوم؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"میں نے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر بی بی! یہ مرد! مرد بڑے گھاگ ہوتے ہیں۔"

"انھیں یہ کیسے پتا چلا کہ میں یہاں آپ کے ساتھ رہ رہی ہوں؟" میں نے تذبذب کے عالم میں کہا۔

"بہت بھولی ہو۔" مسز ہمدانی مسکرا گئیں۔ "ارے بی بی! جب انھیں یہ معلوم ہے کہ تم ملازمت کس جگہ کر رہی ہو، کس وقت گھر سے نکلتی ہو، کس وقت واپس لوٹتی ہو تو کیا یہ معلوم نہ ہوگا کہ کہاں رہ رہی ہو۔"

"یعنی انھیں میرے آفس کا بھی معلوم ہے۔"

"ہاں... جب تمھارے بابت استفسار پر میں نے کہا کہ میاں وہ تو جاب کر رہی ہے تو کہنے لگے اس وقت تک تو واپس لوٹ آئی ہوں گی۔ میں نے کہا ہاں مگر کبھی کبھی دیر بھی ہو جاتی ہے۔ پبلک بسوں کے دھکے کھاتی پہنچتی ہے۔"

"پھر؟ پھر کیا کہا آپا انھوں نے؟"

"آٹھ بجے پھر فون کریں گے۔"

"اوہ۔"

میرا دل بے اختیار ہونے لگا ـــ میں نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ سات بجنے میں چار منٹ باقی تھے۔ آٹھ بجنے کا انتظار ایک کٹھن آزمائش سے گزرنے کے مترادف تھا۔ میں حسب معمول انیکسی میں جانے کے بجائے لاؤنج میں بیٹھ کر فون کا انتظار کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد مسز ہمدانی کی ملازمہ میرے لیے چائے لے آئی۔ آٹھ بجتے ہی میرا دل ایک ناقابل بیان بے کلی سے دوچار ہو گیا اور کان ٹیلیفون کی گھنٹی پر لگ گئے۔ آٹھ بج کر سات منٹ پر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور میرا دل بے محابا دھڑکنے لگا۔ مسز ہمدانی نے ریسیور کیا پھر گردن موڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

"قرۃ العین! تمھارا فون ہے۔"

میں جو فون کی گھنٹی سنتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی، کپکپاتی ٹانگوں سے فون تک پہنچی۔ مسز ہمدانی نے ریسیور مجھے تھمایا اور خود لاؤنج سے بالائی منزل کو جانے والے زینے کا رخ کیا۔

"ہیلو!" میں نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"کیسی ہو؟"

شیراز کی آواز سماعت سے ٹکراتے ہی میرا دل ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار ہو گیا۔ یہ آواز! یہ آواز میں نے کتنے دنوں بعد سنی تھی۔ وہی جس نے مجھے ٹھکرایا تھا، اب مہربان اور رسیلی آواز میں مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں کیسی ہوں۔ بے اختیار میرا دل بھر آیا۔ آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔

"زندہ ہوں۔" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

کچھ دیر کو خاموشی سی چھا گئی اور مجھے یوں لگا جیسے رابطہ منقطع ہو گیا ہو لیکن پھر ایک گہرا سانس لینے کی آواز میرے کان سے ٹکرائی اور شیراز کی آواز سنائی دی۔

"عینی! میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"فائدہ؟"

"محبت فائدہ یا نقصان نہیں دیکھتی۔"

"پلیز! پلیز شیراز! محبت کا نام نہ لو۔ کیا محبت اسی قدر ظالم ہوتی ہے؟" میں نے آنسو اپنے دوپٹے کے آنچل میں جذب کرتے ہوئے کہا۔

"میں پاگل ہو گیا تھا عینی! مجھے معاف کر دو۔"

میں چپ رہی۔ اس سوال کا کیا جواب دیتی۔

"تمھیں دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ بہت برا بھلا کہتا ہوں میں اپنے آپ کو۔"

میں چونکی۔

"مجھے دیکھ کر!" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔"

"کہاں دیکھا تم نے مجھے؟"

"روز دیکھتا ہوں۔ کبھی گھر سے نکلتے ہوئے، کبھی بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کرتے ہوئے، کبھی دفتر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اور کبھی ان سیڑھیوں سے اترتے ہوئے۔"

"گویا تم میرا پیچھا کرتے رہتے ہو؟"

"یہی سمجھ لو۔"

"اور یہ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں رہ رہی ہوں؟"

"بہت بچکانہ سا سوال ہے... جن سے محبت کی جاتی ہے عینی! ان کی تو لمحہ لمحہ خبر گیری کی جاتی ہے۔"

"پھر... پھر تم نے محبت کا نام لیا..." میں بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ حق مجھ سے نہ تم چھین سکتی ہو نہ کوئی اور... ایک بار نہیں بار بار کہوں گا، سو بار کہوں گا، ساری زندگی کہتا رہوں گا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔"

"تم چھ ماہ بعد پلٹ کر خبر لے رہے ہو۔" میں نے شکوہ کیا۔

"میں تمھیں آزمانا چاہتا تھا۔"

"مجھے آزمانا چاہتے تھے؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کتنے عرصے تم مجھ سے لاتعلق اور بے خبر رہ سکتی ہو۔"

"تعلق رہ ہی کیا گیا ہے۔" میری آنکھیں پھر بھیگ گئیں اور آواز بھی آنسوؤں کے بوجھ سے گھٹ گئی۔

"جو کچھ ہوا، میں اس پر شرمندہ ہوں عینی اور اب تم

سے دوبارہ ملاپ کی کوئی صورت نکالنا چاہتا ہوں۔۔۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔۔۔ بولو کب اور کہاں ملوں تم سے؟"

میں نے ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا: "قسمت ہمیں جُدا کر چکی ہے رازی۔ واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔"

"کوئی نہ کوئی راستہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے جینی۔ ہم راستہ تلاش کریں گے۔ میں نے جو کچھ کہا تھا وہ محض ہذیان تھا۔ میں اپنے الفاظ واپس لینا چاہتا ہوں۔"

"کیا یہ اسی قدر آسان ہے؟"

"تم ملو تو سہی مجھ سے۔۔۔ کچھ سوچیں گے، کچھ کریں گے۔۔ میں وہاں آجاؤں تمھارے پاس؟"

"نہیں ہرگز نہیں۔"

"تو تم گھر آجاؤ۔"

"کون سا گھر! وہ گھر جس کے دروازے تم نے مجھ پر بند کر دیے۔"

"مجھے اور شرمندہ مت کرو۔ آئی ایم سوری۔۔۔ آئی ایم رئیلی سوری جینی۔۔" شیراز نے پل بھر کو توقف کیا پھر کہا۔

"ویسے بھی میں نے جو کچھ بکا زبان سے بکا، قلم سے تو اب تک کچھ نہیں لکھا۔ کوئی کاغذی ثبوت نہیں اس بات کا کہ میں تمھیں طلاق دے چکا ہوں۔"

"دل سے تو میں نے بھی قبول نہیں کیا تھا تمھارا وہ ظالمانہ فیصلہ۔" میں نے جی ہی جی میں کہا۔

"ہاں تو کب اور کہاں مل رہی ہو تم مجھ سے؟ کتنے دن ہو گئے تمھیں نزدیک سے دیکھے ہوئے۔"

دکھ کی ایک لہر میرے سر سے پاؤں تک دوڑ گئی۔ ہجر کی جس بے تابی کا شیراز ذکر رہے تھے اس سے تو میں خود بھی دوچار تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے شیراز کو دیکھے ہوئے۔ وہ مرد ہونے کا فائدہ اب بھی اٹھا رہے تھے، مجھے دیکھ رہے تھے۔ خواہ دور ہی سے سہی میری نگاہوں سے پنہاں رہ کر ہی۔ مگر میں! نزدیک سے انھیں دیکھنے کا تو سوال ہی کیا، میں تو دور سے بھی ان کی ایک جھلک دیکھنے کو ترس رہی تھی۔ بے شک ان کا تصور میرے دل میں ہر وقت بسا رہتا تھا مگر تصور سوائے اس بے کلی اور اضطراب کے مجھے کیا دے سکتا تھا جو تصور کے سراب سے حقیقت کے ریگزار میں نکل آنے پر میرے دل کو ایک ان کہی اذیت سے دوچار کر دیا کرتا تھا۔

"ابھی مل سکتی ہو تم مجھ سے؟" شیراز پوچھ رہے تھے۔

"نہیں۔"

"کل؟"

"فائدہ؟"

"فائدے اور نقصان کا بعد میں سوچیں گے، فی الحال تو تم میرے سوال کا جواب دو۔"

"صبح نو بجے سے پانچ بجے تک میں دفتر میں ہوتی ہوں۔"

"گولی مارو دفتر کو۔۔۔ جس دفتر میں تم ملازمت کر رہی ہو اسے میں اس کے مالک کے ساتھ خرید سکتا ہوں۔"

"میں جانتی ہوں۔"

"پھر دفتر کو کیوں اہمیت دے رہی ہو؟"

"کیونکہ ملازمت میری مجبوری بن چکی ہے۔"

"سنو! کل صبح آٹھ بجے میں بس اسٹاپ پر تمھارا منتظر ہوں گا۔۔۔ حالانکہ بظاہر یہ بڑی عجیب سی بات لگتی ہے کہ میں اپنی بیوی کا بس اسٹاپ پر انتظار کروں۔"

"بیوی۔" میں نے افسردہ لہجے میں کہا: "ہاں کبھی تھی تو سہی میں تمھاری بیوی۔"

"تھی سے تمھارا کیا مطلب ہے؟ یو آر اسٹل مائی وائف۔"

"میں بھی اب تک تم ہی کو اپنا سب کچھ سمجھتی ہوں۔" میں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا مگر دل کی یہ بات زبان پر نہ لائی۔

"کل صبح آٹھ بجے۔" شیراز نے کہا۔

"اتنی صبح جاگ سکو گے تم؟" میں نے پوچھا۔

"کل صبح آٹھ بجے کے انتظار میں میں رات بھر جاگوں گا۔"

یعنی ہجر کی آزمائش نے شیراز پر میری اہمیت آشکار کر دی تھی۔ میں غرور و ناز سے مسکرا دی۔

بڑے جذباتی انداز میں ایک دوسرے کو فون پر

چلی گئی۔ ساڑھے نو بجے

مسز ہمدانی سے میری دوبارہ ملاقات ہوئی۔ کھانے کی میز پر بچوں کی موجودگی کے خیال سے نہ مسز ہمدانی نے مجھ سے کچھ پوچھا، نہ میں نے از خود کچھ بتانا مناسب سمجھا البتہ کھانے کے بعد جب مسز ہمدانی کے تینوں بچے ڈائننگ روم سے چلے گئے تو مسز ہمدانی نے گہری نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا: "کوئی خاص بات؟"

"جی۔" میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

مسز ہمدانی نے کڑے وقت میں جس طور میری دلجوئی اور مدد کی تھی، اس کا تقاضا تھا کہ میں انھیں اپنا ہمدرد جان کر اس نئی صورت حال سے بھی آگاہ کر دیتی۔ چنانچہ میں نے انھیں شیراز سے ہونے والی گفتگو کا لب لباب بتا دیا۔ انھوں نے خاصی حیرانی سے یہ بات سنی پھر سوچ میں پڑ گئیں۔ ان کے

چہرے پر بکھری گمبھیرتا دیکھ کر میں نے کہا: "آپا! وہ کہہ رہے تھے کہ تم اب بھی میری بیوی ہو کیونکہ تمہارے پاس طلاق کا کوئی تحریری ثبوت تو ہے نہیں۔"

"پھر تمہارا کیا خیال ہے؟" مسز ہمدانی نے... مجھے اس طور گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا جیسے میرے چہرے کے راستے دل کی گہرائیوں کا حال جان لینا چاہتی ہوں۔

"آپا...!" میں نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا: "سچی بات یہ ہے کہ دل سے تو میں نے بھی قبول نہیں کیا تھا ان کے اس فیصلے کو۔"

مسز ہمدانی کچھ اس طرح مسکرائیں جیسے میں نے کوئی بچکانہ اور احمقانہ بات کہی ہو پھر بولیں: "بی بی! میں مسلمان ہوں اور خدا کے فضل سے اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور۔ میری خوش قسمتی کہ اسلامک اسٹڈیز میرا مضمون ہے اور خداوند کریم نے مجھے یہ موقع دیا ہے کہ میں دوسروں کو بھی اوامر و نواہی سے آگاہ کر سکوں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم نے مجھے بتایا تھا کہ شیراز نے تمہیں تین مرتبہ طلاق دی تھی۔ اگر ایسا ہی ہوا تھا تو تمہیں شرعاً طلاق ہو چکی ہے اور جہاں تک تمہارے اس جواز کا تعلق ہے کہ تم نے دل سے طلاق کو قبول نہیں کیا تھا تو طلاق مرد کا اختیار اور حق ہے۔ مرد کے طلاق دے دینے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ عورت کے قبول نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

مسز ہمدانی کی اس بات نے مجھے متذبذب کر دیا۔ اس تذبذب کو میرے چہرے کے تاثرات سے بھانپتے ہوئے انھوں نے کہا: "ویسے تو تم مختار ہو مگر ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا فرض بنتا ہے اور جس علم سے خدا نے مجھے نوازا ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کی بہتر صورت یہی ہے کہ میں اگر اپنے کسی مسلمان بہن بھائی کو دینی معلومات کے ضمن میں کسی تذبذب یا غلط فہمی کا شکار دیکھوں تو اس کو غلط راستے سے بچاؤں اور صحیح راستے سے آگاہ کروں۔ تمہیں طلاق ہو چکی ہے۔ پھر بھی اگر کوئی شک ہو تمہارے یا تمہارے میاں کے دل میں تو تم کسی عالم سے فتویٰ لے سکتی ہو۔"

"اگر عالم نے بھی طلاق کا فتویٰ دے دیا تو؟"

"تو واپسی کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے حلالہ۔ اور اگر تم لوگ اس راستے سے گزرے بنا رجوع کرو گے تو یہ بڑا گناہ ہو گا جس کی بہرحال سزا مقرر ہے۔"

"آپا! ہو سکتا ہے شیراز نے دو طلاقیں دی ہوں۔"

میں نے جھوٹ بولا۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ شیراز نے مجھے تین طلاقیں دی تھیں۔

"تب بھی رجعت کا وقت تو گزر چکا..." مسز ہمدانی بولیں پھر انھوں نے بڑی ہمدردانہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا: "بی بی! ایک عورت ہونے کے ناتے میں تمہاری کیفیت سے آگاہ ہوں۔ مگر ہمیں اور تمہیں مکافاتِ عمل پر یقین رکھنا چاہیے۔ بعض راستے بڑے کٹھن اور خاردار ہوتے ہیں۔ ان سے گزرتے ہوئے پاؤں ہی نہیں دل بھی زخمی ہو جاتا ہے لیکن اس عارضی دنیا کی فانی خوشیوں کی خاطر اگر ہم دائمی انجام سے نظریں چرا لیں تو بے شک یہ بڑی غلطی اور بدقسمتی ہو گی۔"

میں جو فون پر شیراز کی آواز اور ان کی باتیں سن کر بہت خوش اور قدرے متذبذب تھی مسز ہمدانی کی باتیں سن کر میری خوشی کافور ہو گئی اور الجھن گہری پڑ گئی۔

تاہم اگلی صبح میں شیراز سے ملنے روانہ ہو گئی۔ بس اسٹاپ پر وہ اپنی گاڑی میں میرے منتظر تھے۔ وہی مرد تھا، وہی گاڑی مگر میرے دل پر اجنبیت کا سا احساس طاری تھا۔ شاید گزشتہ رات مسز ہمدانی سے بات نہ ہوئی ہوتی تو یہ احساس اتنا گہرا نہ ہوتا۔

"یہ کیا حالت بنا لی ہے تم نے؟" شیراز نے مکمل طور پر گاڑی دوڑاتے ہوئے کہا۔

"اچھی ہوں... ٹھیک تو ہوں۔"

"وہ میری والی ہنستی کہاں گئی... ہنستی مسکراتی... آنکھوں میں ستارے سجائے۔"

"اسے تو تم نے مار ڈالا۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ڈونٹ ٹاک نان سینس..." شیراز نے کہا اور بایاں ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر سے ہٹا کر آہستہ سے میری کمر کے گرد حائل کرنے کی کوشش کی۔

میں سمٹ کر ذرا آگے کو سرک گئی۔

"اپنی گرفت اسٹیئرنگ پر رکھو۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"تم بدل گئی ہو۔" شیراز کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"تم میری بات کرتے ہو۔ میرے لیے تو پوری دنیا ہی بدل گئی ہے۔"

نمی میری آنکھوں کے کناروں تک چلی آئی تھی۔

"آئی ایم سوری ڈارلنگ... میری وجہ سے تمہیں بڑا دکھ پہنچا... بہرحال تم فکر نہ کرو۔ اب اتنی محبت، اتنا پیار دوں گا کہ تم ان چھ ماہ کا ہر دکھ بھول جاؤ گی۔"

"یہ تم مجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟"

"گھر اور کہاں؟"

"کون سا گھر؟"

"اپنے گھر۔"

"کیا یہ ممکن ہے؟"

"ممکن نہ ہونے کی کیا بات ہے" شیراز نے اپنے سامنے آویزاں آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے طلاق دے چکے ہو۔"

"ثبوت؟"

میں نے آئینے میں شیراز کو مسکراتے ہوئے پایا۔

"تم مجھ سے زبردستی تو نہیں کر سکو گے رازی!"

"کیا مطلب؟" شیراز نے سر گھما کر ایک پل کو میری طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ شرعاً تم مجھے طلاق دے چکے ہو اور میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

"میں نے جو کچھ کہا تھا غصے میں کہا تھا اور غصے میں دی جانے والی طلاق واقع نہیں ہوتی۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"طلاق غصے اور جذبات ہی میں دی جاتی ہے۔ کوئی مرد عورت کو پیار سے طلاق نہیں دیتا۔"

"ڈونٹ بی سلی جین... کیا یہ بات ہمارے حق میں نہیں جاتی کہ اس طلاق کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ہے۔"

"اس عارضی دنیا کے وقتی فائدے کی خاطر میں دائمی انجام سے نظریں نہ چرا سکوں گی رازی۔ بالفرض ہم ساتھ رہنے بھی لگے تو یہ ایک خیال میرے لیے ہمیشہ سوہانِ روح بنا رہے گا کہ ہم گناہ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

"پاگل اور جذباتی مت بنو، یہ طلاق نہیں ہوئی ہے۔"

"آل رائٹ! اگر تم مُصر ہو اور تمہیں شبہ ہے تو ہم کسی عالم دین سے فتویٰ لیے لیتے ہیں۔ اگر وہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ طلاق نہیں ہوئی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔"

"رازی! میرے دفتر کا وقت ہو رہا ہے۔"

"دفع کرو دفتر کو۔ میں تمہیں گھر لے کر جا رہا ہوں۔"

"تم زبردستی نہیں کر سکتے۔"

شیراز نے پھر گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔

"آئی مین اِٹ رازی" میں نے کہا۔

"آئی نو یو۔"

"رازی! آج پہلی دفعہ میں تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ تم نے تو مجھ سے محبت ہی کی، میں تو تم سے عشق کرتی تھی، کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔ مگر گناہ کی دلدل میں پھنس کر میں اس عشق کو داغدار نہیں کرنا چاہتی۔"

"بہت بدل گئی ہو تم" شیراز نے پھر شکوہ کیا۔

"ہاں شاید اس لیے کہ میں نے اپنے دکھ کی صلیب کو شانوں پر اٹھا کر چلنا سیکھ لیا ہے۔"

"شاعری کرنے لگی ہو کیا؟"

"ابھی تک تو نہیں کی۔ شاید اب کرنے لگوں.... اور یہ جو تم اپنے گھر کو جانے والے راستے پر گاڑی دوڑا رہے ہو فضول ہے، میں گاڑی سے نہیں اتروں گی۔"

"آئی وِل شوٹ یو۔"

"یہ زیادہ بہتر ہوگا" میں نے آرام سے کہا۔

دفعتہً گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی اور شیراز نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا چاہتی ہو؟"

"فی الحال تو میں دفتر جانا چاہتی ہوں۔"

"پھر؟"

"پھر جب تم چاہو گے میں تمہارے ساتھ کسی عالم دین کے پاس چلوں گی اور ہم فتویٰ لیں گے۔"

"کیا یہ ضروری ہے؟"

"ہاں بہت ضروری بلکہ ناگزیر۔"

شیراز کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے "آل رائٹ! ہم ابھی چلے چلتے ہیں کسی عالم کے پاس۔"

"ابھی نہیں... نو بجے مجھے دفتر پہنچنا ہے اور آج دس بجے ایک کلائنٹ کے ساتھ میٹنگ میں کلائنٹ سروس ایگزیکٹو کی معاونت کرنا ہے۔"

"گویا کلائنٹس ہم سے زیادہ اہم ہو گئے۔"

"وقت وقت کی بات ہے رازی۔"

"بہت ظالم ہو تم!"

"کیا تم سے زیادہ ہو سکتی ہوں؟"

شیراز شرمسار سے نظر آنے لگے۔

"براہ کرم اب تم مجھے کسی ایسی جگہ ڈراپ کرنے کی کوشش کرو جہاں سے میں میکلوڈ روڈ کے لیے کوئی سواری لے سکوں۔"

شیراز نے شاکی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اسٹیئرنگ سنبھالا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ پھر گاڑی فراٹے بھرتی شہر کی سڑکوں سے گزرنے لگی۔ میرے بار بار کہنے کے

باوجود شیراز نے مجھے راستے میں کہیں نہیں اتارا بلکہ اس پانچ
منزلہ عمارت کے سامنے جا کر گاڑی روکی جس کی چوتھی منزل
پر "الفا ایڈورٹائزنگ" کا دفتر تھا۔

"دفتر سے کتنے بجے نکلو گی؟" شیراز نے میرے اترنے
سے قبل پوچھا۔

"پانچ ساڑھے پانچ بجے۔"

"اندازاً نہیں بالکل صحیح وقت بتاؤ۔"

"کیوں؟"

"میں تمہیں لینے آؤں گا اور پھر ہم دونوں کسی عالم دین
کے پاس چلیں گے۔"

میں ذرا دیر کو تو سوچ میں پڑ گئی پھر ہنس کے کہا: "میں
ٹھیک سوا پانچ بجے نیچے اتروں گی۔"

"اور میں اسی جگہ تمہارا منتظر ہوں گا۔"

لنچ کے وقفے کے بعد میں نے مسز ہمدانی کو فون پر
مطلع کیا کہ میں دیر سے گھر لوٹوں گی۔

"کوئی خاص سبب؟" مسز ہمدانی نے پوچھا۔

"رازی کے ساتھ جانا ہے۔" میں نے دبی دبی آواز
میں بتایا۔

"کہاں؟"

"کسی عالم کے پاس۔"

"ہو سکے تو مفتی حکیم الدین صاحب کے پاس جانا، میں
نے ان کی بڑی شہرت سنی ہے۔"

"کہاں ہوتے ہیں یہ؟"

جواب میں مسز ہمدانی نے اس دارالعلوم کا پتا مجھے
نوٹ کروا دیا جس کے احاطے میں مفتی حکیم الدین صاحب
کی رہائش گاہ بھی واقع تھی۔

سوا پانچ بجے جب میں دفتر سے نکلی تو شیراز میرے
منتظر تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے گاڑی کا دروازہ
وا کر دیا۔ شیراز کریم کلر کے کرتہ شلوار سوٹ میں ملبوس تھے
اور اسی رنگ کی واسکٹ پہن رکھی تھی۔ گاڑی کے اندر کی
فضا اس ہوشربا خوشبو سے مہک رہی تھی جو انھوں نے
اپنے اوپر چھڑک رکھی تھی۔

"آج دن بھر مولویوں کی بابت پوچھتا پھرا ہوں۔" شیراز
نے میرے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد کہا۔

"ناحق پریشانی اٹھائی تم نے۔"

"ناحق کیوں! اسی تحقیق کے نتیجے میں تو میں تمہیں اس
وقت ایک مولوی صاحب کے پاس لے جا رہا ہوں۔"

"رازی! ہمیں کسی مولوی کے نہیں مفتی کے پاس جانے
کی ضرورت ہے اور ہم مفتی حکیم الدین صاحب کے پاس
چلیں گے۔ میں نے سنا ہے ان کی بڑی شہرت ہے۔"

"یار! کیوں بلاوجہ چکر میں پڑتی ہو۔ کسی مولوی کے پاس
چلتے ہیں۔"

"نہیں رازی! ہمیں فتوے کی ضرورت ہے، ہمیں مفتی
کے پاس ہی چلنا چاہیے۔"

شیراز کچھ دیر سوچتے رہے پھر با دل ناخواستہ آمادگی
ظاہر کی۔

مفتی حکیم الدین صاحب سے ان کے دولت کدے
پر جو کہ دارالعلوم کے احاطے ہی میں واقع تھا، ملاقات
ہوئی۔ ان کا چہرہ انتہائی نورانی اور گفتگو حکیمانہ تھی۔ انھوں
نے خاصی توجہ اور انہماک سے ہمارا مسئلہ سنا۔ کچھ مفتی صاحب
کی شخصیت کے تاثر اور کچھ مسز ہمدانی کی اس بات نے کہ
اس عارضی دنیا کے وقتی فائدے کی خاطر ہمیں دائمی اور ابدی
انجام کو نہیں بھولنا چاہیے، مجھے مفتی صاحب کے روبرو سچ
بولنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اعتراف کیا کہ شیراز کی زبان سے
میں نے اپنے لیے تین طلاقیں بقائمی ہوش و حواس سنی تھیں۔ مفتی صاحب
کے استفسار پر شیراز نے کہا کہ انھیں کچھ یاد نہ تھا کہ وہ اس روز
غصے کے عالم میں کیا کہہ گئے تھے۔ مفتی صاحب کچھ دیر غور و فکر
کے بعد میری جانب روئے سخن کرتے ہوئے بولے: "دیکھیے
محترمہ! اگر آپ نے اپنے شوہر نامدار کی زبان سے اپنے لیے
تین مرتبہ طلاق کے الفاظ سنے تو شرعاً طلاق واقع ہو چکی ہے۔"

"مفتی صاحب! میں نے جو کچھ کہا غصے میں کہا۔ میری
نیت طلاق دینے کی نہ تھی۔"

"صاحب! یہ فعل تو ہمیشہ غصے اور ناراضگی کے عالم میں ہی
سرزد ہوتا ہے۔ میرے پاس بعد کو پچھتانے والے جتنے بھی
لوگ آتے ہیں وہ یہی جواز پیش کرتے ہیں کہ ہم نے غصے
میں ایسا کیا۔ مجھے نہیں یاد کہ رجعت کے خواہاں کسی مرد نے
مجھ سے یہ کہا ہو کہ مفتی صاحب! میں نے اپنی بیوی کو پیار سے
طلاق دی تھی۔ سب ہی کہتے ہیں کہ غصے میں ایسا ہو گیا ہے
بھائی! اسی لیے تو غصے کو حرام قرار دیا گیا ہے اور طلاق کو
جائز ہونے کے باوجود خداوند ذوالجلال نے ناپسندیدہ قرار
دیا ہے۔ کاش! آپ جیسے مرد بعد کو پچھتانے کے بجائے غصے
پر قابو پانا سیکھ لیں۔" مفتی صاحب نے بڑی متانت سے کہا۔

"مگر مفتی صاحب! میں نے تحریراً تو طلاق، کوئی دستاویز
نہیں دی۔" شیراز بولے۔

مفتی صاحب تدبر سے مسکرائے پھر فرمایا: "بھائی بیٹے! ساری اہمیت زبان کی ہے۔ آپ نے زبان سے تین مرتبہ اپنی اہلیہ کو طلاق دی، طلاق واقع ہوگئی۔ رہی دستاویز کی بات تو وہ ضمنی سی بات ہے۔ قانوناً دستاویز کی اہمیت ہے مگر شرعاً زبان سے اس امر کا اعلان کافی ہے۔"

میں نے اور شیراز نے بےبسی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"اب آپ دونوں کا ملاپ ایک ہی صورت میں ممکن ہے اور وہ صورت ہے حلالہ..." مفتی صاحب نے فرمایا۔

میں سرتاپا کانپ کے رہ گئی۔

یہ تصور بھی میرے لیے محال تھا۔

"کوئی اور راستہ مفتی صاحب؟" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

مفتی صاحب نے نفی میں سر ہلا دیا اور بولے: "یہ واحد راستہ ہے اور اس میں بھی ایک عمومی غلط فہمی کی تصحیح فرما لیجیے۔"
اتنا کہہ کر چند لمحے مفتی صاحب نے توقف فرمایا پھر بولے۔
"حلالہ کے ضمن میں منصوبہ بندی کی کوئی گنجائش نہیں۔ دوسرے مرد سے نکاح کے بعد فطری انداز میں ازدواجی زندگی گزارنا ضروری ہے۔ پھر اگر کسی باعث عورت اور اس کے دوسرے خاوند کے مابین علیحدگی ہو جائے تب خاتونِ مذکور اپنے پہلے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔"

مفتی صاحب نے جو شرعی مسئلہ بیان فرمایا، میں اس کی گہرائی کو سمجھ سکتی تھی۔

"بہت مشکل ہے یہ۔" میں نے مدھم سُروں میں کہا۔

"ہاں محترمہ! بے شک بہت کٹھن منزل ہے یہ اس مرد کے لیے بھی جو غلطی کر چکا ہو اور عورت کے لیے بھی جو مرد کی اس غلطی کا نشانہ بنی ہو۔ اسی لیے تو طلاق کو جائز قرار دینے کے باوجود ناپسندیدہ کہا گیا ہے۔"

مفتی صاحب کے پاس سے اٹھ کر جب ہم دارالعلوم کے باہر کھڑی گاڑی میں آ بیٹھے تو شیراز کا چہرہ شدید ذہنی ہیجان کا غماز نظر آتا تھا۔ تناؤ کا شکار میں بھی تھی۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا، ان چکروں میں مت پڑو۔ سیدھی سی بات ہے کہ تمھیں طلاق دینے کا کوئی تحریری ثبوت نہ میرے پاس ہے نہ تمھارے پاس اور نہ ہی کسی اور کے پاس۔ ہم بغیر کسی پیچیدگی کے پھر یکجا ہو سکتے ہیں۔"

ذرا دیر کو تو میرا بھی دل ڈانواں ڈول ہو گیا۔ شیراز تک واپس جانے کے لیے کسی دوسرے مرد کی زوجیت سے گزرنا میرے لیے ایک جاں گسل تصور تھا۔

لیکن پھر ایک اور تکلیف دہ خیال میرے ذہن میں ابھرا۔ بے شک طلاق کا کوئی تحریری ثبوت نہ تھا مگر کچھ لوگ تھے جو اس المیے سے واقف ہو چکے تھے۔ مسز ہمدانی ان میں سرِفہرست تھیں اور پھر میرے دفتر کے ساتھی۔ شیراز سے یکجائی کی صورت میں میں ان سے کیوں کر نظریں ملا سکتی تھی۔

شیراز مجھے اسی روز زبردستی گھر لے جانا چاہتے تھے مگر میں ضد کر کے مسز ہمدانی کے گھر پر اتر گئی۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں متفکر و مغموم سی گھر میں داخل ہوئی تو مسز ہمدانی فوراً مجھے تخلیے میں کھینچ لے گئیں اور انھوں نے تشویش کے ساتھ پوچھا: "کیا بات ہے؟ تمھارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟"

میں نے جب صورتِ حال ان کے گوش گزار کی تو وہ بولیں۔
"مفتی صاحب نے بالکل درست فرمایا ہے۔"

"مگر آپا! آپ یہ بھی تو سوچیے کہ واپسی کا جو راستہ انھوں نے بتایا ہے وہ کتنا کٹھن ہے۔"

"وہ تو ہے۔"

"میں اس راستے سے نہیں گزروں گی۔"

"تو واپسی کا خیال بھی ترک کرنا ہوگا۔"

"آپا! مجھے شیراز سے پیار ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"بی بی! دو ہی راستے ہیں! ایک صحیح دوسرا غلط۔ اگر غلط راستہ اختیار کرو گی تو وہ بھی ہنسیں گے جو جانتے ہیں کہ تمھیں طلاق ہو چکی ہے اور تم خدا کی نظروں میں بھی گر جاؤ گی۔ یہ گناہ، رسوائی اور ذلت کا راستہ ہوگا اور جو خدا کا متعین کردہ راستہ ہے اس پر بھی اس امر کی ضمانت ممکن نہیں کہ شیراز تک تمھاری واپسی ممکن ہو سکے گی یا نہیں۔"

"میں پاگل ہو جاؤں گی آپا۔" میں نے سر ہاتھوں میں تھام کر کہا۔

مسز ہمدانی مجھے تسلیاں دینے لگیں۔

اگلے دن ہفتہ واری تعطیل تھی۔ شیراز خلافِ توقع صبح ہی مسز ہمدانی کے گھر آ دھمکے۔ مسز ہمدانی نے انھیں اینکسی میں بھجوانے کے بجائے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور مجھے ملازمہ کے ذریعے بلوا بھیجا۔ شیراز کافی الجھے الجھے اور پریشان نظر آتے تھے۔ مسز ہمدانی ہم دونوں کو ڈرائنگ روم میں بیٹھا چھوڑ کر باہر چلی گئیں۔

"رات بھر نہیں سو سکا ہوں میں۔" شیراز نے شکوہ کن

لہجے میں کہا۔

"تمھارا کیا خیال ہے، مجھے نیند آئی ہوگی۔"

"میری بات کیوں نہیں مان لیتیں تم؟"

"رازی! وہ گناہ کا راستہ ہے اور میں کیسی ہی روشن خیال، آزاد طبع اور تم سے وابستگی کے حوالے سے ہائی سوسائٹی میں گھوم پھر چکنے والی عورت کیوں نہ سہی، بہر حال مسلمان ہوں۔ مجھے لوگوں سے بھی ڈر لگتا ہے اور خدا کا خوف بھی رکھتی ہوں دل میں۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں کہ ان لوگوں کو جو جانتے ہیں کہ میرا شوہر مجھے طلاق دے چکا ہے، اپنے اوپر ہنسوا سکوں اور نہ ہی میں اپنی عاقبت خراب کرنا چاہتی ہوں۔"

"لوگوں کی پروا مت کرو۔"

"اور خدا کی؟"

وہ لاجواب سے نظر آنے لگے۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔ "تو اب کیا کریں؟"

میں اضطراب کے عالم میں بری طرح اپنے ہونٹ دانتوں سے چبانے لگی۔

"بولو کیا کریں؟" شیراز نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

میں بدستور چپ رہی۔

"عینی! کسی بھی قیمت پر، کسی بھی راستے سے تمھیں میرے پاس واپس آنا ہوگا۔" شیراز انتہائی جذباتی اور فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

"کسی بھی راستے سے؟" میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ اگر تمھیں لوگوں کی اور اپنی عاقبت کی اسی قدر پروا ہے تو تمھیں بحالتِ مجبوری اس دوسرے راستے سے گزرنا پڑے گا۔"

"اس پل صراط سے۔"

"ہاں۔"

"کیوں؟ کیوں گزارنا چاہتے ہو تم مجھے اس پل صراط سے رازی۔"

"کیونکہ میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کسی بھی راستے سے تمھیں مجھ تک لوٹنا ہوگا۔"

"رازی! کتنی بڑی بڑی قربانیاں مانگتے ہو کبھی کبھی تم مرد ہم عورتوں سے..." میں نے شکوہ کیا۔

"بی کاز یو آر میڈ فار اِٹ۔"

"ہاں ٹھیک کہتے ہو تم، ہم عورتیں قربانیاں دینے کے لیے ہی بنائی گئی ہیں۔ اوہ! رازی! تم نہیں سمجھ سکتے کہ تم مجھ سے کیا مانگ رہے ہو۔ کیا تم یقین کرو گے کہ میرے لیے تمھارے سوا کسی دوسرے مرد کی قربت کا تصور ہی محال ہے۔" میں رونے لگی۔

شیراز اٹھ کر میرے نزدیک آ بیٹھے اور میرے شانے پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے بولے۔ "ٹیک اِٹ ایزی.... ہمیں مل جل کر اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنا ہے۔ تم تنہا تو اس پل صراط سے نہیں گزرو گی۔ اس آزمائش سے تو میں بھی گزروں گا۔"

میں نے سر جھکا دیا۔

تب ہی مسز ہمدانی کی ملازمہ چائے کی ٹرالی دھکیلتی اندر داخل ہوئی۔ مسز ہمدانی سمجھ دار خاتون تھیں۔ انھوں نے چائے تو بھجوا دی مگر خود مخل ہونا مناسب نہ سمجھا تھا۔

چائے کے بعد میں نے شیراز سے کہا۔ "تمھیں آئے بہت دیر ہو چکی ہے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اب تم چلے جاؤ۔"

"یار! کیسی بے مروتی دکھا رہی ہو تم۔" انھوں نے شکوہ کیا۔

"بات بے مروتی کی نہیں، گھر دوسروں کا ہے اور غیر لوگوں سے کتنی ہی بے تکلفی کیوں نہ ہو، بہرحال احتیاط برتنا پڑتی ہے۔ خصوصاً جب حالات ایسے ہوں جن سے کہ قسمت نے مجھے دوچار کر دیا ہے۔"

"آئی ایم سوری عینی! کہ میری ذرا سی غلطی کے سبب تمھیں اتنی تکلیف اٹھانا پڑ رہی ہے۔" انھوں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"رازی! تمھاری خاطر تو میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں.... تمھاری خاطر تو میں اس پل صراط سے بھی گزرنے کو آمادہ ہو گئی ہوں۔"

"تھینک یو... تھینک یو ویری مچ ڈارلنگ.... اب ہمیں کوئی ایسا سیدھا سادا سا بندہ تلاش کرنا ہوگا جو ہمیں ایک دوسرے سے ملانے میں مددگار ثابت ہو سکے۔"

میں ان کا مطلب سمجھ گئی۔

گو میرے لیے یہ خیال ہی روح فرسا تھا مگر اس پل صراط سے گزرے بنا چارہ بھی نہ تھا۔

مسز ہمدانی کو میں نے اپنے اور شیراز کے اس باہمی فیصلے سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ ان کے اونچی صاحب کے یہ جتا دینے کے باوجود کہ طلاق کے بعد مراجعت کی خاطر

...کہ جانے والے جانثار و خرچ اٹھاتے پر منصوبہ بندی کی کوئی گنجائش نہیں ہے یہ سوچا تھا کہ میں اس راستے سے ایک منصوبے کے تحت گزروں گی تاکہ لوگوں کے کچھ کہنے سننے کی اور انگلیاں اٹھانے کی گنجائش نہ رہے۔ اس سلسلے میں خدا کی جانب سے ملنے والی سزا تو بہرحال میرا استحقاق ہی ہے۔

شیراز کی اور میری ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مسز ہمدانی کو میں نے ان ملاقاتوں سے لاعلم رکھنے کی پوری کوشش کی۔ ان سے رازداری برتنے کے دو اسباب تھے۔ اول تو یہ کہ میں ان کا بجیا کی طرح احترام کرتی تھی اور ان کی متانت کا میرے دل میں احترام تھا۔ دوسرا سبب غالباً یہ خوف تھا کہ وہ مجھے غلط راستے سے روکنے کی کوشش ضرور کریں گی۔ مصلحت کے جس طوق کو پہننے پر میں نے شیراز سے آمادگی ظاہر کی تھی، وہ بے شک راستہ تو ہرگز نہ تھا بلکہ ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی تھی۔

اب ایک سیدھے سادے بے ضرر سے آدمی کی تلاش جاری تھی جس سے نام جوڑنا بھی آسان ہو اور توڑنا بھی۔

اسی دوران میں ایک بار شیراز نے مجھے قانوناً بھی طلاق دے دی۔ ایک وکیل کے توسط سے تیار ہونے والے اس قانونی طلاق نامے میں شیراز کی جانب سے یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ وہ مجھے چھ سات ماہ قبل زبانی طور پر تین طلاقیں دے چکے تھے اور یوں شرعاً طلاق ہوئے مذکورہ مدت ہو چکی تھی۔ اس طلاق نامے کے ذریعے اس طلاق کی قانونی توثیق کی گئی تھی۔ شرعاً میں مدت بھی گزار چکی تھی۔

جب سے شیراز سے دوبارہ تعلقات استوار ہوئے تھے دفتر سے واپسی پر وہ اکثر بیشتر مجھے گھر تک پہنچانے اور کبھی کبھی صبح کے وقت بھی دفتر تک چھوڑ دینے کا فریضہ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ سرانجام دے رہے تھے مگر ایک روز وہ پانچ بجے کے لگ بھگ میرے دفتر آ نکلے تو میں انہیں دیکھ کر کچھ گھبرا سی گئی۔

"آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔

"بابا! تم کلائنٹ سروس ڈیپارٹمنٹ میں ہو کیا کلائنٹس تم سے ملنے نہیں آتے ہوں گے؟" وہ سرگوشی میں بولے۔

"ہاں مگر وہ کلائنٹس ہوتے ہیں۔"

"تمہارے دفتر کے لوگ مجھے بھی کوئی کلائنٹ ہی سمجھیں گے۔"

"دفتر والے تمام کلائنٹس کو جانتے پہچانتے ہیں۔"

"میں کوئی نیا کلائنٹ بھی تو ہو سکتا ہوں۔"

"آل رائٹ! آپ یہ فرمائیں کہ زحمت کیوں کی؟"

"یار!" وہ کرسی کھینچ کر میز پر کہنیاں ٹیکتے ہوئے ذرا آگے کو جھک گئے۔ "لندن سے ایک دوست آیا ہوا ہے میرا، تقریباً مہینہ بھر کے لیے۔ وہ ہمارے کام آسکتا ہے بس ایک خدشہ ہے۔"

"وہ کیا؟"

"دوست تو ہے میرا لیکن ذرا دل پھینک قسم کا آدمی ہے۔ شادی تو وہ تم سے خوشی خوشی کرے گا بلکہ وہ کیا حسین دیکھ کر تو بڑے بڑے عابد و زاہد بھی بہک جائیں گے پر یار ڈر یہ ہے کہ سالے کی نیت نہ بدل جائے۔ تم جیسی دلکش اور دلنواز عورت کو کون کافر چھوڑے گا۔"

"تم اور کون؟" میں نے گھائل لہجے میں کہا۔

"اس کی سزا بھی تو بھگت رہا ہوں۔ ذرا سوچو کیا یہ ایک کٹھن آزمائش نہیں کہ شوہر اپنی بیوی کو دوبارہ اپنانے کے لیے ایک بندہ تلاش کرتا پھرے۔"

میں ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

"ڈارلنگ! دوست تو وہ بڑا گہرا ہے میرا، بس یہی ڈر ہے کہ کہیں وہ بے ایمان نہ ہو جائے۔"

تب ہی کری ایٹو ڈیپارٹمنٹ کا کمرشل آرٹسٹ بلال مصطفیٰ میرے کیبن کے المونیم کی چوکھٹ والے شیشے کے دروازے پر ایک ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہوا اور اس نے سبز رنگ کا ایک لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا "مس قرۃ العین! پانچ تاریخ کی شام کو آرٹس کونسل میں میری تصاویر کی نمائش ہے۔ یہ آپ کا دعوت نامہ ہے۔"

"اوہ! تھینک یو۔" میں نے لفافہ بلال سے لے لیا اور کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹھو۔"

"بس اب چلوں گا، گھر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

"یعنی تمہاری چھٹی کا وقت ہو چکا ہے۔" میں مسکرائی۔

"جی۔" جواباً وہ بھی مسکرا دیا اور چلتے ہوئے بولا "آپ آئیں گی نا؟"

"ضرور... بائی دی وے، بلال کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اس نمائش میں تم کتنی تصویریں رکھ رہے ہو؟"

"پچاس سے زائد۔"

"گڈ!"

"اس نمائش کے سلسلے میں میں نے یہاں سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی ہے کل سے میں چھٹی پر ہوں اور اب چھ تاریخ کو جوائن کروں گا۔ آپ یاد رکھیے گا کہ پانچ تاریخ کو

"آپ نے آرٹس کونسل ضرور آنا ہے۔ چونکہ یہ نمائش میں اپنی پینٹنگز کے لیے منعقد کر رہا ہوں اس لیے میری خواہش ہے کہ اس نمائش میں آپ جیسے آرٹ سے دلچسپی رکھنے والے لوگ ضرور آئیں۔" بلال مصطفیٰ نے کہا۔

"بائی دی وے، بلال تم نے یہ اندازہ کیسے لگا لیا کہ میں آرٹ میں دلچسپی رکھتی ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"میڈم! آرٹسٹ کی نظر بڑی گہری ہوتی ہے۔"

"اچھا!" میں مسکرا دی۔

"اوکے جی! اب مجھے اجازت اور یاد رکھیے گا کہ آپ کو ضرور آنا ہے۔"

"شیور۔"

بلال کے جانے کے بعد میں شیراز کی جانب متوجہ ہوئی تو وہ کسی گہری سوچ میں خلاؤں میں نظر آئے۔

"کہاں پہنچے ہوئے ہو رازی؟"

"آں... ہاں... یہ حضرت کون تھے؟"

"ہمارے کری ایٹو ڈیپارٹمنٹ میں بحیثیت کمرشل آرٹسٹ کام کرتا ہے... بہت اچھا نائس فیلو... شریف اور مہذب... عسکری صاحب کے علاوہ یہی ادارے کا واحد مرد ہے جس کی میں قدر کرتی ہوں۔"

"اچھا!" شیراز نے معنی خیز انداز میں کہا پھر بولے، "سبب؟"

"اب تو خیر سب عادی ہو گئے ہیں لیکن شروع شروع میں جب میں اس ادارے میں آئی تھی اور لوگوں کو یہ معلوم ہوا تھا کہ میں ایک طلاق یافتہ عورت ہوں تو مردوں کا رویہ بڑا عجیب سا تھا۔ عجیب نگاہوں سے مجھے دیکھتے تھے، معنی خیز انداز میں مسکراتے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے تھے۔ دو چار نے لفٹ دینے کی کوشش بھی کی۔ ایک صاحب نے تو ایک روز کسی ریسٹورنٹ میں بھی مدعو کرنا چاہا۔ مگر بلال عسکری صاحب کے علاوہ واحد شخص ہے جس سے مجھے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ وہ مجھے اول دن سے مہذب اور شریف نظر آیا۔ اسی لیے میں اس کی قدر کرتی ہوں۔"

"ہوں..." شیراز نے گہری سانس لی پھر ذرا سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولے، "مجھے بھی سادہ اور شریف بندہ لگا ہے یہ... اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

میں نے چونک کر شیراز کی طرف دیکھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"آئی مین... اگر تمہاری رائے اس کے بارے میں اچھی ہے تو یہ ہمارے کام آ سکتا ہے۔"

"نہیں... نہیں رازی ڈیئر" میں نے ان کی بات رد کرتے ہوئے کہا۔

"یار! یہ جو آرٹسٹ، شاعر اور ادیب قسم کے لوگ ہوتے ہیں نا، تعریف کے دو جملوں سے ملائم ہو جاتے ہیں اور ایک ذرا سی ٹھیس پہ بکھر جاتے ہیں۔ ان سے تعلق جوڑنا بھی آسان اور توڑنا بھی مشکل نہیں۔ ویسے بھی یہ لوگ جو شریف، مہذب اور ٹھیک ٹھاک قسم کے قابل بھروسا لوگ ہوتے ہیں... یو کین ٹرسٹ دیم... ان کا اعتبار کیا جا سکتا ہے... مڈل یا لوئر مڈل کلاس کا یہ نوجوان مجھے اپنے لندن پلٹ یار سے زیادہ قابل بھروسا اور بے ضرر معلوم ہوا ہے۔ خدانخواستہ اس نے کچھ گڑبڑ کرنے کی کوشش بھی کی تو ہم اس سے نمٹ سکیں گے، تم اس کو چانس دو۔"

میں نے شیراز کی طرف دیکھا اس لمحے ان کا چہرہ مجھے اجنبی اجنبی سا لگا۔ وہ مجھے خود غرض، بے ایمان اور مطلب پرست نظر آئے۔ ان کے آخری جملے سے مجھے گھن سی بھی آنے لگی لیکن اگلے ہی لمحے محبت اور درد کی ایک اونچی لہر میرے دل سے اٹھی اور شیراز مجھے بے حد مہربان اور اپنے نظر آنے لگے۔ مجھے ان پر ترس آنے لگا اور میں نے سوچا وہ جو کچھ کر رہے ہیں مجھے دوبارہ پانے کی خاطر۔ ورنہ کون مرد ہے جو اپنی عورت کو کسی غیر مرد سے ناتا جوڑنے کی ترغیب دینا پسند کرے گا۔ ہاں ذہنی طور پر میں خود کو اب بھی شیراز کی سمجھتی تھی... مگر... آہ! قسمت نے ہمیں کس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔

"میں بالکل یہی مشورہ دے رہا ہوں ملی!" شیراز نے کہا۔

"یہ بہت مشکل ہے رازی!" میں نے بے بسی سے کہا۔

"پر ناممکن نہیں۔"

میں اضطراب کے عالم میں انگلیاں چٹخانے لگی۔ تب ہی انٹرکام کا بزر بجا اور حسن عسکری صاحب کی جانب سے میری طلبی آ گئی۔

"اوکے! اب میں بھی جاتا ہوں۔ ٹھیک سوا پانچ بجے نیچے تمہارا منتظر ہوں گا۔ ابھی تیس پینتیس منٹ باقی ہیں۔" شیراز نے میرے ساتھ ہی اٹھتے ہوئے کہا۔

"رائٹ! اور آئندہ یہاں آنے کی غلطی مت کرنا۔"

"اوکے۔"

سوا پانچ بجے جب میں نیچے اتری تو شیراز میرے منتظر تھے۔ اس روز وہ مجھے ایک خاصے شاندار ہوٹل کے کافی کارنر میں لے گئے۔ کافی کارنر کے ایک الگ تھلگ گوشے میں بیٹھے ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔

"ڈارلنگ! آئی ایم ڈراؤننگ خارو... اور کسی بھی قیمت پر میں تمہیں دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"
"کیوں کہ تم مجھ سے پیار کرتے ہو" میرے دل نے بےحد ناز کیا۔
"تمہارے دفتر کا وہ آرٹسٹ بالکل ٹھیک رہے گا۔"
میں نے بے بسی سے شیراز کی طرف دیکھا وہ اپنی کرسی میرے نزدیک کھینچ لائے اور کرسی کی پشت کی آڑ میں اپنا بازو لا کے میری کمر کے گرد حائل کر دیا۔
"پلیز" میں کسمسا کر دور ہو گئی۔
شیراز نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولے۔
"میں نے ٹھیک کہا ہے کہ تم مجھے اب قریب نہیں آنے دیتیں۔"
"ہاں... دور ہی کر تم نے خود ہی کہا تھا۔" میں نے گھمائی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"غلطی کی سزا بھگت تو رہا ہوں..." وہ شرمسار نظر کرتے ہوئے پھر بولے۔ "بہتر یہی ہے کہ تم وقت ضائع کرنے کے بجائے اس آرٹسٹ کو چانس دو۔ اس سلسلے میں وہ صاحب ٹھیک ٹھاک رہے گا؟"
"وہ شریف آدمی ہے رازی؟"
"تو ہم کون سے بدمعاش ہیں!"
"کیا کسی شریف آدمی کو بلیک میل اور ایکسپلائٹ کرنا شرافت ہوگی؟"
"یار! دوبارہ ملنے کے لیے ہمیں کسی نہ کسی کا استعمال کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ یہ دوری کر اے کم مجھے تو ضرور پاگل کر دے گی۔ تم نہیں جانتیں تمہارے بغیر میں کیسا پاگل ہوا جا رہا ہوں... یقین کرو میں تڑپ رہا ہوں۔"
ٹپ!
ٹپ!
دفعتاً میرے بازو پر جو میں نے کہنی کے جوڑ کر موڑتے ہوئے میز پر دھر رکھا تھا چند قطرے گرے۔ میں نے چونک کر شیراز کی طرف دیکھا وہ رو رہے تھے۔ میرا دل پگھلنے لگا۔ میں نے اپنے بیگ سے رومال نکال کر شیراز کی طرف بڑھاتے ہوئے سر جھکا کر شکست خوردہ اور مجبور لہجے میں کہا۔ "او کے! آئی ول ٹرائی۔"
شیراز نے رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا "کوشش نہیں... تمہیں ایسا کرنا ہے۔ اپنی خاطر نہ سہی میری خاطر۔"
میں ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

واپسی پر راستے میں شیراز نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ جب تم اس کی طرف ہاتھ بڑھاؤ گی تو وہ تمہارا ہاتھ تھام لینے پر مجبور ہو گا۔"
میں ایک ان کہی کشمکش سے دوچار تھی۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ حالات کا دھارا اس رخ پر بہہ نکلے گا۔
خدایا! خدایا! تو نے ہم عورتوں کے مقدر میں ایسی آزمائشیں کیوں لکھ دی ہیں؟ میں سختی سے اپنے دونوں جبڑے باہم بھینچے سوچ رہی تھی۔

شیراز کا اندازہ درست تھا۔
بلال مصطفیٰ میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھامنے پر مجبور ہو گیا۔
اور اس کے لیے مجھے زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑی۔
تصویروں کی نمائش والے دن میں خاص اہتمام سے تیار ہو کر تقریب میں پہنچی اور بلال کی تصاویر سے زیادہ حاضرین کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ سہ پہر کو نمائش کا افتتاح ہوا اور رات کا اندھیرا پھیلنے تک شائقین ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے مگر میں آخر تک رکی رہی۔ نمائش سہ روزہ تھی، اس لیے بلال کو اسباب سمیٹنے کی فکر نہ تھی۔ ہال کو مقفل کرنا آرٹس کونسل کے منتظمین کی ذمہ داری تھی۔ ہال سے نکلنے والے آخری دو نفوس میں اور بلال تھے۔ آرٹس کونسل کی سیڑھیاں اتر کر جب ہم نیچے پہنچے تو رات گہری ہو چکی تھی۔
"اب آپ کیسے جائیں گی؟" بلال نے پوچھا۔
"اس وقت تو یہاں کوئی سواری بھی ملنا مشکل ہو گی۔" میں نے مصنوعی فکرمندی کا اظہار کیا۔
"آئیے باہر نکل کر دیکھتے ہیں شاید کچھ مل جائے۔" بلال نے اپنے اسکوٹر کو آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔
"تم کہاں تک جاؤ گے؟"
"فیڈرل کیپیٹل ایریا۔"
"وہیں ہے تمہارا گھر؟" میں نے قدم بہ قدم بلال کے ساتھ آرٹس کونسل کے صدر دروازے کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے پوچھا۔
"گھر کیا ہے دو کمروں کا ایک چھوٹا سا فلیٹ ہے۔ ایک کمرے کو اسٹوڈیو کے طور پر استعمال کرتا ہوں، دوسرا کمرہ شب بسری کے لیے ہے۔" بلال نیم خم اسکوٹر کو آگے دھکیل رہا تھا۔
"گھر میں اور کون کون ہے؟"
"کوئی نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ شادی کی نہیں ہے ابھی۔ والدین عرصہ ہوا فوت ہو چکے۔ ایک شادی شدہ بہن ملتان میں رہتی ہے باقی یہ فقیر ہے اور اللہ کا نام۔"

"ویری گڈ!" میں نے دل میں کہا۔

ہم آرٹس کونسل کی حدود سے باہر نکل آئے تھے اور روڈ کاٹ کر بس اسٹاپ پر آ کھڑے ہوئے تھے۔

"تمھاری تصویریں مجھے بہت پسند آئیں۔"

"شکریہ۔"

تب ہی ایک بس آتی نظر آئی۔

"آپ کو جانا کہاں ہے؟"

"سوسائٹی۔"

"اگر آپ اس بس سے صدر تک چلی جائیں تو وہاں سے آپ کو سوسائٹی کے لیے کوئی نہ کوئی سواری ضرور مل جائے گی۔" جلال نے تجویز کیا۔

"رات ہو گئی ہے اب میں صدر میں اتر کر کہاں خوار ہوتی پھروں گی۔"

بس آئی اور چلی گئی۔

ہم دونوں بہت دیر تک چلتی دمکتی روشنیوں والے ٹریفک کے ہجوم میں خالی رکشا کے منتظر رہے۔ ایک رکشا خالی ملا بھی مگر خوش قسمتی سے سوسائٹی جانے پر آمادہ نہ ہوا۔ بہت دیر ہونے لگی تو میں نے کہا "تمھیں بھی میری وجہ سے پریشان ہونا پڑ گیا ہے۔"

"نہیں کوئی بات نہیں۔ یوں بھی گھر پر کون میرا منتظر بیٹھا ہے جب پہنچوں، نہ کوئی پوچھنے والا ہے نہ فکر کرنے والا۔"

"شادی کر لو۔"

وہ چپ رہا۔

زیادہ دیر ہونے لگی تو میں نے پوچھا "یہ بتاؤ جلال تم گھر کس راستے سے جاتے ہو؟"

"کبھی گرو مندر سے کبھی سوسائٹی اور حسن اسکوائر سے ہوتا ہوا۔"

"ویری گڈ تو اس کا مطلب ہے تم سوسائٹی کے راستے بھی اپنے گھر جا سکتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"ارے تو پھر ایسا کرو نا تم مجھے سوسائٹی چھوڑتے ہوئے چلے جانا۔"

"اسکوٹر پر؟"

"ہاں، مجبوری ہے کیا کیا جائے۔"

"اگر آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو جیسی آپ کی مرضی۔"

میں سنبھل کر اسکوٹر پر جلال کے پیچھے بیٹھ گئی اور آن کی آن جلال کی اسکوٹر شہر کی پر رونق سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ میرا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔

سوسائٹی کے علاقے میں پہنچنے کے بعد مجھے جلال کی رہنمائی کے لیے راستہ بتانا پڑا۔ اسکوٹر میں نے مسز ہمدانی کے گھر سے کچھ فاصلے پر رکوائی اور اسکوٹر سے اترتے ہوئے کہا "آئی ایم سوری جلال میں تمھیں ایک کپ چائے کے لیے بھی مدعو نہیں کر سکتی کیونکہ یہ میرا گھر نہیں بلکہ عارضی پناہ گاہ ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" جلال نے کہا۔

"اوکے... تھینک یو ویری مچ۔"

جلال کے جانے کے بعد مسز ہمدانی کے گھر کے صدر دروازے کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے میں نے جی ہی جی میں کہا۔ "نازی! کیسی آزمائش سے گزار رہی ہے تمھاری ایک غلطی تمھیں!"

گیٹ ملازم نے کھولا۔ میں مسز ہمدانی کی گہری سوالیہ نگاہوں سے بچنے کی خاطر اپنے کمرے میں چلی گئی جب سے میرے گھر آنے کے اوقات بدلے تھے مسز ہمدانی مجھے خاصی گہری اور معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگی تھیں۔

پندرہ بیس دن کے اندر اندر میں نے جلال سے بے تکلفانہ تعلقات استوار کر لیے تھے۔ پھر ایک روز اس کا اسٹوڈیو دیکھنے کے بہانے میں فیڈرل کیپٹل ایریا میں واقع اس کے دو کمروں کے فلیٹ پر جا پہنچی۔ یہ فلیٹ اس نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ ایک کمرہ اسٹوڈیو بنا ہوا تھا اور دوسرے کمرے کی حالت کسی کباڑ خانے سے کم نہ تھی۔ دھول مٹی، سگریٹ کے بے شمار ٹوٹے، میلے کپڑوں کا ڈھیر، مٹیالے رنگ کا بستر، بے ترتیب اسباب، باورچی خانہ بے حد گندا ہو رہا تھا۔ دو چار سیاہ ڈھکنے سے برتن تھے اور چائے کی چند ٹوٹی پھوٹی گندی پیالیاں۔

"مائی گاڈ! جلال تم یہاں رہتے ہو؟" میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"کیا کروں، غریب آدمی ہوں۔ آپ کی طرح سوسائٹی میں تو نہیں رہ سکتا۔"

"غریب تو خیر تم نہیں ہو۔ اچھا بھلا کما لیتے ہو۔ ہاں بجا

جانتی ہوں...... دوسری بات یہ کہ تم نے میری بات کو غلط معنوں میں سمجھا ہے میں تو دراصل یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اس قدر بکھرا بکھرا اور بے ترتیب گھر!"

"گھر عورت سے بنتا ہے اور اس گھر میں عورت ہے نہیں۔ اسی لیے تو اقبال کہہ گئے ہیں کہ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔"

"سوال یہ ہے کہ عورت کیوں نہیں ہے اس گھر میں؟" میں نے بلال سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

"شادی کر لیجیے۔"

"میڈم! اگر صرف شادی ہی کرنا ہوتی تو میں کب کی کر چکا ہوتا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہم آرٹسٹ لوگ آئیڈیلز کے سہارے جیتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ایک عورت کو گھر میں لا ڈالوں اور اس میں اپنا آئیڈیل کھوجتا پھروں، یہ بد دیانتی ہوگی۔"

"تمہارے آئیڈیل میں کیا کیا خوبیاں ہیں؟"

"رہنے دیجیے...... نہ پوچھیے۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولا:

"میں نے اس روز ناشتہ ہی پورش کا کافی بھی۔

"چائے پئیں گی؟"

"پلائے گے تو پی لوں گی۔"

"اچھا۔ آپ یہاں تشریف رکھیں میں ابھی بنا کر لاتا ہوں چائے۔"

"کیا چائے تم خود بناؤ گے؟"

"جی ہاں۔" وہ مسکرا دیا۔

بلال کے باورچی خانے میں جانے کے بعد میں اٹھی اور میں نے کمرے کی بے ترتیب چیزوں کو ترتیب سے رکھنا شروع کیا۔ بستر کی چادر جھاڑ کر دوبارہ بچھائی۔ کمرے کی شرقی دیوار کے ساتھ جھاڑو پڑی تھی۔ جھاڑو سے میں نے کمرے کا فرش صاف کیا اور سگریٹ کے ٹوٹے اور کوڑا کمرے کے دروازے کے پیچھے ڈھیر کر دیا۔

بلال چائے لے کر آیا تو کمرے کی حالت میں خاصی تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔

"ارے! یہ آپ نے کیا کیا؟"

"بے ترتیبی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔"

"تھینک یو۔" وہ چائے کا مگ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"ایک معاہدہ کرو گے؟" میں نے مگ تھامتے ہوئے کہا۔

"کیسا معاہدہ؟"

"میں یہاں آ کر بے ترتیبی دور کر دیا کروں گی اور تم مجھے رنگوں سے کھیلنا سکھا دو گے۔"

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر سر جھکا کر بولا: "کیا آپ یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہی ہیں؟"

"پوری سنجیدگی سے۔"

"اوکے...... مجھے منظور ہے۔"

پھر ہر شام شیراز مجھے ریس کورس گراؤنڈ تک چھوڑنے لگے، وہاں سے میں پیدل بلال کے فلیٹ تک نکل جاتی۔ واپسی پر بلال مجھے مسز ہمدانی کی کوٹھی سے کچھ دور چھوڑ دیتا۔ مسز ہمدانی کے رویے اور ان کے چہرے کے تاثرات سے میرے لیے یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ وہ میرے شوقِ مصوری کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ ان سے میں نے یہی بہانہ کیا تھا کہ میں دفتر سے واپسی پر ایک آرٹسٹ سے مصوری سیکھنے جانے لگی ہوں۔ ویسے میں نے غلط بھی کب کہا تھا اور یوں بھی اب مجھے مسز ہمدانی کے ہاں کتنے دن اور رہنا تھا!

شیراز بے تابی سے میرے اور بلال کے رشتۂ مناکحت میں بندھ جانے کے منتظر تھے کیونکہ اسی راستے سے مجھے ان کے پاس واپس جانا تھا۔ میری اب ان سے تقریباً ہر روز ملاقات ہونے لگی تھی۔ بارہا انھوں نے مجھ سے گھر چلنے پر اصرار کیا مگر میں ہر بار ٹال گئی۔ اس گھر سے میرا ناتا ٹوٹے کئی ماہ گزر چکے تھے جس گھر پر کبھی میرے حکم کا سکہ چلتا تھا، نوکر چاکر میری نظر کے اشارے پر چلتے تھے۔ انھی سے نظریں چرا کر اس گھر میں داخل ہونا مجھے گوارا نہ تھا۔ گو شیراز یہی کہتے تھے کہ نہ نوکروں کو اصل قصے کا علم ہے اور نہ ہی انھوں نے اپنے حلقۂ احباب میں مجھے دی جانے والی طلاق کا کوئی تذکرہ کیا تھا، مگر مجھے ذہنی طور پر اس گھر کے اور اپنے درمیان ایک خلیج حائل محسوس ہوتی تھی۔

اس بچے کی طرح جس کی اسکول سے واپسی پر اس کی ماں اس سے اسکول میں کیے جانے والے اور گھر پر کرنے کے لیے دیے جانے والے کام کی بابت استفسار کرنے بیٹھ جائے، شیراز بھی بلاناغہ میرے اور بلال کی روز افزوں بے تکلفی کے جدول پر ایک نقطہ لگا کر پچھلے نقطے کو اگلے سے ملا دیتے۔

شروع شروع میں مجھے بڑی ہچکچاہٹ سی محسوس ہوئی پھر میں عادی سی ہو گئی۔ ہر روز تازہ ترین صورت حال شیراز کے گوش گزار کرتے ہوئے کبھی تو مجھے شیراز پر ترس آنے لگتا۔ بے چارے کس قدر صبر و تحمل سے سنا کرتے تھے اور کبھی مجھے جھنجلاہٹ سی ہونے لگتی۔ شیراز پر غصہ آنے لگتا۔ ان کی ایک غلطی نے مجھے کیسی صلیب پر لٹکا دیا تھا اور کبھی وہ مجھے بڑے اجنبی اور بیگانہ محسوس ہونے لگتے۔ اپنا مرد بھلا عورت کی زبان سے غیر مرد سے استوار ہوتے تعلقات کی کتھا کہاں سنتا ہے اور اگر سنتا ہے تو نہ وہ اپنا ہوتا ہے، نہ باغیرت اور نہ باضمیر!

بلال سے میرے تعلقات کا گراف جس تیزی سے اوپر گیا، اس میں میری یہ شعوری خواہش بھی پورے طور کارفرما تھی کہ میں بے یقینی، تذبذب، کوفت اور ڈانواں ڈول کیفیت سے نکل کر جلد از جلد اس خلیج کے جو میرے اور شیراز کے مابین حائل تھی، اس پار پہنچ جانا چاہتی تھی جہاں شیراز میرے منتظر تھے۔ شیراز اس ضمن میں مجھ سے بھی زیادہ مضطرب تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ گراف پوری تیزی سے اپنی انتہائی حد پر پہنچ جائے اور اس آخری حد سے ٹکرا کر یک بیک پارہ پارہ ہو جائے یا ہر عروج کو زوال کے مصداق نیچے آگرے۔

بلال کتنا ہی شریف، مہذب اور محتاط کیوں نہ سہی بہرحال ایک مرد تھا اور میں غرض اور اندھی محبت کی ماری ایک ایسی عورت جو پکے ہوئے پھل کی طرح کسی بھی لمحے بلال کی جھولی میں گرنے کو تیار تھی۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تردد نہیں کہ میں شیراز کو دوبارہ پانے کی خاطر اپنے مقام سے بہت نیچے گر گئی تھی اور ان دنوں جو کھیل کھیل رہی تھی تنہائی میں مجھے اس پر انتہائی کوفت ہوتی، خود اپنے سے گھن آنے لگتی اور شیراز سے بھی۔

پھر ایک روز وہ موقع آگیا جس کی میں منتظر تھی اور شیراز بھی!

بلال نے ہچکچاتے ہوئے مجھ سے کہا "میرے ایک پڑوسی نے مجھے عجیب سی بات بتائی ہے۔"

"وہ کیا؟"

بلال نے سر جھکا لیا اور ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا "آپ کے روزانہ یہاں آنے اور کئی کئی گھنٹے فلیٹ میں رہنے کو محلے والے کچھ معیوب نظروں سے دیکھ رہے ہیں..... اصل میں یہاں لوئر مڈل اور مڈل کلاس کے لوگ رہتے ہیں اس لیے یہ مسئلہ ہوا ورنہ اگر کسی خوش پوش علاقے میں رہ رہا ہوتا تو دن میں ایک ہفتہ بھی آپ آئیں میرے فلیٹ میں تو کوئی پوچھا نہ کرتا۔"

"کیا خوش پوش علاقوں میں رہنے والے اخلاقی اقدار و قیود کی پروا نہیں کرتے؟" میرے لہجے میں اعتراض کی بو تھی۔

"بات یہ نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ خوش پوش علاقوں میں رہنے والوں کی اپنی مصروفیات اتنی ہوتی ہیں کہ وہ دوسروں کی کھوج میں رہتے ہی نہ پروا کرتے ہیں۔"

"یعنی تمہیں دوسروں کی پروا ہے؟"

"مجبوراً کرنا ہوگی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں کل سے یہاں نہ آؤں؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر ایک گہری سانس لینے کے بعد بولا "آپ کے نہ آنے سے یہ ساری ترتیب جو آپ نے اس فلیٹ کی بے ترتیبی کو بخشی ہے، بکھر جائے گی۔"

"شادی کر لو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"ایک بات پوچھوں آپ سے؟" وہ محتاط لہجے میں بولا۔

"ضرور۔"

"بشرطیکہ آپ برا نہ منائیں۔"

"کبھی میں بہت زود رنج ہوا کرتی تھی بلال مگر اب چھوٹی موٹی باتیں میرے احساس کا بال بھی بیکا نہیں کرتیں۔ بلکہ بسا اوقات رنج پہنچانے والی بعض بڑی بڑی باتوں کو بھی میں ہنستے مسکراتے پی جاتی ہوں۔"

وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا "آپ اس طرح زندگی کب تک گزاریں گی؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ..... جوان ہیں، حسین ہیں، عورت ہیں..... تنہا کب تک رہ سکیں گی؟"

"تنہائی تو اب مقدر بن چکی ہے بلال ویسے بھی ایک مطلقہ عورت کا کیا مستقبل ہو سکتا ہے..... مطلقہ عورت کو تو لوگ ہمیشہ شک و شبے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔"

"یہ آپ کا خیال ہے۔"

"خیال نہیں، یہ حقیقت ہے اور اسی لیے مجھے اپنی موجودہ حیثیت سے خوف آنے لگا ہے، حالانکہ میں طے کر چکی تھی کہ اب کبھی کوئی مرد میری زندگی میں نہیں آئے گا مگر تنہائی کا عفریت اور لوگوں کی معنی خیز نگاہیں مجھے ڈسے لیتی ہیں۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا "تو گویا آپ

.... ؟" وہ پوچھتے پوچھتے رک گیا۔
"ہاں بلال... میں کسی شریف اور پرخلوص شخص کی تلاش میں ہوں۔" میں نے قصداً شرارت سے کہا۔

اس وقت تو وہ کچھ نہیں بولا لیکن رات کا اندھیرا چھا جانے کے بعد جب وہ حسبِ معمول مجھے اپنی اسکوٹر پر میری عارضی پناہ گاہ تک پہنچانے آیا تو اس نے مسز ہمدانی کے گھر سے ایک مخصوص فاصلے پر مجھے چھوڑ کر واپس جانے سے قبل کہا "مناسب سمجھیں تو میرے بارے میں سوچیے گا۔ خلوص کی کسوٹی پر کھوٹا نہ پائیں گی آپ مجھے۔"

نیم تاریکی میں نہ تو میں اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ پائی اور نہ وہ اس فاتحانہ مسکراہٹ کو دیکھ سکا ہوگا جو میرے لبوں تک عود کر آئی تھی!

پھر وہ چلا گیا۔

اگلے روز میں بلال کے فلیٹ پر تو نہ گئی تاہم فیراز سے حسبِ معمول ملاقات ہوئی۔ میں نے انھیں گزشتہ روز بلال سے ہونے والی گفتگو کا احوال سنایا تو وہ سگار سلگاتے ہوئے بولے "ویل ڈن مائی ڈارلنگ.... اویل ڈن۔"

"صرف تمھاری خاطر۔" میں نے کہا۔

مجھے اپنے اوپر غصہ آنے لگا کس قدر دیوانی ہوئی جا رہی تھی میں اس جفا جو مرد کے عشق میں!

"دل چھوٹا مت کرو.... ایک بار موقع ملنے دو مجھے ساری شکایتیں دور کر دوں گا تمھاری۔"

مگر یہ ایک شکایت تم کبھی دور نہ کر سکو گے راز کہ تمھاری ایک غلطی نے مجھے خود اپنی نظروں میں بھی کتنا بے وقعت کر کے رکھ دیا ہے۔ دل کی یہ بات میں زبان پر نہ لا سکی۔

پھر دو تین روز بلال سے کوئی بات نہ ہو سکی وہ مقررہ وقت پر آتا اپنا کام نمٹاتا اور حسبِ قاعدہ چار سوا چار بجے کے لگ بھگ واپس چلا جاتا۔ میں اپنے کیبن میں بیٹھی شیشے کے دروازے سے اسے آتا اور جاتا دیکھتی رہی۔ غالباً تیسرے یا چوتھے دن میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی دفتر سے خلافِ معمول جلدی نکل لی۔ زینہ اترتے ہوئے میں نے اسے پکارا تو وہ چونک کر پلٹا اور رک گیا۔

"کیا بہت جلدی میں ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"تو کیوں اتنی تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ رہے ہو۔ ایک وقت دو دو سیڑھیاں۔"

وہ مسکرا دیا پھر بولا "یہ تو میری عادت ہے۔"

"مڑ کر پیچھے آنے والوں کو بھی دیکھ لیا کرو۔"

اس کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی تھی اور میں سیڑھیاں اترتی اس کے نزدیک جا پہنچی تھی۔

"تم سے تین چار دن کے بعد ملاقات ہو رہی ہے۔" میں نے اگلی سیڑھی پر قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جی شاید۔" وہ میرا ساتھ دیتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔

"شاید نہیں یقیناً۔"

"جی یقیناً۔"

میں اس کی صلح پسندی پر مسکرا دی۔

"تم نے ایک جواب طلب بات کہی تھی مجھ سے۔"

"جی.... کہی تو تھی۔"

"اور بھول گئے!"

"جی نہیں بلکہ میں تو جواب کا منتظر رہا۔"

"آئندہ ایسی غلطی مت کرنا جواب کا انتظار نہیں کیا جاتا جواب طلب کیا جاتا ہے۔"

بقیہ دس بارہ قدم ہم خاموشی سے نیچے آگئے۔ راہداری میں وہ رک گیا اور اس نے میرے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کہا "اچھا.... تو سمجھ لیجیے کہ میں جواب طلب کر رہا ہوں۔"

"ہوں...." میں نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ پھر اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا "میں نے تمھارے بارے میں اچھی طرح سوچا ہے بلال اور....... میں راضی ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں بے یقینی ہلکورے لینے لگی پھر اس نے سر جھٹکا اور ہنس دیا۔

"لیکن کوئی شور شرابا نہیں جو کچھ ہوگا خاموشی سے ہوگا۔" میں نے مشروط انداز میں جتایا۔

"کیا میں یقین کر لوں؟"

"ہزار بار صد۔"

میں اس کی آنکھوں میں مسرت کی لہریں امڈتے دیکھ رہی تھی۔

اسی ہفتے ہم دونوں نے سادگی سے نکاح کر لیا۔
اب بجیا کو حالات سے لاعلم رکھنے کے لیے مسز ہمدانی

کیونکہ میری جانب سے پہلے کچھ عرصے میں کھنچی سی گئی تھیں۔ شاید
میں اپنا مزدوری تھا ان کا گھر چھوڑنے سے قبل جب میں
نے انھیں بتایا کہ میں اپنے دفتر کے ایک ساتھی سے نکاح
کر چکی ہوں تو کچھ دیر کو تو وہ میرا منہ دیکھتی رہ گئیں پھر بولیں۔
"ہاں! تمھارے رویے میں جو تبدیلی آئی تھی اس سے مجھے
بار بار یہی کھٹکا ہو رہا تھا کہ تم ضرور کسی چکر میں ہو۔"
"میرے لیے دعا کیجیے گا آپا۔"
"دیکھو! ایسے تو تم خود مختار ہو مگر میں یہ کہے بنا نہیں رہ
سکتی کہ تم نے اس ضمن میں مجھ سے غیریت اور رازداری برت
کر مجھے دکھ پہنچایا ہے۔"
"آئی ایم سوری آپا..." میں نے مسز ہمدانی کے گلے
میں اپنی باہیں حمائل کرتے ہوئے کہا۔ "اصل میں صورتِ حال
ہی کچھ ایسی تھی۔"
"اور یہ سب کچھ تم نے شیراز کے پاس واپس جانے
کے لیے کیا ہے؟" وہ نادم اور استفہامیہ لہجے میں بولیں۔
"میں آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔" میں نے سر جھکا
کر کہا۔
"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس موقع پر تم سے کیا کہوں؟
بہرحال اتنا ضرور کہوں گی کہ اسلامی احکامات و تعلیمات کے
سلسلے میں اپنی غرض کو مدِنظر رکھ کر منصوبہ بندی کرنا نیت کا
فتور ہے اور اسلام زندگی کے ہر معاملے میں نیت کی راستی کو
اہمیت دیتا ہے۔"
"میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا آپا۔"
"کیوں نہیں تھا... لعنت بھیجتیں شیراز پر اور کسی
شریف و نیک طینت آدمی کا ہاتھ تھام لیتیں۔ حلالہ کی اہمیت
اور اس کے جائز ہونے سے مجھے انکار نہیں ہے۔ اگر مقدر
کا ایسا سوئے اتفاق تمھیں شیراز کے پاس واپس لے جاتا تو
بات دوسری تھی مگر جو راستہ تم نے اختیار کرنے کی کوشش
کی ہے اسے تو میں عورت کی تذلیل سمجھتی ہوں۔ عورت انسان
ہے کھلونا تو نہیں کہ جب مرد نے چاہا اٹھا کر پھینک دیا اور جب
چاہا زمین سے اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ تمھاری جگہ میں ہوتی تو
ہرگز ہرگز ایسی حماقت نہ کرتی جیسی کہ تم کر رہی ہو۔"
"کاش! آپ نے کسی سے محبت کی ہوتی۔" میں یہ کہے
بنا نہ رہ سکی۔
"جو محبت آمادۂ ذلت و رسوائی ہو اسے میں محبت نہیں
جذباتیت کہتی ہوں۔"
میں چپ ہی رہی۔

"کیا تم نے اس شخص کو جس سے تم نے نکاح کیا ہے، بتا
دیا ہے کہ تم اس سے نکاح کیوں کر رہی ہو؟"
"جی نہیں... میں بھلا کیسے بتا سکتی تھی۔"
"لیکن کیا حرج تھا جب ایک باقاعدہ منصوبے کے
تحت تم نے اس سے نکاح کیا ہے تو وہ تو اس منصوبے کا کلیدی
کردار ہے۔"
"مجھے شرمندہ نہ کریں آپا۔"
"مجھے اس شخص پر ترس آ رہا ہے جس کا تمھارے ہاتھوں
استعمال ہوا ہے اور مزید ہو گا۔"
"آپا! ایک التجا ہے آپ سے۔"
"کہ میں نور کو اب بھی کچھ نہ لکھوں۔" مسز ہمدانی کی جہاندیدگی
نے میرے دل کی بات تاڑ لی۔
"وہ ناحق پریشان ہوں گی۔"
"اب مجھے افسوس ہو رہا ہے اور اپنی غلطی کا احساس
بھی کہ اگر میں نے اول روز نور کو سب کچھ لکھ دیا ہوتا تو شاید
حالات اتنی ابتر صورت نہ اختیار کرتے۔ سچی بات ہے مجھے
تو اس وقت شیراز کا تم سے ملنے کے لیے یہاں آنا ایک آنکھ نہ
بھایا تھا۔ جو مرد عورت کو چھوڑ چکا وہ محرم کہاں رہا اور اگر
وہ دونوں ملتے ہیں تو اخلاقی قیود کے پامال ہونے کا ہمیشہ
خطرہ رہتا ہے۔"
میں اضطراب کے عالم میں ایک ہاتھ کی انگلیوں سے
دوسرے ہاتھ کی انگلیاں چٹخانے لگی۔ مسز ہمدانی کو کیا پتا تھا
کہ میں شیراز سے روزانہ ملتی رہی تھی اور انھی کے ایما پر میں نے
جلال کے ساتھ یہ ناٹک کھیلا تھا!
"آپا! آپ بجیا کو کچھ نہیں لکھیں گی نا؟"
"ہاں! اس ضمن میں تو کچھ نہیں لکھوں گی اب۔ کیا وہ مجھ سے شکوہ
نہ کرے گی کہ اتنے دن سے میں نے کیوں نہ لکھا۔ مناسب تو یہی
ہے کہ تم خود ہی لکھنا۔"
"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے آپا۔"

ازدواجی رشتے میں منسلک ہو جانے کے بعد جلال
نے چاہا کہ میں ملازمت کو خیرباد کہہ کر گھر بیٹھ رہوں۔ مجھے
ذرا تردد تو نہ ہوا بلکہ میں نے ملازمت کو خیرباد کہہ دینا ناگزیر
سمجھا کیونکہ اسی طور میں شیراز سے ملنے کے لیے راہ نکال
سکتی تھی۔ دوپہر بارہ تا چار بجے سہ پہر جلال کو دوا خانے میں کام کرنا
ہوتا تھا۔ ان چار گھنٹوں کے علاوہ اس پر کوئی پابندی نہ تھی۔
گویا انھی چار گھنٹوں کے دوران کسی وقت میں شیراز سے ملنے

کے لیے وقت نکال سکتی تھی۔
مہینہ بھر پلک جھپکتے گزر گیا۔
بلال بے حد مسرور تھا۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ بظاہر سیدھا سادا سا شریف، مہذب اور محتاط نظر آنے والے اس شخص کے پیچھے ایسا طرار، شوخ اور بے باک مرد چھپا بیٹھا ہوگا۔ آرٹسٹ ہونے کے ناتے اس کا رنگین مزاج اور رومان پسند ہونا یقینی تھا۔ حجاب اور تکلف کا پردہ اٹھتے ہی وہ فرہاد و مجنوں کا ہمسر ہو بیٹھا۔ باوجود اس کے کہ ان دنوں سندھ کے ایک جاگیردار نے اپنی حویلی کی تزئین نو کے لیے اپنے آباؤ اجداد کی تصاویر بنوانے کا کام خاصے معقول معاوضے پر اسے دے رکھا تھا، وہ بہت کم وقت اپنے اسٹوڈیو میں گزارتا۔ اسٹوڈیو میں جاتا تھوڑی دیر کام کرتا پھر میری طرف چلا آتا اور اپنی وارفتہ نگاہوں اور والہانہ مسکراہٹ سے میرا گھیراؤ کر لیتا۔ میں بے بس ہو کے رہ جاتی اور اس کی وارفتہ نگاہوں سے نظریں چراتے ہوئے جی ہی جی میں سوچتی۔
"اب کیا ہوگا؟"
ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ روایتی مشرقی بیویوں کی طرح اسے دفتر جانے کے لیے خدا حافظ کہنے کے بعد میں جلدی جلدی گھر کے دھندے نپٹاتی، اسٹوڈیو کی صفائی ستھرائی کرتی اور ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ سج دھج کر ریلوے کراسنگ کا رخ کرتی۔ پل کے نیچے کراسنگ کے اس پار شیراز اپنی گاڑی کے رنگین شیشے چڑھائے میرے منتظر ہوتے۔ میں بہ عجلت تمام گاڑی میں بیٹھ جاتی اور شیراز قریب ہی واقع ایک میدان کا رخ کرتے۔ سرکلر ریلوے اسٹیشن کے عقب میں گھنے درختوں تلے گاڑی کھڑی کر کے وہ مجھ سے "تازہ ترین" صورت حال کی بابت استفسار کرتے ہوئے کبھی کبھی مجھے اتنی گہری اور معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگتے کہ مجھے کوفت ہونے لگتی۔ مجھے یوں لگتا جیسے میرے چہرے پر، میری آنکھوں میں، میری مسکراہٹ کے پیچھے وہ بلال کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ایک دو بار تو انھوں نے مجھ عجیب سے لہجے میں ایسی بات کہی کہ میں جھنجلا کے رہ گئی۔ مجھ سے تازہ ترین رپورٹ لینے کے بعد شیراز مجھے پل کے نیچے ریلوے کراسنگ کے نزدیک چھوڑ دیتے۔ میں چار سو جائزہ لینے کے بعد بصد احتیاط ان کی گاڑی سے اترتی اور بلال کے فلیٹ کی طرف چل دیتی۔ پلاسٹک کی ایک باسکٹ میرے ہاتھ میں ہوتی تاکہ خدانخواستہ بلال مجھ سے پہلے گھر پہنچا ہوا ہو یا راستے میں ٹکرا جائے تو میں بتا سکوں کہ خریداری کے لیے مارکیٹ گئی تھی مگر مہنگائی یا کسی اور باعث خالی ہاتھ واپس آگئی ہوں۔
مسز ہمدانی کی جانب سے یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ وہ بیبا کو کچھ نہیں لکھیں گی میں نے بیبا کو لکھ دیا تھا کہ میں نے ملازمت چھوڑ دی ہے اب وہ مجھے گھر کے پتے پر خط لکھ سکتی ہیں۔ شیراز کے توسط سے مجھے ان کا ایک خط مل چکا تھا۔
مگر شیراز نے تو چار پانچ دن بعد ہی یہ تقاضا کر دیا تھا کہ اب مجھے بلال سے نظریں بدل لینا چاہئیں اور موقع پاتے ہی طلاق کا مطالبہ کر دینا چاہیے لیکن ایک ماہ سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود میں نہ تو بلال سے نظریں بدل سکی تھی نہ طلاق کا مطالبہ کرنے کی ہمت کر پائی تھی۔ نظریں بدلنے کا سوال اس لیے نہ تھا کہ میں بلال سے نظریں ملا ہی کہاں پائی تھی جو بدل سکتی اور طلاق کا مطالبہ کر دینا اس قدر آسان نہ تھا۔ میں تو بلال کی روز افزوں وارفتگی سے سہمی ہوئی تھی!
گزشتہ چار پانچ دن سے شیراز روزانہ ملاقات پر مجھ سے ایک ہی سوال پوچھ رہے تھے۔
"تم نے بات کی اس سے؟"
اور میں ہر روز ان کے اس سوال کا نفی میں جواب دے رہی تھی۔
اس روز پھر انھوں نے وہی سوال پوچھا اور میرا جواب نفی میں پا کر جھنجلاتے ہوئے بولے "کیوں نہیں کر رہیں تم اس سے طلاق کا مطالبہ؟"
"ہمت نہیں ہوتی۔"
"ہمت نہیں ہوتی یا تم ہمت کرنا نہیں چاہتیں!"
شیراز کے لہجے کی کاٹ نے مجھے چونکنے اور ان کی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ مجھے بڑی عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔
"لگتا ہے وہی نہیں تم بھی مر مٹی ہو اس پر۔"
"پلیز!" میں نے تڑپ کر کہا۔
"اب میں اور انتظار نہیں کر سکتا۔"
"میں بھی کیا کروں؟" میں نے بے بسی سے کہا۔
"صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں تم اس سے کہ تم اس سے طلاق حاصل کرنا چاہتی ہو؟"
"کیا وہ سبب نہ پوچھے گا مجھ سے؟"

"پلیز مجھے تو بتا دو۔"

"کیا....؟ کیا بتاؤں؟"

"یہی کہ تم نے اس سب سے محض اس لیے شادی کی تھی کہ تم اپنے گھر واپس جانا چاہتی تھیں۔"

"اوہ....!" میں نے اپنا سر بے بسی سے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" ان کا لہجہ اور تیکھا ہو گیا۔

"تم....تم.... نہیں.... سمجھ سکتے رازی۔"

"لگتا ہے کہ تم خود اسے نہیں چھوڑنا چاہتیں۔"

"یہ.... یہ تم کہہ رہے ہو رازی.... تم! جس کی خاطر میں نے خود کو داؤ پر لگا دیا ہے۔"

"بس تو ختم کرو اب یہ قصہ.... کہہ دو کہ میں طلاق چاہتی ہوں۔"

"رازی! وہ اس قدر سیدھا سادا نہیں ہے جتنا کہ ہمارا اندازہ تھا۔ مجھے اس سے بہت سنبھل کر، بڑی احتیاط سے بات کرنا پڑے گی.... مجھے سوچنا پڑے گا کہ میں اس سے طلاق کا مطالبہ کیوں کر کروں۔"

شیراز کا منہ بن گیا تھا۔ وہ خفا خفا سے نظر آ رہے تھے۔

"الٰہی کس مشکل میں گرفتار ہو گئی ہوں میں!" میں نے بے بسی سے سوچا۔

دن کا بقیہ حصہ انتہائی کوفت میں گزرا۔

شام کے وقت جب بلال اسٹوڈیو میں مصروف کار تھا اور میں اس کے لیے باورچی خانے میں کھڑی چائے بنا رہی تھی۔ دودھ کی پتیلی چولہے پر دھری تھی۔ دوپہر کو شیراز کی زبان سے ادا ہونے والے چند تکلیف دہ الفاظ نے مجھے آ گھیرا۔ خیالات کی پگڈنڈیاں اتنی دور نکل گئیں کہ مجھے ہوش ہی نہ رہا کہ کب دودھ اُبل اُبل کر پتیلی سے گرنے لگا اور کب بلال میرے عقب میں آ کھڑا ہوا۔ میں تو اس وقت چونکی جب بلال کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"مینی! یہ دودھ اُبل رہا ہے یا کوئی نیا گر آ گیا جو آپ اس قدر محویت سے دیکھ رہی ہیں۔"

"اس.... ہاں....!" میں چونکی اور میں نے دودھ کی دیگچی کی جانب ہاتھ بڑھائے مگر بلال نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیے اور مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کو شاید اپنے ہاتھوں کے جل جانے کی پروا نہ ہو مگر مجھے ہے۔"

میں کیسے بتاتی اسے کہ میرا تو تن من جل رہا تھا!

پھر بلال نے میرا دایاں ہاتھ چھوڑ کر چولہا بجھا دیا اور میری کمر کے گرد اپنا بازو حمائل کرتے ہوئے مجھے سہارا دیتے کمرے تک لایا اور مجھے بڑے پریم سے مسہری پر بٹھانے کے بعد میرے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کیا بات ہے آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں؟"

"کیا مجھے صاف صاف کہہ دینا چاہیے؟" میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

"ہاں!" میرے تصور میں ابھرنے والے شیراز کے چہرے نے کہا۔

میں نے بے بسی سے بلال کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے مخمور نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"میں نے کئی بار یہ بات نوٹ کی ہے کہ کبھی کبھی آپ کچھ الجھی الجھی اور پریشان سی نظر آنے لگتی ہیں، کیوں؟" وہ بولا۔

"نہیں.... نہیں تو....!" میں نے گھبرا کر کہا۔

اس نے ایک گہری سانس لی پھر میرے شانوں پر اپنا بازو دراز کرتے ہوئے بولا۔ "مینی! میں جانتا ہوں آپ نے زندگی کا بڑا پُر آسائش روپ دیکھ رکھا ہے۔ زندگی کا یہ روپ جو آپ اس گھر میں دیکھ رہی ہیں آپ کو یقیناً بڑا ہی تکلیف دہ محسوس ہو رہا ہوگا۔ میں کوشش کروں گا کہ اسے تھوڑا بہت نکھار دے سکوں۔"

"یہ.... یہ.... بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟" وہ قدرے اداس ہوتے ہوئے بولا۔

اس کے اس سوال کا جواب میرے حلق میں پھنس کے رہ گیا۔

"میں.... میں.... تمہارے.... لیے.... چائے.... بنا دوں....!" میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ آپ آرام کریں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے مجھے دونوں شانوں سے پکڑ کر بستر پر لٹا دیا۔ میں روبوٹ کی طرح چت پڑ گئی۔

"آپ اٹھیں گی نہیں، چائے میں خود بنا کر لاتا ہوں آپ کے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔"

وہ باورچی خانے کی طرف چلا گیا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک ریلا دیوانہ وار کنپٹیوں کے سہارے میری

الجھی زلفوں کی جانب بڑھ نکلا۔
رات کو بلال میرے نزدیک بیٹھا میری الجھی زلفوں کے پیچ میں اپنی انگلیاں گھماتے ہوئے مستقبل کی باتیں کرتا رہا۔

اگلی صبح میں حسبِ معمول بلال کے بیدار ہونے سے بہت پہلے جاگ گئی۔ بلال دن چڑھے جاگنے کا عادی تھا۔ گھر کی صفائی ستھرائی کے بعد میں آئینے کے روبرو کھڑی بال سلجھا رہی تھی کہ بلال مسکراتا ہوا میرے عقب میں آکھڑا ہوا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے شانوں کو دبوچتے ہوئے میرے بالوں میں اپنا منہ چھپا کر ایک لمبا سانس کھینچا۔ میں کسمسائی اور میں نے دور ہٹنے کی کوشش کی مگر میرے شانوں پر اس کی گرفت بدستور رہی۔ میں نے گردن موڑ کر بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔
"تم مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"
وہ میرے اس سوال کے پیچھے چھپے تقاضے سے یکسر بے پروا مست دیے خود منظر آتا تھا۔
"پلیز! چھوڑ دو مجھے۔" میں گڑگڑائی۔
اس کی آنکھوں میں ہلکا سا مارتے خمار کی جگہ تذبذب کی ایک اونچی لہر ابھری۔
"اگر نہ چھوڑوں تو؟"
"تو میرا دم گھٹ جائے گا۔"
اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا پھر کچھ کہے سنے بنا میرے شانوں پر سے اپنے ہاتھ ہٹا لیے اور باتھ روم کی جانب مڑ گیا۔ میں ادراک الجھ گئی!
"بلال نے کوئی مزاحمت کوئی سوال کیوں نہیں کیا؟" میں نے اضطراب کے عالم میں سوچا۔
بات ادھوری کی ادھوری رہی تھی۔

اس روز جب حسبِ دستور میں شیراز سے ملی تو شیراز نے پوچھا "تم نے بات کی اس سے؟"
"کی تو تھی مگر وہ سمجھا ہی نہیں۔"
"کیا کہا تھا تم نے؟"
"میں نے کہا تم مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے..."
"پھر؟"
"اس نے کہا نہ چھوڑوں تو؟"
"اور تم چپ ہو گئیں؟"
"نہیں.... میں نے کہا میرا دم گھٹ جائے گا۔"

ایک صاحب جیسے ہی میوزیم میں داخل ہوئے، محافظ نے انہیں روک لیا۔
"ماچس یا لائیٹر وغیرہ گارڈ روم میں چھوڑ جائیے جناب۔"
"لیکن میرے پاس ماچس یا لائیٹر نہیں ہے۔ میں سگریٹ نہیں پیتا۔" ان صاحب نے جواب دیا۔
"تب پھر آپ اندر نہیں جا سکتے۔" محافظ بولا۔ "ہمیں سختی سے ہدایت کی گئی ہے کہ سگریٹ یا لائیٹر گارڈ روم میں چھوڑے بغیر کوئی شخص اندر داخل نہیں ہو سکتا۔"

"اوہ مائی گاڈ!" شیراز مٹھیاں بھینچتے ہوئے بڑبڑائے۔ "اس قدر پہیلیوں میں بات کرنے کی کیا ضرورت تھی صاف صاف کہہ دیتیں کہ تم اس سے طلاق چاہتی ہو اور بس۔"
"یہ اس قدر آسان نہیں ہے رازی۔" میں نے بے بسی سے کہا۔
"مشکل بھی کیا ہے؟"
"مشکل یہ ہے کہ اگر وہ سبب پوچھ بیٹھا تو میں کیا کہوں گی؟"
شیراز نے ڈیش بورڈ پر دھرا ایک خاکی لفافہ اٹھا کر اس میں سے ایک تصویر نکالی۔ یہ میری اور ان کی ایک یادگار تصویر تھی۔ ہماری شادی کی پہلی سالگرہ کی تصویر۔ ان کی آن انھوں نے اس تصویر کے دو ٹکڑے کر دیے اور اس طرح کہ ایک ٹکڑے پر میری تصویر تھی اور دوسرے پر خود ان کی۔
"یہ کیا کیا آپ نے؟" میں نے پوچھا۔
"تمھاری مشکل آسان کرنے کی کوشش۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولے پھر انھوں نے وہ دونوں ٹکڑے میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ان دونوں ٹکڑوں کو تم اس کے سامنے رکھ کر کہنا پلیز! انھیں ملا دیجیے۔ وہ حیرانی سے تمھاری طرف دیکھے گا تم کہنا قسمت نے ہمیں جدا کر دیا تھا آپ ہمیں ملا سکتے ہیں۔ بس یوں بات شروع ہو جائے گی.... کیا سمجھیں؟"
میں نے تصویر کے دونوں ٹکڑے ان سے لیے اور اپنے پرس میں رکھ لیے۔

اگلے روز ہفتہ وار تعطیل تھی۔ بلال سارا دن گھر ہی پر رہا اور میں اس سے نظریں چراتی گھر کے مختلف کاموں میں مصروف نظر آنے کی کوشش کرتی رہی حالاں کہ میرے دل

دماغ میں جوار بھاٹا سی کیفیت تھی۔ بلال اسٹوڈیو میں مصروف کار رہا لیکن حسب عادت ہر تھوڑی دیر بعد مجھے بلاتا یا خود میرے پاس اٹھ کر آتا جاتا رہا۔ شام کو اپنا اسباب تھوڑی سمیٹنے کے بعد جب وہ اسٹوڈیو سے باہر نکلا تو میں کپڑوں پر استری کر رہی تھی۔

"ہمیں باہر چلنے کا موڈ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"بس یونہی۔"

اس نے سوئچ آف کر دیا اور مجھے بازوؤں سے پکڑ کر میرا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے بولا: "آپ مجھ سے شادی کر کے خوش نہیں ہیں..... ہے نا؟"

میرے لبوں کے گوشے کپکپانے لگے۔

"میرے التفات ہی بار تھی تو قابلِ اعتنا کیوں سمجھا مجھے!" وہ بھرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"چھوڑ دو..... چھوڑ دو مجھے۔" میں نے اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

"میں نے سوچا تھا جتنی خوبصورت آپ ہیں اتنا ہی خوبصورت آپ کا دل بھی ہوگا مگر آپ.....! آپ بھی عام عورتوں کی طرح آسائشوں کی متمنی نکلیں۔ اس چھوٹے سے گھر میں آپ کا جی نہیں لگتا..... اکتائی اکتائی سی رہتی ہیں آپ۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آپ کے پاس آتا ہوں اور آپ مجھے دور ہٹاتی ہیں۔ میرے ہاتھ جھٹک دیتی ہیں....." اس نے پل بھر کو توقف کیا پھر مدہم سُروں میں بولا: "مجھے کچھ مہلت تو دیجیے جو کچھ میرے اختیار میں ہوگا آپ کے لیے کر گزرنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ مڑا اور تیزی سے اسٹوڈیو میں جا گھسا۔ میں اپنا سر ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گئی۔

تادیر فلیٹ میں موت کا سا سناٹا چھایا رہا۔ پھر میں اپنے تمام قویٰ مجتمع کر کے اٹھی، پرس میں سے تصویر کے دونوں ٹکڑے نکالے اور بلال کے پاس جا پہنچی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے بیٹھا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ اس کا چہرہ ذہنی ہیجان کا غماز نظر آتا تھا۔ میں کسی مجرم کی طرح سر جھکائے آگے بڑھی اور اس کے نزدیک پہنچ کر لرزتے ہاتھوں سے پھٹی ہوئی تصویر کے دونوں ٹکڑے اس کے سامنے کرتے ہوئے لرزتی آواز میں کہا۔

"پہچانا انھیں طلعت؟"

اس نے تصویر کے دونوں ٹکڑوں کو دیکھا اور یوں چونکا جیسے لوہے کی تپتی ہوئی سلاخیں اس کی دونوں آنکھوں میں جھونک دی گئی ہوں۔

"تم مقتدر ہو بلال..... پارہ پارہ تصویر کو بھی جِلا دے سکتے ہو۔ ماند پڑ جانے والے رنگوں کو نئی زندگی دے سکتے ہو..... مٹ جانے والے نقوش کو اجاگر کر سکتے ہو..... پلیز! اس تصویر کو بھی جوڑ دو..... ملا دو انھیں جنھیں مقدر کے بے رحم ہاتھوں نے جدا کر دیا تھا۔" میں جذبات کی رو میں بولتی چلی گئی اور مجھے یوں لگا جیسے میرے سینے پر دھری بھاری سِل ہٹ گئی ہو۔

وہ ہکا بکا کبھی مجھے کبھی تصویر کے دو ٹکڑوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے کشمکش کے عالم میں کہا: "یہ..... یہ..... کیسا مذاق ہے!"

"یہ مذاق نہیں ہے بلال..... یہ تو ایک المیہ ہے....."

میں نے کٹہرے میں کھڑے مجرم کی طرح سر جھکا کر اعتراف کیا: "مجھے افسوس ہے بلال کہ میں نے مصلحتاً تم سے حقیقت چھپائی۔ میں شیراز کے پاس واپس جانا چاہتی تھی اور واپسی کے لیے میرے پاس واحد راستہ یہی تھا۔ میں اس کڑے مرحلے سے گزر گئی ہوں۔ میں شیراز سے پیار کرتی ہوں اور ان کے پاس واپس جانا چاہتی ہوں..... پلیز! مجھے آزاد کر دو۔"

دل کا بوجھ اتار دینے کے بعد میں بلال کی جانب دیکھنے کی ہمت کر سکتی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ دھواں دھواں تھا اور آنکھوں میں دہشت سی امڈ آئی تھی۔

"کیا آپ کو احساس ہے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں اور کس سے کہہ رہی ہیں!" اس کے تیور تنبیہی تھے۔

"ہاں..... میں جانتی ہوں..... مجھے..... اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ اس وقت میں کلیتاً تمھارے اختیار میں ہوں۔ تم اگر چاہو تو مجھے آزاد کر سکتے ہو اور چاہو تو سولی پر لٹکا سکتے ہو۔ مجھے آزاد کر دو..... پلیز!" میں نے لجاجت سے کہا۔

اس نے ایک گہرا سانس لیا پھر زخمی نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا: "قرۃ العین بیگم! اگر آپ کسی کو دوبارہ پانے کے لیے کٹھن مراحل سے گزر سکتی ہیں تو یقین رکھیے کہ کوئی سر پھرا ایسا بھی ہے جو آپ کو پا کر کھونے کے لیے کٹھن مراحل سے نہیں بلکہ کسی بھی آزمائش سے گزر جانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں کسی حتمی فیصلے کی طرح بکھر جانے والی سُرخی نے مجھے خائف کر دیا۔

"چلیں! پھر چلیں!" میں کچھ کھوئی کھوئی سی یہ سوچ رہی تھی کہ میں اس سے کیسی عجیب سی التجا کر رہی تھی۔

اس نے فیصلہ کن انداز میں میری طرف دیکھا اور بولا۔ "محترمہ یاسمین بیگم! اب کچھ لمحوں پیشتر آپ میری محبت تھیں، مگر اب انا اور غیرت کا سوال بن گئی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ نے جو کھیل میرے ساتھ کھیلنے کی کوشش کی ہے اس میں آپ کے سابق شوہر کو یقین دلانا ضرور شامل ہے کہ وہ آپ کو ایک مرتبہ پھر قبول کرنے پر آمادہ ہے لیکن آپ یہ بھول گئی ہیں...... " وہ پل بھر کو رُکا پھر اس نے لفظ چبا چبا کر کہے "کہ اس کھیل میں خواہ جیت آپ کے مقدر میں لکھی گئی ہے تو میں آسانی سے شکست نہیں کھانے والا۔ میں ان مردوں میں سے نہیں جو عورت کو اپنے ہاتھوں سے گزرتے دیکھتے ہیں اور خود خاموش تماشائی بنے کھڑے رہتے ہیں۔ میں ان مردوں میں سے ہوں جو خود قیامت سے ٹکرا جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں.....!" وہ آگے بڑھا اور اس نے ہیجان کے عالم میں میرے دونوں ہاتھ اس شدت سے دبوچ لیے کہ میں تڑپ کر رہ گئی۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا "میں کسی قیمت پر آپ کو آزاد نہیں کروں گا۔"

پھر اس نے ایک شدید جھٹکے کے ساتھ میرے بازو چھوڑ دیے۔ میں لڑکھڑا کر اتنی چھوٹی دیوار سے جا ٹکرائی۔ وہ پاؤں پٹختا اسٹوڈیو سے باہر نکل گیا۔ پھر چند لمحوں بعد فلیٹ کا بیرونی دروازہ کھلنے اور پوری شدت سے بند کر دینے کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں گھبرا کر اسٹوڈیو سے باہر نکل آئی اور دیوانہ وار فلیٹ کا گوشہ گوشہ دیکھنے لگی۔ وہ باہر جا چکا تھا۔

ان گنت خدشات زہریلے سانپوں کی طرح میرے ذہن میں رینگنے لگے۔ خوف کی ایک لہر میرے دل سے اٹھی اور پورے جسم میں پھیل گئی۔ اس کے جارحانہ تیور میری کشیدہ تیوریوں میں مزید اضافے کا پیش خیمہ تھے۔ ایک بھیانک خیال کو زہریلے سانپ کی طرح میرے ذہن میں لہرایا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے مار ڈالے۔"

میں بالکونی کی طرف دوڑی اور میں نے نیچے دیکھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا پارکنگ شیڈ کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے آہنی قدم مجھے ڈراتے اور سہماتے تھے۔ مرد کا کیا اعتبار! اگر ایک مرد مجھے میری ذرا سی خطا اور حکم عدولی پر صلیب پر چڑھا سکتا ہے تو دوسرا غیرت اور انا کو اپنے جنون کا جواز بنا کر میری گردن بھی اڑا سکتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ دیر اور میں اس مجوس فلیٹ میں ٹھہری رہی تو پھر کبھی وہاں سے زندہ سلامت نہ نکل پاؤں گی۔ میں نے جلدی جلدی اپنے کپڑوں کے چند جوڑے پلاسٹک کے ایک تھیلے میں ٹھونسے، بیگ اٹھایا اور فلیٹ سے باہر نکل آئی۔ دروازے کی کنڈی چڑھانے کے بعد میں عجلت تمام زینے سے نیچے اتری اور پہلو بہ پہلو ایستادہ عمارتوں کے بیچ سے گزرتی بالآخر چار نمبر کی طرف نکل آئی۔ سڑک عبور کر کے میں نے ایک پبلک کال آفس تلاش کیا اور شیراز کو فون کیا۔ خوش قسمتی سے وہ گھر ہی پر تھے۔ میری آواز سنتے ہی انھوں نے چونک کر پوچھا۔

"خیریت!"

"شازی! تم فوراً میرے پاس پہنچو۔ میں دس نمبر پر پوسٹ آفس کے نزدیک تمھاری منتظر ہوں۔"

"اتنی پریشان کیوں محسوس ہو رہی ہو؟"

"پلیز! تم آ جاؤ فوراً..... پھر بتاؤں گی۔"

"آل رائٹ..... آتا ہوں۔"

کافی دیر میں کال آفس ہی میں بیٹھی رہی۔ پھر جب مجھے یقین ہو گیا کہ شیراز کو گھر سے نکلے دیر ہو چکی ہوگی تو میں باہر نکلی اور پوسٹ آفس کی طرف چل دی۔ آسمان سے اترتا اندھیرا مصنوعی روشنیوں سے نبرد آزما تھا۔

شیراز کو پہنچنے میں دیر ضرور ہوئی لیکن بالآخر وہ میری سب سے بڑی ڈھارس بن کر آ پہنچے۔

"کیا ہوا؟" انھوں نے میرے گاڑی میں بیٹھتے ہی پوچھا۔

"پہلے گاڑی کسی محفوظ مقام پر لے چلیں۔"

"محفوظ مقام پر!"

"ہاں۔"

"کیا یہ غیر محفوظ ہے؟"

"پتا نہیں... بس مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کچھ بتاؤ تو سہی۔"

"آپ گاڑی یہاں سے کہیں اور لے چلیں پھر بتاتی ہوں۔ ایسا کریں کریم آباد سے نارتھ کی طرف چلیں۔" [illegible]

پانچ منٹ میں ہم رشید ترابی روڈ پر نکل آئے تھے۔

ضیاءالدین اسپتال کے نزدیک میں نے شیراز سے کہا "بس یہاں روک لیں۔"
انھوں نے گاڑی پختہ سڑک سے کچے راستے پر اتار کر روک لی۔
"اب تو بتاؤ گی یا یہاں بھی نہیں؟"
"بتاتی ہوں۔"
وہ ہمہ تن گوش ہو بیٹھے۔
"میں نے بلال سے طلاق کا مطالبہ کر دیا ہے۔"
"ویل ڈن!"
"مگر......"
"مگر کیا؟"
"وہ تو بپھر گیا اور بولا میں کسی قیمت پر تمھیں آزاد نہیں کروں گا۔"
"تم نے کیا کیا تھا؟"
"وہی طریقہ استعمال کیا تھا جو آپ نے بتایا تھا، تصویر والا۔"
"پھر تم نے اسے بتا دیا کہ تم نے اس سے شادی کیوں کی تھی؟"
"ہاں مگر وہ تو بگڑ گیا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ مجھے اس کے تیور اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں دہشت کے عالم میں وہاں سے بھاگ آئی۔"
"ویل ڈن!" وہ میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولے۔
"لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے مازی۔"
"کس بات سے؟"
"وہ بہت غصے میں تھا۔"
"ڈونٹ وری۔"
"اب کیا ہوگا مازی؟"
"ہونا کیا ہے، وہ تمھیں طلاق دینے پر مجبور ہوگا۔ میں کل ہی کسی وکیل سے رابطہ قائم کرتا ہوں۔"
"مگر اس نے تو طلاق دینے سے صاف انکار کر دیا ہے۔"
"سو واٹ! اگر وہ طلاق نہیں دینا چاہتا نہ دے۔ خلع حاصل کرنا تو تمھارا حق ہے۔ تمھاری جانب سے خلع کی درخواست مقامی عدالت میں داخل کرائے دیتے ہیں، پھر ایسا کریں گے اور بیٹھ کر تماشا دیکھیں گے اس کنگال آرٹسٹ کا۔"
"تو مجھے عدالت بھی جانا پڑے گا؟"
"ہاں جب ضرورت ہوگی جانا تو پڑے گا لیکن تمھیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"
"اور سب کچھ ٹھیک ہونے تک میرا ٹھکانا؟"
شیراز سوچ میں پڑ گئے پھر بولے "موجودہ حالات کے پیشِ نظر میں تم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ گھر چلو کیوں کہ اگر اس کنگال آرٹسٹ نے اپنی اوقات بھول کر ہمارے منہ لگنے کی کوشش کی تو تمھارا میرے ساتھ رہنا ہمارے خلاف اس کے حق میں ایک اہم پوائنٹ بن جائے گا بلکہ تم ایک بات نوٹ کر لو کہ اب جب تک اس سے گلو خلاصی نہیں ہو جاتی، تم بھولے سے بھی کسی کے سامنے یہ بات زبان پر نہیں لاؤ گی کہ تم اس سے خلع حاصل کر کے میرے پاس آنا چاہتی ہو۔"
"مگر بلال سے تو میں نے کہہ دیا۔"
"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے وہ اس نکتے کو تمھارے خلاف بنیاد بنانے کی کوشش کر سکتا ہے مگر تم کہہ سکتی ہو کہ یہ محض اس کا قیاس ہے، ایسی کوئی بات نہیں۔"
"خلع کی درخواست میں خلع حاصل کرنے کے لیے کس بات کو جواز بنایا جائے گا؟"
"یہ وکیل کا ہیڈیک ہے بھئی ہمارا نہیں۔ وکیل ایک نہیں، سو جواز نکال لیتے ہیں۔"
"وہ سوال تو وہیں رہ گیا کہ میرا ٹھکانا کہاں ہوگا؟"
"ایک دو دن کی مہلت دو، دیکھ کر کرائے پر کوئی فلیٹ لے دیتا ہوں تمھیں۔"
"جہاں مجھے اکیلے رہنا ہوگا؟" میں نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔
"ہاں دن میں تو تنہا ہی رہنا پڑے گا۔" شیراز نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
"میں کسی قیمت پر تنہا نہ رہ سکوں گی، مجھے ڈر لگے گا۔"
"تو پھر؟"
میں نے بادل ناخواستہ کہا "مجبوراً مجھے مسز بھرانی کے ہاں جانا پڑے گا۔"
"چلو میں چھوڑ دوں تمھیں وہاں تک۔"
"مگر مشکل یہ ہے کہ مجھے ان کو سب کچھ بتانا ہوگا۔"
"ظاہر ہے۔" وہ بڑے آرام سے بولے۔
"چلیں؟"
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
راستے بھر شیراز باتیں کرتے رہے اور میں ان کی باتیں

سنتی رہی، بولتی بھی رہی مگر میرا ذہن بڑی طرح الجھ رہا تھا۔ مسز ہمدانی کے گھر سے کچھ فاصلے پر مجھے ڈراپ کرتے ہوئے شیراز نے پوچھا۔

"کل ملاقات کہاں ہوگی؟"

"آپ کل کسی وقت فون کر لیجیے گا مجھے۔"

"اور اگر تمھاری خوفناک سی آپا نے فون پر میرا سوگت کیا تو؟"

"انھیں میں اعتماد میں لینے کی کوشش کروں گی کیوں کہ اس کے بنا کام نہیں چلے گا۔"

"مگر ذرا احتیاط سے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور دروازہ کھول کر گاڑی سے اُتر گئی۔

مسز ہمدانی کو اعتماد میں لینے کی خاطر مجھے جلد صورت حال ان کے گوش گزار کرنا پڑی۔ تاہم میں نے داستان کا یہ حصہ ان سے پنہاں رکھا کہ جلال کی زوجیت میں رہتے ہوئے بھی میں جلال سے چوری چھپے روزانہ شیراز سے ملتی رہی تھی۔ میں نے مصلحتاً یہ بھی نہیں بتایا کہ اس وقت بھی شیراز مجھے چھوڑ کر گئے تھے۔ مسز ہمدانی ساری کتھا سننے کے بعد تاسف سے بولیں: "بی بی! مجھے ڈر تھا کہ تم کنویں سے نکل کر کھائی میں جا گرو گی اور وہی ہوا۔ موجودہ شوہر کے سامنے یہ اعتراف کر لینے کے بعد کہ تم نے اس سے محض اس لیے شادی کی تھی کہ تم اپنے سابقہ خاوند کے پاس جانا چاہتی تھیں، تم نے اس کا اعتماد تو یکسر کھو دیا ہے اور اب جیسا کہ تم بتا رہی ہو کہ اس نے طلاق دینے سے صاف انکار کر دیا ہے، وہ تمھیں طلاق بھی مشکل ہی سے دے گا۔ سچی بات یہ ہے بی بی کہ اسے شدید صدمہ پہنچا ہوگا کوئی بھی شریف، غیرت مند اور باضمیر مرد اپنی بیوی کی زبان سے دوسرے مرد کا نام سننا برداشت نہیں کر سکتا۔ گناہ یہ کہ عورت اس سے یہ کہہ دے کہ اس کی حیثیت تو محض تھی۔ نہیں بی بی! تم نے اچھا نہیں کیا۔ طلاق لینا ہی تھی تو شیراز کا ذکر تو نہ کرتیں۔ اب تو وہ چڑ گیا ہوگا۔ آسانی سے طلاق نہیں دے گا۔"

"آپا! خلع حاصل کرنا تو میرا حق ہے۔"

"یعنی مقدمہ کچہری کرو گی؟"

"شیراز سے مشورہ کرنا پڑے گا۔"

"بی بی! مجھے تو تمھارے مقدر پر افسوس ہوتا ہے۔"

افسوس تو خود مجھے بھی تھا!

مسز ہمدانی کی زبان سے ہمدردی کے دو بول سنتے تو بے اختیار میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"آپا! آپ نے پہلے بھی مجھے پناہ دی تھی اب پھر آپ کے پاس پناہ لینے آئی ہوں۔ بس کچھ دن اور رہ گئے ہیں مصیبت کے ساری سوئیاں نکل گئیں صرف آنکھوں کی نکلنا باقی ہیں۔"

"آنکھوں کی سوئیاں آسانی سے نہیں نکلا کرتیں بی بی۔"

"میں جانتی ہوں آپا۔"

"خداوند کریم تمھارے حال پر رحم فرمائے اور تمھیں اس منجدھار سے نکالے۔"

"کیا میں آپ کے پاس پناہ حاصل کر سکوں گی آپا؟"

"بی بی! میں پناہ دینے والی کون۔ اس گھر کو تم اپنا ہی گھر جانو۔"

"شکریہ..... میں آپ کا یہ احسان تاحیات نہ بھولوں گی..... ہاں آپا ایک بات اور....."

"ہاں کہو۔"

"وہ..... آپا....." میں ہچکچائی۔

"کہو بی بی۔"

"کیا میں شیراز سے مشورہ کرنے کے لیے انھیں یہاں بلا سکتی ہوں؟"

مسز ہمدانی کچھ دیر سوچتی رہیں پھر نیم دلی سے بولیں۔

"ٹھیک ہے۔"

"میں فون کر لوں انھیں؟"

"ہاں..... ہاں....."

مسز ہمدانی کو میں نے جو یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ شیراز اس صورت حال سے لاعلم تھے، اس میں، میں صد فی صد کامیاب رہی تھی اور شیراز کے وہاں آنے کے لیے راہ ہموار ہو گئی تھی۔

اگلے دن شیراز مجھ سے ملنے کے لیے مسز ہمدانی کے گھر آ پہنچے۔ میں انیکسی میں تھی۔ مسز ہمدانی نے انھیں وہیں بھجوا دیا۔ انھوں نے اس قدر مستعدی کا مظاہرہ کیا تھا کہ شہر کے ایک نامور وکیل سے خلع کی درخواست کے مضمون کی ایک نقل بھی لے آئے تھے۔ میرا خیال تھا، سیدھی سادی سی شریفانہ درخواست ہوگی مگر جب میں نے پڑھا تو سراسیمہ ہو گئی۔ وکیل صاحب نے میری جانب سے جلال پر انتہائی رکیک قسم کے الزامات عائد کیے تھے مثلاً یہ کہ وہ غیر مردوں کو گھر پر لاتا ہے اور مجھے بدکاری پر مجبور کرتا ہے۔ اس کے حکم کی تعمیل نہ کروں تو بے رحمی سے

زد و کوب کرتا ہے۔ میں یہ الزامات پڑھ کر شرم سے میں گڑ گئی۔

"رازی! ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔" میں نے کہا۔

وہ یوں ہنس دیے جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کہی ہو پھر بولے۔ "یار! خلع حاصل کرنے کے لیے ذرا تگڑا سا جواز ہونا چاہیے تھا۔ وکیل صاحب کورٹ میں رسوا کر دیں گے اس تھرڈ کلاس آدمی کو۔"

"مگر رازی! عدالت میں یہ باتیں زیر بحث آنے سے بلال سے زیادہ رسوائی اور تذلیل تو میری ہوگی۔" میں نے احتجاج کیا۔

"ڈونٹ بی چائلڈش .... مدعی کے درجے کو سپورٹ دینے کے لیے اس کے وکیل کو مخالف پارٹی پر جائز اور ... ناجائز ہر قسم کے الزامات عائد کرنے پڑتے ہیں۔ کیا پتا کون سا تیر نشانے پر جا لگے۔ میں نے تمھارے لیے جن وکیل صاحب کی خدمات حاصل کی ہیں ان کی طلاق اور خلع کے مقدمات میں بڑی شہرت ہے۔ یہ تو رف ڈرافٹ ہے۔ جب فائنل درخواست تیار ہو کر سامنے آئے گی تو بقول وکیل صاحب کے وہ محلے کا آرٹسٹ ایک حملے میں نیچے گر جائے گا۔ وکیل صاحب کہہ رہے تھے کورٹ کی جانب سے خاوند پر اس قسم کے الزامات کا نتیجہ خاصا مثبت رہتا ہے۔ جب کوئی عورت اپنے مرد پر یہ الزام لگاتی ہے کہ وہ اسے بدکاری پر مجبور کرتا ہے تو سب ایسے آدمی پر تھو تھو کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔"

"لیکن رازی! پھر میں لوگوں سے نظریں کیسے ملا پاؤں گی۔ اگر بہت سوں کی ہمدردیاں میرے ساتھ ہوں گی تو چند یہ سوچ کر مجھ سے نفرت بھی تو کر سکتے ہیں کہ میں غلط کام کرتی رہی ہوں، خواہ زبردستی ہی سہی۔"

"ماضی کی گہرائی میں مت جاؤ۔ دوسروں کی پروا مت کرو۔ تمھیں صرف مجھ سے غرض ہونا چاہیے اور تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

شیراز نے بے تکلف ہونے کی کوشش کی مگر میں نے اجازت نہ دی۔

"آل رائٹ!" وہ مجھے شاکی اور تنبیہی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

اور میں شیراز کی باتیں سن کر سوچ رہی تھی۔

"پل صراط کا یہ سفر نہ جانے کب ختم ہوگا!"

تین چار روز کے بعد شیراز مجھے وکیل صاحب کے پاس لے گئے۔ عدالت میں پیش کیے جانے کے لیے میری جانب سے درخواست خلع تیار تھی۔ مجھے دستخط کرنا تھے جو میں نے بغیر کسی پس و پیش کے کر دیے۔

"وکیل صاحب! آپ کے خیال میں کتنا وقت لگ جائے گا؟" شیراز نے وکیل صاحب سے پوچھا۔

"شیراز صاحب! امید تو یہی ہے کہ انشاء اللہ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔" وکیل صاحب نے اطمینان دلایا۔

لیکن پہلی پیشی پر جب بلال اپنے وکیل کے ساتھ عدالت میں حاضر ہوا تو ہمارے وکیل صاحب کے چھکے چھوٹ گئے۔ بلال نے ایک ایسے وکیل کی خدمات حاصل کی تھیں جو عائلی مقدمات کے ضمن میں ایک مستند نام اور حیثیت کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔

پہلی پیشی کے بعد عدالت کی راہداری میں بلال سے میرا سامنا ہوا تو وہ لمحہ بھر کو ٹھٹکا پھر اس کے چہرے پر ایک تشنہ سی کیفیت ابھری اور وہ دو قدم بڑھ کر پاس سے گزر گیا۔ شیراز جو اسے دیکھ کر ایک ستون کی آڑ میں پیچھے ہو کر کھڑے ہو گئے تھے، اس کے آگے بڑھ جانے کے بعد نفرت سے بولے: "اسٹوپڈ! پتا نہیں کیا ہوں گی دو چار تصویریں...... دیکھتا ہوں کب تک مقابلہ کرے گا!"

پھر بعد میں تین پیشیاں گزر گئیں مگر میرے حق میں جانے والی کوئی مثبت صورت حال سامنے آتی نظر نہ آئی۔ بلال کا وکیل میرے موقف کی تردید میں ثبوت و شواہد اور گواہیاں پیش کرتا چلا گیا۔

اور

ان دنوں میری طبیعت روز بروز مضمحل سے مضمحل تر ہوتی چلی گئی۔ طبیعت کے اس اضمحلال اور معمول کی تبدیلی کو میں نے علی الترتیب حالات کا لازمی نتیجہ اور کسی وقتی تھکن سے تعبیر کیا۔ سچی بات یہ تھی کہ میں ان دنوں ذہنی طور پر اس قدر منتشر تھی کہ اپنے اوپر توجہ دینے یا اپنا خیال رکھنے کا ہوش کسے تھا۔

طبیعت کا اضمحلال اور کمزوری اس حد تک بڑھی کہ ایک روز شام کے وقت مسز ہمدانی کے گھر کے لان اور سرسبز لان پر چہل قدمی کرتے کرتے مجھے ایسا چکر آیا کہ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور میں چکرا کے گر پڑی۔ مسز ہمدانی کی بھتیجی جو ٹینس کھیلنے میں مصروف تھیں، گھبرا کر میری طرف لپکیں اور مجھے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے والد

کبھی آواز بلند پکارنے لگیں۔ ان کی آوازیں میں سن رہی تھی۔ ان کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر رہی تھی مگر نہ زبان کو حرکت دے پا رہی تھی نہ آنکھیں کھولنے کی ہمت ہو رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نیچے، بہت نیچے، گہرائی میں ڈوبتی چلی جا رہی ہوں۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ کس کس نے مجھے سہارا دے کر اندر پہنچایا۔ گہرائی میں ڈوبتے چلے جانے کا احساس بڑا حاوی تھا۔

صبح جب میں بیدار ہوئی تو پتا چلا مسز ہمدانی کے فیملی ڈاکٹر مجھے دیکھنے کے لیے گھر آئے تھے۔ طاقت کا انجکشن لگانے کے ساتھ چند دوائیں دے گئے تھے اور کسی لیڈی ڈاکٹر سے معائنہ کروانے کی ہدایت بھی کر گئے تھے۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں آپا اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"بیٹا تم کہہ رہی ہو مگر میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارے رخساروں پر جھائیاں پڑ رہی ہیں اور کمزور بھی ہو رہی ہو۔"

"آئی ایم پرفیکٹلی آل رائٹ آپا۔"

"دیکھو بی بی! اگر دولت سے میرا اپنا پن ہوتا تو جو حاتمیں لگنے کی ہیں ان کے پیش نظر میں ذرا بھی پروا نہ کرتی۔ تمہاری مگر تو میری بہت اچھی دوست اور بہن ہے۔ اس کی خاطر میں تمہیں اتنی اہمیت دیتی ہوں۔"

میری ہی خوش قسمتی ہے آپا ورنہ میں کہاں پناہ پاتی؟ میری آنکھیں جھپکے سے بھیگ گئیں۔

"ڈاکٹر صاحب کچھ شبہ سا ظاہر کر رہے تھے۔"

"کیسا شبہ؟" میں چونکی۔

"کہ شاید تم ایکسپیکٹ کر رہی ہو۔ مجھ سے انھوں نے کچھ سوالات کیے مگر میں جواب نہ دے سکی تم ایسی نڈھال پڑی تھیں کہ کچھ پوچھا ہی نہ جا سکتا تھا۔"

میں دکھ سے مسکرا دی۔ میرے نصیب میں ایسی خوشی کہاں تھی اگر ہوتی تو میں بیروت کا ہے کو دیکھتی!

شہر بلکہ ملک کا معروف ترین گائناکولوجسٹ مجھے بانجھ قرار دے چکا تھا۔ نہ دوائیں کام آئی تھیں نہ دعاؤں نے اثر دکھایا تھا بلکہ مذکورہ گائناکولوجسٹ کی جانب سے ملنے والی میڈیکل رپورٹس ہی کو شیراز کی منشا و مقصد کے خلاف ارسال کر دینا ہی تو مجھ پر اس عذاب کے نزول کا سبب بنا تھا جس نے بالآخر مجھے کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا اور مقبول کی جیت کا جواز بنا کر کسی خوش فہمی کا دامن تھاما جا سکتا وہ کوئی نئی بات نہ تھی ماضی میں بھی میں اس بے قاعدگی کی بارہا شکار رہی تھی۔

چنانچہ مسز ہمدانی کے فیملی ڈاکٹر کے مشورے اور مسز ہمدانی کے اصرار کے باوجود میں نے کسی لیڈی ڈاکٹر سے رجوع کرنا ضروری نہ سمجھا۔

لیکن تیسرے روز پھر میں بُری طرح چکرا کر گرتے گرتے بچی۔ زینے سے اترتے ہوئے میں نے زینے کی ریلنگ تھام کر زینے ہی پر بیٹھ نہ گئی ہوتی تو یقیناً لڑھکتی ہوئی نیچے آ رہتی۔ تب میں مسز ہمدانی کے اصرار پر ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانے پر مجبور ہو گئی۔ اس نے معائنہ کیا، تفصیلی احوال سنا۔ میں نے اسے یہ بتا دینے میں کوئی تردد نہ سمجھا کہ مشہور گائناکولوجسٹ ڈاکٹر پیرزادہ میرے لیبارٹری ٹیسٹ دیکھ کر مجھے بانجھ قرار دے چکے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر کچھ دیر کوشش و پنج میں پڑی رہیں پھر بولیں۔

"خاتون! کبھی کبھی بعض پیچیدگیاں بغیر کسی علاج کے قدرت کا ہاتھ معجزاتی طور پر دور کر دیتا ہے۔ بہتر ہے آپ لیبارٹری ٹیسٹ کروا لیں۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" میں نے ہتھیار ڈال دی۔ مگر کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوئی۔

لیکن لیبارٹری ٹیسٹ کے نتیجے نے مجھے خوشی سے پاگل کر دیا۔

"بی بی! آپ ماں بننے والی ہیں۔" لیڈی ڈاکٹر کا یہ جملہ سن کر لمحہ بھر کو تو میرا دل مارے خوشی کے دھڑکنا بھی بھول گیا پھر مجھے یوں لگا جیسے میں ہمدم خوشبوؤں، دھنک رنگ روشنیوں اور خوشیوں کی بیکھا میں سمائی کھڑی ہوں۔ میں خود کو فضاؤں کے دوش پر اونچا، بہت اونچا اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ میرے ارد گرد پھول ہی پھول مہک اٹھے تھے اور میرا جی چاہ رہا تھا روئے زمین کے بلند ترین مقام پر کھڑی ہو جاؤں اور چلا چلا کر کہوں۔

"دنیا والو! سنو! میں ... میں جو کہ بانجھ قرار دے دی گئی تھی سرخرو ہونے جا رہی ہوں!"

اور

اس بے کراں مسرت کے سمندر میں غلطاں میں بھول گئی تھی کہ میں جس بچے کے حوالے سے سرخرو ہونے جا رہی تھی اس کا باپ وہ شخص تھا جس سے چھٹکارا پانے کی خاطر میں عدالت کے کٹہرے میں جا کھڑی ہوئی تھی!!

شیراز کو میں نے یہ خوشخبری ٹیلیفون پر سنانا مناسب نہیں سمجھا۔ میں انھیں روبرو بٹھا کر ان کے تاثرات دیکھنا چاہتی تھی۔ میں اندازہ کرنا چاہتی تھی کہ وہ یہ خوشخبری سن کر

کتنے خوش ہوتے ہیں۔

جب میں نے یہ خوشخبری انھیں سنائی تو وہ یوں چونکے جیسے کسی زہریلے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"واٹ!" انھوں نے یوں منہ بنایا جیسے کریلے کے عرق میں نیم کا ست ملا کر ان کے منہ میں انڈیل دیا گیا ہو۔

"ہاں رازی.... یہ سچ ہے۔"

اپنی خوشی میں میں ان کے تاثرات کو نظر انداز کر گئی۔

"نان سینس!" وہ غرائے۔

"نان سینس....! تم اسے نان سینس کہہ رہے ہو؟" اب میرے چونکنے کی باری تھی۔

"اور کیا؟" وہ سر جھٹک کر بولے۔

"تم خوش نہیں ہوئے!" میں رنجور ہوتے ہوئے بولی۔

"کیا واہیات سوال ہے۔"

"واہیات!"

میں نے ان کی تنی ہوئی ابروؤں، سختی سے بھنچے ہوئے جبڑوں، پھڑکتے ہوئے نتھنوں اور شعلہ بار آنکھوں کے مجموعی تاثر کے نتیجے میں بگڑ جانے والے چہرے کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کی وجاہت بدصورتی میں بدل گئی تھی۔

"رازی! کیا تمھیں یاد نہیں، تم کہا کرتے تھے کہ ہم کوئی بچہ اڈوپٹ کر لیں گے اور میں ہمیشہ یہی کہتی تھی کہ مجھے اپنا بچہ چاہیے۔ میری کوکھ سے جنم لینے والا بچہ۔ اب ہمیں کسی اور کا بچہ گود لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمھیں بتا نہیں سکتی کہ میں کتنی خوش ہوں۔ ڈاکٹر کہہ رہی تھی کبھی کبھی بعض پیچیدگیاں بغیر کسی علاج کے قدرت کا ہاتھ معجزاتی طور پر دور کر دیتا ہے۔ رازی! خدا نے مجھے سرخرو کر دیا ہے وہ تمھیں میرا بچہ دے رہا ہے۔"

"ہنہہ....! بچہ....!" وہ طنز و حقارت سے پھنکارے۔

"رازی! کیا ہو رہا ہے تمھیں؟" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"پاگل ہو گیا ہوں میں۔" وہ بھبک کر بولے۔

"فار گاڈ سیک رازی!" میں گڑگڑائی۔ "ایسا تو نہ کہو۔"

"تو کیا ہنسوں، قہقہے لگاؤں اور چلا چلا کر لوگوں کو بتاؤں کہ جس عورت سے میں محبت کرتا ہوں وہ میرے رقیب، میرے حریف کا بچہ اپنی کوکھ میں پال رہی ہے۔"

"رازی!" مجھے خود اپنی آواز کسی اندھے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

شیراز نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیچھے چھپا لیا۔ بڑی دیر یونہی بیٹھے رہے پھر اپنے چہرے پر سے ہاتھ ہٹانے کے بعد جیسے سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"آئی ایم سوری عینی.... میں اس بچے کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکوں گا۔"

"را.... رازی....!" میں نے وحشت زدہ ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

"دیکھو میں نے ہر راہ مسدود پا کر یہ بات گوارا کی کہ تم کسی دوسرے مرد سے ناتا استوار کرنے کے بعد مجھ تک واپس لوٹو.... تمھاری واپسی پر میں اس شخص کو اور اس سے متعلق ہر بات کو بھول جانا چاہتا ہوں۔ مجھے کسی قیمت پر یہ گوارا نہیں ہو گا کہ جب تم میرے پاس واپس آؤ تو اس شخص سے متعلق کوئی دھندلا سا نقش یا مدھم سی پرچھائیں بھی تمھارے ساتھ ہو.... جس شخص کا نام میں حرف غلط کی طرح تمھاری زندگی سے مٹا دینے کا خواہاں ہوں، جس کا چہرہ میں بھول جانے کی کوشش کروں گا تم اس شخص سے اپنے تعلق کی جیتی جاگتی نشانی کے ساتھ میری جانب لوٹنا چاہتی ہو.... نو.... نو عینی.... دس از امپاسبل.... آئی ول بی دی لاسٹ پرسن ٹو ایکسیپٹ دیٹ مائنڈ اٹ۔"

میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا، اور خود کو بے بس پا کر بک بک پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ وہ میرے قریب آ بیٹھے اور میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ "ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ عینی.... کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم کسی اور کا بچہ پالنے کے بجائے اپنا بچہ پالیں۔ میرا مطلب ہے وہ بچہ جو تمھاری کوکھ سے جنم لے اور میں اس کا باپ قرار پاؤں...." پھر وہ بڑے پریقین لہجے میں بولے۔ "دیکھو عینی! قدرت کے ہاتھ نے وہ پیچیدگی تو دور کر ہی دی ہے جس کا تم شکار تھیں۔ اگر ایک مرتبہ تمھارے ماں بننے کی امید ہوئی ہے تو ان شاء اللہ دوبارہ بھی ہو گی۔ اس قصے کو یہیں ختم کر دو ورنہ الجھن اور بڑھ جائے گی۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟" میں نے ہراساں ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ...." وہ کہتے کہتے رک گئے اور اپنا ہاتھ دھیرے سے میرے شانے پر سے ہٹاتے ہوئے بولے۔ "تمھیں کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو گا عینی.... سوچ لو کہ.... تم اس بچے کی ماں بننا پسند کرو گی یا میری بیوی؟"

میں نے متوحش ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

"تمھیں فیصلہ کرنا ہو گا۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس لیے وہ کس قدر بیگانہ نظر آ رہے تھے۔"

مجھ پر ایک ہیجانی کیفیت طاری ہونے لگی۔ میرا جی چاہا انھوں اور شیراز کا گریبان دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر انھیں بُری طرح جھنجھوڑ ڈالوں اور چلا کر ان سے پوچھوں: "تم نے مجھے عورت سمجھا ہے یا پتھر.....!"

مگر میں جو چاہتی تھی کر نہ سکی۔ آنسو میرے اختیار میں تھے سو بہہ نکلے۔ میرے آنسو دیکھ کر یا خدا جانے کسی اور باعث شیراز موم پڑ گئے۔ ایک بار پھر میرے نزدیک آ کر میرے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے نرم لہجے میں بولے۔

"آؤ کہیں چلتے ہیں۔"

میں سر جھکائے اپنی بدنصیبی پر بدستور آنسو بہاتی رہی۔

"کم آن۔"

میں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔ کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا: "کہاں؟"

"باہر..... کہیں گھومنے پھرنے۔"

"نہیں۔" میں نے انکار کر دیا۔

"کیوں؟" انھوں نے اس قدر تعجب سے پوچھا جیسے میری جانب سے انکار کی امید کی ہی نہ جا سکتی تھی۔

"میں..... ایک گھر میں پناہ لیے پڑی ہوں۔ نہیں چاہتی کہ مسز ہمدانی کو اعتراض کا کوئی موقع دوں۔ کیا یہ کافی مہربانی نہیں ہے ان کی کہ انھوں نے تمھیں یہاں آنے کی اجازت دے رکھی ہے خواہ بادل ناخواستہ ہی سہی۔"

"ان کی پروا مت کرو۔ ویسے بھی تمھیں اب کتنے دن رہنا ہے یہاں۔ میں نے وکیل صاحب پر واضح کر دیا ہے کہ جلد سے جلد مزید دو تین پیشیوں میں فیصلہ ہو جانا چاہیے۔"

"فیصلہ کتنی ہی جلدی کیوں نہ ہو جائے تو بہرحال کم از کم چھ ماہ اور گزارنا پڑیں گے یہاں۔"

"چھ ماہ.....!" وہ چونکے پھر تیوریاں چڑھا کر بولے۔

"اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ اس قصے کو ابھی ختم کر دو۔"

"پلیز ایسا نہ کہو۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"میں اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں تمھیں۔ اب تمھیں فیصلہ کرنا ہے..... یہ بتاؤ چل رہی ہو میرے ساتھ یا میں جاؤں؟"

میں نے شیراز کی طرف دیکھا اور اپنے دل سے پوچھا۔ "کیا تو اس آمادۂ ستم شخص کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتا؟"

میرے دل نے کسی شیر بچے کی طرح اچھل کر کہا: "میں تو بس محبت کر سکتا ہوں۔"

آہ! بُرا ہو اس محبت کا جو خود تو اندھی ہوتی ہے عقل کو بھی بے دست و پا کر ڈالتی ہے۔

میں نہ چاہتے ہوئے بھی شیراز کے ساتھ جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔ شیراز ڈیڑھ دو گھنٹے مجھے شہر کی پُر رونق سڑکوں پر گھماتے پھرے۔ باہر رنگ تھے، روشنیاں تھیں، ہنگامے تھے۔ اندر کار میں کیسٹ پلیئر پر بجتی مدھر اور رومان پرور موسیقی اور شیراز کی قربت اس ذہنی ہیجان کو پچھاڑ دینے کی کوشش کر رہی تھی جس سے مجھے شیراز کے تکلیف دہ فیصلے نے دوچار کر دیا تھا۔

دو روز بعد شیراز نے مجھے اس وقت فون کیا جب مسز ہمدانی کالج اور بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔

"خدانخواستہ تمھاری وہ خوفناک قسم کی آپا آج کالج سے چھٹی کیے تو نہیں بیٹھی ہیں؟"

"نہیں وہ کالج گئی ہوئی ہیں..... خیریت؟"

"میں تمھارے پاس آ رہا ہوں تمھیں کہیں باہر لے جانے کے لیے تم تیار رہو۔"

"کہاں؟"

"اس قدر گھبرا کے کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"اس لیے کہ نوکر تو گھر پر ہوتے ہیں۔ مسز ہمدانی کو پتا چلا تو زبان سے کچھ کہیں یا نہ کہیں دل میں ضرور بدگمان ہوں گی۔ ہاں ذری سے پروگرام تو بتاؤ۔"

"میں آ کے بتاؤں گا۔ اور تم اگر مسز ہمدانی اور ان کے نوکروں سے اسی قدر خائف ہو تو ایسا کرو کہ خیام تک پیدل نکل آؤ۔ میں وہاں سے تمھیں پک کر لوں گا۔ نوکروں سے کوئی بھی بہانہ کر دینا۔"

اگرچہ طبیعت مضمحل تھی مگر میں نے پھر بھی ہامی بھر لی۔ میں خیام تک پہنچی تو شیراز کو اپنا منتظر پایا۔

"بڑی جلدی دکھائی تم نے پہنچنے میں۔" میں نے اگلی سیٹ پر ان کے برابر بیٹھنے کے بعد گاڑی کی کھڑکی کا شیشہ چڑھاتے ہوئے کہا۔

"یار! میں تو بے چینی سے اس دن کا منتظر ہوں جب یوں چوری چھپے ملنے سے نجات ملے گی۔"

"اب تو میں بھی گھبرا گئی ہوں۔ خدا جانے کب آئے گا وہ دن۔"

"حوصلہ..... حوصلہ ڈارلنگ۔" وہ اپنے بائیں ہاتھ سے میرا دایاں شانہ دباتے ہوئے بولے۔

پھر انھوں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گاڑی کا رُخ شہر کی جانب کرتے ہوئے پوچھا: "ہم ڈاکٹر کے پاس چل رہے ہیں۔"
"ڈاکٹر کے پاس!" میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں۔"
"مگر کون سے ڈاکٹر کے پاس اور کس لیے؟"
"ڈاکٹر رئیسہ کے پاس، بڑی شہرت سنی ہے میں نے اس کی ایسے کاموں میں۔ رازداری کے اعتماد کے ساتھ کام کرتی ہے اور کوئی خطرہ نہیں ہونے دیتی۔ کل خاصی جستجو کے بعد اس کا پتا لگا سکا۔ ملاقات گیارہ بجے کلینک پر ملاقات ہوئی۔ اس کی ایک بات نے مجھے بڑا اپیل کیا۔ فالتو سوال کوئی نہیں کیا، بس کام کی بات کی۔ مجھ سے یہ پوچھا کہ کیا کرنا ہے اور خود یہ بتایا کہ کیا لے گی۔۔۔ آئی ایپریشیٹ اٹ۔۔۔ کام ایسے ہی ہونا چاہیے۔"

میں دم سادھے شیراز کی بات سن رہی تھی۔
شیراز نے اپنے سامنے کار کے آئینے میں دیکھا، یقیناً میرے عکس پر نظر ڈالی ہوگی اور بولے: "گھبرانے یا پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمھاری اس وقتی تکلیف میں ہماری دائمی خوشیوں کا راز مضمر ہے۔"
میرا جی چاہا گاڑی کا دروازہ کھولوں اور گاڑی سے چھلانگ لگا دوں۔
مگر بزدلی آڑے آگئی۔
اس خیال نے کہ پیچھے سے آنے والی گاڑیاں مجھے روندتی اور پامال کرتی گزر جائیں گی میرے بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑا دی۔
میں سانس روکے، دم سادھے پریشان بیٹھی تھی۔
"سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔ ہم اس مرتبہ اپنا ہنی مون یورپ میں گزاریں گے۔ میں تمھارے ایک ایک دکھ کی تلافی کر دوں گا۔ دیکھنا۔۔۔ اتنی خوشیاں دوں گا تمھیں کہ تم سنبھال نہ سکو گی۔ تم اپنی قسمت پر ناز کرو گی۔" شیراز مجھے مستقبل کے خواب دکھا رہے تھے۔

"رازی! میں تم سے کچھ اور نہیں مانگوں گی، بس یہ ایک خوشی مجھ سے نہ چھینو۔" میں گھٹی گھٹی آواز میں گڑگڑائی۔
"بے وقوفی کی بات مت کرو۔" وہ غصے سے بولے۔
میری آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ میری آغوش میں گرنے لگے۔ مجھے اپنے اوپر غصہ آنے لگا۔ کیسی بے وقوف عورت تھی میں، ایک مرد کے عشق میں اس قدر دیوانی ہو گئی تھی کہ وہ مجھے کٹھ پتلی کی طرح جھٹکے دے دے کر نچا رہا تھا اور میں چپ چاپ ناچ رہی تھی اس وقت بھی جب کہ وہ مجھے ایک ایسی شے سے محروم کروانے کے لیے لے جا رہا تھا جو میری ہی نہیں کسی کی امانت کی نشانی تھی۔ تب بھی احتجاج کرنے کی بجائے اس کے سامنے کٹھ پتلی بنی چپ چاپ اشارے پر ناچ رہی تھی۔
میرے ذہن میں ہی خیال آیا اس عورت نے جو ماں بننے جا رہی تھی، اگر مجھے اس ارمان کی کوشش کی مگر مصلحت کی خاطر اسے ترک کر دیا۔
شیراز نے کلینک سے دو گز دوری کی مسافت میرے لیے جانے پڑا وہ کیسا تھا!
بہرصورت مجھے اس کے آگے جھکنا تھا۔

"پیچ نرسنگ ہوم" کی ڈاکٹر رئیسہ نے میرا تفصیلی معائنہ کیا۔ چند ضروری سوالات پوچھے پھر شیراز سے بولیں: "ڈونٹ وری، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
"انھیں ایڈمٹ کرنا ہوگا؟" شیراز نے پوچھا۔
"آف کورس۔"
میں کسی بے حس پتلی کی طرح ان کی باتیں سن رہی تھی۔
شیراز ڈاکٹر رئیسہ کے سامنے سے اٹھ کر میرے نزدیک آئے اور جھک کر بولے: "کل ہی ایڈمٹ ہو جاؤ رازی۔۔۔" میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
تب ہی کمرے کا دروازہ کھلا، ایک باوردی نرس اندر داخل ہوئی اور اس نے ڈاکٹر رئیسہ سے کہا: "ڈاکٹر صاحبہ! چھ نمبر کو ڈلیوری روم میں لے گئے ہیں۔"
"او کے، اشفاق، میں آ رہی ہوں۔۔۔" ڈاکٹر رئیسہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور ہماری جانب مڑتے ہوئے بولیں: "میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔"
"بہتر۔" شیراز نے کہا اور ڈاکٹر رئیسہ کے کمرے سے نکل جانے کے بعد مجھ پر جھکتے ہوئے بڑی چاہت سے میرے بالوں کو اپنی انگلیوں سے سنوارتے ہوئے استفسار کیا: "بُرے ہو گئی؟"
"ہاں۔"
"جو کچھ تم نے اب تک کیا ہے میری خاطر؟"
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"بس یہ آخری بات اور مان لو۔۔۔ میری خاطر۔۔۔ پلیز!"
میں نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا اور ایک دبی دبی سی آہ میرے سینے میں مچل کر رہ گئی۔
"اوہ! تمھاری خاطر۔۔۔ تمھاری خاطر میں نے کیا نہیں کیا!"

میں نے سوچا۔
"میری خاطر تھی... بیسٹ فار مائی سیک — وہ..."
پھر بولے
میں ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔
"تو کیوں نہ ڈاکٹر نفیسہ سے کہو کہ تمہیں ایڈمٹ کر لیں۔"
"اور مسز ہمدانی میرے گھر نہ پہنچنے پر کیا سوچیں گی؟"
"بہتر ہے تم مسز ہمدانی کو... انھیں ہمارے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں... شی ہیز نو رائٹ ٹو ڈو سو۔ ڈیئر تم ایک شادی شدہ عورت ہو اور اپنے معاملات میں تم خود مختار ہو۔"
"مگر مجھے وہاں رہنا جو ہے۔"
"فکر مت کرو۔ میں تمہارا علاج معالجہ اور رہائش کا کہیں اور بندوبست کیے دیتا ہوں۔ کہو تو کوئی فلیٹ کرائے پر لے لیں؟"
"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا میں تنہا نہ رہ سکوں گی۔"
"چیرو پاپا کے ساتھ تو رہ سکو گی۔ میں انھیں ٹیلیفون کر کے ساری بات بتا دوں گا۔"
شیراز کی زبان سے چیرو پاپا کا نام سن کر مجھے پرانے دن یاد آ گئے۔
بے خبری کا زمانہ!
جب اُن کی بے رُخی کا دکھ تھا۔ اس دکھ کی کوکھ سے جنم لینے والے بہت سے غم اور احساس تھے مگر میں کتنی بے بس اور بے اختیار تھی۔
"جاؤ ان کے ساتھ تو رہ لو گی؟"
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"اچھا دیکھو میں تمہیں ایڈمٹ کروانے کے بعد چلا جاؤں گا۔ آج ایک بہت بڑی بزنس ڈیل کے سلسلے میں ایک میٹنگ سے وقت طے ہے۔ اس سے فارغ ہوتے ہی یہاں آؤں گا... سمجھیں؟"
میں تیزی سے چکر پہ چکر کھاتے پنکھے کا اضطراب اپنے دل کی دھڑکنوں میں سرایت کرتا محسوس کر رہی تھی اور بے بسی کا احساس لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔
شیراز نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے آرام سے اٹھنے میں مدد دی۔ میں اور ہم ویٹنگ روم کی دیوار کے ساتھ پڑے صوفے پر جا بیٹھے۔
ڈاکٹر نفیسہ کو واپس آنے میں کچھ دیر لگی اور ابھی وہ پوری طرح ہماری جانب متوجہ بھی نہ ہو پائی تھیں کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔
"مے آئی کم اِن؟" ڈاکٹر نفیسہ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
دروازہ کھلا اور ایک نوجوان بے حد شاداں و فرحاں کمرے میں داخل ہوا اور اس نے مٹھائی کا ایک ڈبا ڈاکٹر کی جانب بڑھا دیا۔
"بیٹا مبارک ہو۔" ڈاکٹر نفیسہ نے نوجوان سے کہا۔
"شکریہ۔"
"آپ کی بیگم تو بیٹے کی خبر سن کر رونے لگیں۔" ڈاکٹر نفیسہ نے نوجوان کو مسکراتے ہوئے بتایا۔
"ڈاکٹر! یہ ہمارا پہلا بچہ ہے۔" نوجوان جذباتی لہجے میں بولا۔
میرا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔
آہ! میں اس خوشی سے محروم ہونے جا رہی ہوں۔
نوجوان کے جانے کے بعد ڈاکٹر نفیسہ ہماری طرف متوجہ ہوئیں۔
"جی صاحب۔" انھوں نے مسکراہٹ کے ساتھ شیراز کی طرف دیکھا۔
"ڈاکٹر! انھیں آپ آج ہی ایڈمٹ کر لیں۔"
"رائٹ۔"
"میرے یہاں ٹھہرنے کی ضرورت تو نہیں؟" شیراز نے پوچھا۔
"کیوں آپ کا جانا ضروری ہے کیا؟"
"جی ہاں۔"
"بائی دی وے آپ انھیں جنرل وارڈ میں رکھنا پسند کریں گے یا پرائیویٹ روم میں؟"
"پرائیویٹ روم میں۔" شیراز نے جواب دیا پھر مسکرا کر بولے۔ "اٹ شڈ بی ویری ویری پرائیویٹ۔ منی از نو پرابلم فار می۔"
"او کے میں ان کی ایڈمیشن سلپ بنائے دیتی ہوں۔ روم نمبر آپ کو کاؤنٹر سے مل جائے گا۔" ڈاکٹر نفیسہ نے اپنے سامنے رکھے قلمدان میں سے قلم نکالتے ہوئے کہا۔
شیراز ان کے سامنے جا بیٹھے۔
"نام؟"
"فرحت اعجاز۔"
میں نے چونک کر شیراز کی طرف دیکھا۔
ڈاکٹر نفیسہ نے کچھ دیر بعد دو پرچیوں پر کچھ لکھا اور انھیں شیراز کی طرف باری باری بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ

ایڈمیشن سلپ ہے۔ آپ کاؤنٹر پر دے دیجیے گا تو روم ان کو مل جائے گا اور فائل بھی بن جائے گی... یہ بلڈ ٹیسٹ کی سلپ ہے۔ یہ بھی کاؤنٹر پر دے دیجیے گا۔"

"ڈاکٹر! آئی ایم ان ہری... ایک اہم اپائنٹمنٹ ہے میری... کیا یہ ممکن ہو سکے گا کہ آپ اسپتال کے کسی ملازم کو اس تمام کارروائی پر مامور فرما دیں... آئی ول پے فار اٹ......"

یہ کہتے ہوئے شیراز نے اپنی جیب سے سرخ سرخ نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کی فراخدلانہ نمائش کی اور اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے بولے: "آئی ایم سوری۔ میں آپ کو زحمت دے رہا ہوں... اصل میں بہت اہم میٹنگ ہے۔"

"ویل آل رائٹ...... میں کسی سے کروائے لیتی ہوں یہ کام۔"

"ڈاکٹر صاحب! ایڈمیشن فیس وغیرہ؟"

"نوٹوں کی گڈی ہنوز ان کے ہاتھ میں تھی۔

"کوئی بات نہیں! آپ شام کو پے کر دیجیے گا۔"

"پیمنٹ تو میری سسٹر کر دیں گی۔ بس آپ ان کی مدد کے لیے کسی کو ان کے ساتھ کر دیں۔"

شیراز پلٹے اور میرے نزدیک آ کر سرخ کڑکڑاتے نوٹوں کی وہ گڈی میری آغوش میں رکھے بیگ کی زپ کھول کر اس میں رکھنے اور زپ دوبارہ بند کرنے کے بعد بیگ میرے سپرد کرتے ہوئے بولے: "دس ہزار ہیں۔ پیسوں کی بالکل پروا مت کرنا جتنے طلب کریں دے دینا باقی میں خود آ کر دیکھ لوں گا اور اگر مجھے کچھ دیر ہو جائے تو فکر مت کرنا۔"

میں نے نعمان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور دھیرے سے بولی: "[illegible] مسز ہمدانی کو فون کر دینا کہ میں تمہارے [illegible] ہوں۔"

"[illegible] انھیں......" انھوں نے بے زاری سے [illegible] پھر بولے: "کسی کی پروا مت کرو۔"

میرے لبوں کے گوشے دھیرے دھیرے پھڑکنے لگے۔

"اوکے ڈارلنگ!" انھوں نے جھک کر میرے سر کو بوسہ دیا اور دروازے کی سمت پیش قدمی کی۔ ابھی وہ دروازے تک پہنچے نہ تھے کہ ڈاکٹر رئیسہ کے کنسلٹنگ روم کا دروازہ کھلا اور پنسل ہیل کورٹ شوز پر کھٹ پٹ کرتی شوخ نارنجی [illegible] ملبوس، سفید ہاف کوٹ کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے [illegible] میانہ عمر کی ایک ڈاکٹر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"ہیلو ڈاکٹر!"

"ہیلو مائی ڈارلنگ... ہاؤ آر یو؟" ڈاکٹر رئیسہ کھل اٹھیں۔

"آئی ایم ویری فائن۔" نوواردہ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا تاہم انھوں نے ایک اچٹتی ہوئی نظر شیراز پر ڈالی تو مخطوظ سی ہو گئیں اور ان کی [illegible] نگاہوں میں پہچان کی لہریں ابھرتے دیکھیں۔ شیراز جو خود بھی ٹھٹک کر تھم گئے تھے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھے تو انھوں نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ مجھے وہ کچھ خائف سے نظر آئے پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

نوواردہ ڈاکٹر گردن موڑے دروازے کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

"نیلوفر... آؤ بیٹھو نا۔" ڈاکٹر رئیسہ نے کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نوواردہ ڈاکٹر کو بیٹھنے کی دعوت دی۔

وہ ڈاکٹر رئیسہ کے روبرو آ بیٹھیں اور اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو شانے پر موڑ کر دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولیں: "یہ صاحب آپ سے بھی کچھ گڑبڑ کروانے آئے تھے کیا؟"

اگرچہ انھوں نے یہ بات مدھم آواز میں پوچھی تھی مگر ان کی آواز مجھ تک پہنچ گئی تھی۔

ڈاکٹر رئیسہ نے اپنی ابرو کی معنی خیز جنبش سے انھیں کمرے میں میری موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ انھوں نے گردن موڑ کر میری جانب دیکھا اور پھر اپنی کرسی کچھ ایسے رخ پر موڑ لی کہ میں ان کی دائیں کنپٹی اور رخسار کا کچھ حصہ دیکھنے کے سوا چہرے کا بقیہ حصہ دیکھنے سے قاصر تھی۔

ڈاکٹر رئیسہ نے انٹرکام کے ذریعے سسٹر جمیلہ نامی ایک نرس کو بلوایا اور مجھے ان کے سپرد کرتے ہوئے بولیں: "سسٹر! انھیں پرائیویٹ روم میں ایڈمٹ کرنا ہے اور فوری طور پر بلڈ گروپ کنفرم کروانا ہے۔"

"جی بہتر۔" سسٹر جمیلہ نے تابعدارانہ انداز میں سر ہلایا۔

سسٹر جمیلہ مجھے کاؤنٹر پر لے گئی۔ میری فائل بنوائی، کاؤنٹر پر ادائیگی کروائی اور مجھے نرسنگ ہوم کی بالائی منزل پر واقع کمرہ نمبر بارہ تک پہنچانے کے بعد بولی: "میں آپ کے لیے اسپتال کے کپڑے لے آؤں پھر بلڈ لیتی ہوں۔"

"سسٹر! بلڈ کس لیے لیں گی آپ؟" میں نے پوچھا۔

"بلڈ گروپ چیک کروانے کے لیے تاکہ خدانخواستہ کوئی

ایمرجنسی ہو تو...."

پھر سسٹر حمیدہ چلی گئی اور میں ڈوبتے دل کو سنبھالا دیتی کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ خاصا کشادہ، صاف ستھرا اور آرام دہ کمرہ تھا۔ کمرے میں دو بیڈ تھے غالباً ایک بیمار کے لیے اور دوسرا تیماردار کے لیے۔ ایک صوفہ سیٹ پڑا تھا اور دو کرسیاں۔ دونوں پلنگوں کے بیچ میں ایک آتشی نعمت خانہ تھا جس پر پانی کی بوتل گلاس سے ڈھکی ہوئی رکھی تھی۔ خاصی سہولتیں بہم پہنچائی گئی تھیں تب ہی تو داخلہ فیس بھی تگڑی لی تھی۔

سسٹر حمیدہ کا فراہم کردہ اسپتال کا ڈھیلا ڈھالا سا بلاؤز اور سلیپنگ کوٹ پہن کر میں نیم جان سی بستر پر پڑ گئی۔ کچھ دیر بعد سسٹر حمیدہ ایک میل نرس کے ہمراہ آئی جس نے میرے دائیں بازو کی رگ سے کچھ خون لیا۔ میل نرس کے جانے کے بعد سسٹر حمیدہ نے کہا۔ "ایک کیس ڈلیوری کے لیے تیار ہے، اس سے فارغ ہو کر ڈاکٹر صاحبہ آپ کی طرف آئیں گی۔"

پھر سسٹر حمیدہ کمرے کے ایک گوشے میں ایستادہ ڈرپ اسٹینڈ میرے پلنگ کے نزدیک کھینچ لائی اور خود کمرے سے باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد سسٹر حمیدہ نے گلوکوز کی ایک بوتل لا کر اس اسٹینڈ پر لٹکا دی۔

"سسٹر! کیا ڈرپ لگے گی مجھے؟"

"جی۔" سسٹر حمیدہ نے بہت مختصر سا جواب دیا۔

"ڈاکٹر کب تک آئیں گی؟"

"کیس سے فارغ ہو کر۔"

سسٹر حمیدہ کمرے سے چلی گئی اور میں لمحوں کا عذاب سہنے لگی۔

ڈیڑھ گھنٹے کے لگ بھگ ڈاکٹر رضیہ، سسٹر حمیدہ اور ایک دوسری نرس کے ساتھ جس نے بلڈ پریشر ناپنے والا آلہ اٹھا رکھا تھا، میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ڈاکٹر رضیہ نے میرا بلڈ پریشر دیکھا پھر سسٹر حمیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بلڈ گروپ کنفرم کروا لیا؟"

"جی ڈاکٹر صاحبہ سیمپل بلڈ تو لے گیا تھا لیب سے رپورٹ ابھی نہیں آئی ہے۔"

وہ دوسری نرس آلہ لے کر چلی گئی تھی۔ ڈاکٹر رضیہ نے گردن کو ایک ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے معنی خیز نگاہوں سے سسٹر حمیدہ کو دیکھا۔ سسٹر حمیدہ روبوٹ کی مانند مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر رضیہ نے پہلے اسٹینڈ پر آویزاں گلوکوز کی بوتل کی طرف دیکھا پھر میری جانب۔

"ڈاکٹر! یہ مجھے ڈرپ کیوں لگے گی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ.... اسی میں ہم انجکشن شامل کر دیں گے۔"

"پھر؟" میری آواز گھٹ کے رہ گئی۔

"پھر وہی ہو گا جو آپ کے شوہر چاہتے ہیں۔" ڈاکٹر رضیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نہ جانے کہاں سے آنسو میری آنکھوں میں اُمنڈ آئے۔

"آپ کو افسوس ہو رہا ہے؟" ڈاکٹر رضیہ میری پیشانی پر ہاتھ دھرتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔

میں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ مجھے دھندلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میرے ہونٹوں کے گوشے پھڑکنے لگے۔

"ڈاکٹر.... یہ.... میرا.... پہلا.... بچہ.... تھا۔" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے آپ کے شوہر اس کے اس دنیا میں آنے سے پہلے اس لیے ختم کروا دینا چاہتے ہیں کہ وہ اس کے باپ نہیں ہیں۔"

میں نے چونک کر ڈاکٹر رضیہ کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر رضیہ نے ایک گہری سانس لی پھر بولیں۔ "بی بی! ہمارا اصول یہی ہے کہ ہم اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور اپنی خدمات سے بہت سے شریف اور معزز لوگوں کو رسوائی اور ذلت سے بچا لیتے ہیں.... لیکن.... تمہارے معاملے میں میں اپنے اس اصول سے انحراف کرنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔ میں مانتی ہوں کہ ماں بننا عورت کا فطری حق ہے۔ میں تمہاری نفسیاتی کیفیت کو بھی کسی اور کی نسبت زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتی ہوں۔"

انھوں نے پل بھر کو توقف کیا پھر بولیں۔ "شاید اس لیے کہ میں خود بھی اس نعمت سے محروم ہوں.... لیکن بی بی! اخلاقی قدروں کو پامال کر کے ماں بننے کی کوشش ممتا کے جذبے کی تذلیل اور رسوائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی غیرت مند مرد یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی بیوی کسی دوسرے مرد کی اولاد کو جنم دے۔"

میں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ڈاکٹر رضیہ کی طرف دیکھا اور گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ڈاکٹر!" شاید اس سمے میری آنکھوں میں جہان بھر کی حیرانیاں سمٹ آئی تھیں۔

ڈاکٹر رضیہ نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے بولیں۔ "گو تمہارے شوہر نے مجھے کچھ نہیں بتایا ہے اور نہ ہی میں نے کچھ پوچھنا ضروری سمجھا۔ میں نے کہا نا ہم اپنے کام سے کام رکھتے ہیں مگر زندگی میں کبھی کبھی بڑی ڈرامائی سچویشنز آ جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ بچہ تمہارے

شوہر کا ہوتا تو وہ ہرگز ہرگز اسے یوں ختم نہ کروا رہے ہوتے۔"
وہ ایک بار پھر ہنسیں اور چند لمحے کے توقف سے بولیں۔
"عجیب اتفاق ہے کہ میری ایک گائناکولوجسٹ دوست ڈاکٹر نیلوفر جو غضب کی یادداشت رکھتی ہیں آج عین اسی وقت مجھ سے ملنے کے لیے آ پہنچیں جب تمہارے شوہر تمہیں میرے کمرے میں چھوڑ کر جا رہے تھے۔ ڈاکٹر نیلوفر نے انھیں دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ صاحب تو ڈیڑھ دو برس قبل اپنے اور اپنی اہلیہ کے ان مخصوص لیبارٹری ٹیسٹ کے نتائج میں گڑبڑ کروانے کے لیے رشوت کی پیش کش کے ساتھ ان کے پاس آئے تھے جو فریقین کی تولیدی صلاحیت کا اندازہ کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نیلوفر کے مطابق یہ صاحب خود تولیدی صلاحیت سے یکسر محروم تھے جب کہ اہلیہ کی ٹیسٹ رپورٹ قطعاً نارمل تھی....."

"پھر؟" مجھ سے ڈاکٹر رئیسہ کا لمحہ بھر کا توقف بھی برداشت نہ ہو سکا۔

"بقول ڈاکٹر نیلوفر کے انھوں نے ان صاحب کی اس پیش کش کو نہ صرف ٹھکرا دیا تھا بلکہ خوب اچھی طرح انھیں جھڑک بھی دیا تھا..... میں نے تو غور نہیں دیکھا مگر ڈاکٹر نیلوفر بتا رہی تھیں کہ آج وہ خاصے شرمندہ سے ہو گئے تھے انھیں دیکھ کر۔"

ڈاکٹر نیلوفر نے غلط نہ کہا تھا۔

شیراز کو دیکھ کر ڈاکٹر نیلوفر کے ٹھٹک جانے اور شیراز کے کنی کترا کے نکل جانے کا وہ منظر میرے ذہن میں محفوظ تھا اور میں ذہن کے پردے پر دوبارہ اسے متحرک دیکھ سکتی تھی۔

تب ہی میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور مسز جمیلہ انجکشن، سرنج، روئی، پلاسٹر ٹیپ اور دیگر ضروری اشیاء سے آراستہ ٹرالی دھکیلتی اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک میل نرس تھا۔ ان کی آمد نے ہم دونوں کو خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

مسز جمیلہ اور ان کے ہمراہ آنے والا میل نرس مجھے ڈرپ لگانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ میرے ذہن میں جوار بھاٹا کی سی کیفیت تھی اور لمحہ بہ لمحہ دل پر بوجھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میرے کانوں میں سنسناہٹیں تیز ہو رہی تھیں اور ذہن جواب دیتا محسوس ہو رہا تھا۔

مسز جمیلہ اور ان کا معاون کار میرے بائیں ہاتھ کی پشت کو دھیرے دھیرے سہلا کر اس رگ کو تلاش کرنے لگے جس کے ذریعے وہ زہر میرے جسم میں اتارا جا سکتا تھا جو مجھے ہمیشہ کے لیے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے محروم کرنے جا رہا تھا۔

میرا دم گھٹنے لگا اور سانسیں بے ترتیب ہو گئیں۔

کیا تیرے پاس اب بھی کوئی جواز رہ گیا ہے اس بیوفا، دھوکے باز، مکار، دغا باز اور ظالم شخص سے محبت کرنے کا؟

میں نے اپنے دل سے پوچھا۔

دل رو دیا۔

اور میں نے اپنے ہاتھ کی پشت پر سوئی کی چبھن محسوس کی۔

"ڈاکٹر..... !" میں چلا اٹھی۔

ڈاکٹر رئیسہ نے جو سرنج میں دوا بھر رہی تھیں مڑ کر میری طرف دیکھا۔

"میں ڈرپ نہیں لگواؤں گی۔" میں نے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔

"پلیز ہاتھ نہ ہلائیں سوئی ٹوٹ جائے گی۔" مسز جمیلہ نے گھبرا کر کہا۔

"میں نہیں لگواؤں گی۔" میں ضدی بچے کی طرح مچل گئی۔

"جسٹ اے منٹ....." ڈاکٹر رئیسہ نے کہا اور میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولیں۔ "کیوں نہیں لگواؤ گی؟"

"بس نہیں لگواؤں گی..... میں اپنے بچے کو قتل نہیں ہونے دوں گی۔" میں نے تڑپ کر کہا پھر میں نے مسز جمیلہ کو گھور کر دیکھا اور ہذیانی انداز میں چلائی۔ "سوئی نکالو ورنہ میں خود نکال دوں گی۔"

"آل رائٹ..... آل رائٹ..... نکالے دیتے ہیں سوئی..... تم اطمینان رکھو۔" ڈاکٹر رئیسہ نے کہا۔

پھر سوئی میرے ہاتھ کی پشت سے نکال دی گئی اور ڈاکٹر رئیسہ کا اشارہ پا کر مسز جمیلہ اور اس کا ساتھی کمرے سے باہر چلے گئے۔

"کیا بات ہے کیوں نہیں لگوانا چاہتیں تم ڈرپ..... میں جانتی ہوں تمہیں ماں بننے کی آرزو ہوگی مگر اس بچے کے دنیا میں آنے سے تم پر اور تمہارے شوہر پر ذلت و رسوائی کے در کھل جائیں گے۔ ڈاکٹر نیلوفر کی طرح کوئی اور بھی اس حقیقت سے باخبر ہو سکتا ہے کہ تمہارا شوہر باپ بننے کی صلاحیت سے محروم ہے۔"

"ڈاکٹر..... کبھی ہوا کرتا تھا وہ میرا شوہر مگر اب نہیں

ہے... اب تو اس بچے کا باپ میرا شوہر ہے" میں نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر رئیسہ نے کچھ اس طرح میری طرف دیکھا جیسے انھیں میری صحیح الدماغی پر شبہ ہو۔

میں اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

پھر

اپنے بچے کو اس زہر سے بچانے کے لیے مجھے ڈاکٹر رئیسہ کو سب کچھ بتانا پڑا۔ وہ تصویر حیرت بنی سنتی رہیں اور سب کچھ سننے کے بعد انھوں نے میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"گھبراؤ مت... خدا نے چاہا تو اب کوئی تمھارے بچے کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔ بس ایک چھوٹا سا ڈراما کرنا ہوگا تمھیں میرے اور ڈاکٹر نیلوفر کے ساتھ مل کر... آؤ میرے کمرے میں چلو۔ میں نیلوفر کو ابھی فون کر کے بلاتی ہوں"

شام کو جب شیراز ڈاکٹر رئیسہ کی معیت میں میرے کمرے میں داخل ہوئے تو میں بستر پر لیٹی تھی اور مجھے ڈرپ لگی ہوئی تھی مگر اس میں کوئی ایسا زہر شامل نہیں تھا جو میرے بچے کے لیے سم قاتل ثابت ہو سکتا۔

"کیسی ہو کلیمی؟" شیراز نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں... مگر مجھے آپ ٹھیک نہیں لگتے"

"میں....!" وہ ہنس دیے "آئی ایم پرفیکٹلی آل رائٹ"

"نو... یو آر ناٹ" میں نے اصرار کیا۔

تھری پیس سوٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح وجیہہ نظر آ رہے تھے اور ان کے سراپے سے اٹھتی "اراماس" کی مہک کمرے میں پھیل گئی تھی۔

"رازی! تمھاری خاطر میں اس منزل سے بھی گزر گئی۔ اب میری خاطر تمھیں بھی ایک کام کرنا ہوگا"

"ضرور... تم کہو تو سہی..."

"ڈاکٹر..." انھوں نے ڈاکٹر رئیسہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "آپ کے نرسنگ ہوم میں ایک لیبارٹری بھی تو ہے"

"جی ہاں ہے"

"آپ کے ہاں ایسے ٹیسٹ بھی ہوتے ہوں گے جن سے یہ پتا چلایا جا سکے کہ عورت اور مرد میں سے کون تولیدی صلاحیت سے محروم ہے؟"

"جی ہاں کیے جاتے ہیں ہمارے ہاں ایسے ٹیسٹ بھی" ڈاکٹر رئیسہ بولیں۔

"میں تو اپنے کھرے ہونے کا ثبوت دے چکی ہوں۔ آپ ان کا ٹیسٹ کروا دیجیے"

"کیا بکواس ہے!" شیراز دہاڑے۔

"چلاؤ مت رازی... میں تم سے زیادہ اونچی آواز میں چلا سکتی ہوں" میں نے کہا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو"

"ہو گئی تھی مگر اب میں اس دیوانگی کے حصار سے نکل آئی ہوں"

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر نیلوفر عاصمی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"ہیلو الوری بڈی" انھوں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

ان پر نظر پڑتے ہی شیراز کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

"غالباً انھیں تو تم ضرور پہچانتے ہو گے؟" میں نے کہا۔

"یہ پہچانیں یا نہ پہچانیں میں انھیں ضرور پہچانتی ہوں" ڈاکٹر نیلوفر پنسل ہیل سینڈلز پر کھٹ پٹ کرتی رازی کے روبرو جا کھڑی ہوئیں۔

شیراز نے منہ موڑ لیا۔

"جہاں تک میرا یقین کام کرتا ہے شیراز صاحب میری جانب سے مایوس ہونے کے بعد آپ نے ہماری لیبارٹری کے کسی اور شخص کو اپنے جال میں پھنسا کر اپنا مطلب نکلوایا ہوگا" ڈاکٹر نیلوفر نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔

"کیا مذاق ہے یہ!" شیراز بڑبڑائے۔

"مذاق نہیں یہ حقیقت ہے ایسی حقیقت جس کا آپ سامنا نہیں کر پا رہے ہیں ورنہ یوں منہ موڑ کر نہ کھڑے ہوتے" ڈاکٹر نیلوفر بولیں۔

شیراز کا جھکا ہوا سر، چہرے پر بکھری شرمندگی اور تشنگی کیفیت گواہ تھی کہ ڈاکٹر نیلوفر نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں نے دیکھا شیراز نے اضطراب کے عالم میں دونوں مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ ڈاکٹر رئیسہ نے میرے ہاتھ کی پشت سے سوئی نکال دی تھی۔ میں اٹھی پلنگ سے نیچے اتری اور شیراز کے روبرو جا کھڑی ہوئی۔ جس شخص کی محبت میں میں آبلہ پا ہو چکی تھی اسے نفرت سے دیکھنا بھی کچھ کم بڑی آزمائش نہ تھی۔

"سازی..... !" میں نے شیراز کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا: "آج دوپہر تک مجھے تم سے محبت تھی اور تمہارے عشق میں میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے محروم ہونے کو آمادہ ہو گئی تھی مگر اب مجھے تم سے نفرت ہو چکی ہے..... شدید نفرت سازی..... اتنی نفرت تو میں نے کبھی کسی سے کی تھی نہ کر پاؤں گی۔ اپنی سوتیلی ماں سے بھی نہیں..... مجھے تم سے نفرت ہو چکی ہے اور ہمیشہ تم سے نفرت کرتی رہوں گی..... آئی ہیٹ یو سازی..... آئی ہیٹ یو۔"

شیراز نے زہر خند نگاہوں سے مجھے دیکھا اور دروازے کا رُخ کرتے ہوئے دھمکی دی: "آئی ول سی یو۔"

"نو..... نو مسٹر شیراز! یو ول نیور بی ایبل ٹو سی ہر اگین۔" ڈاکٹر نفیسہ نے انھیں متنبہ کیا۔

"ورنہ آپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔"

ڈاکٹر نیلوفر کی اس بات پر شیراز نے یوں بلبلا کر ان کی جانب دیکھا جیسے انھوں نے شیراز کی پیٹھ گرم سلاخ سے داغ دی ہو۔

جھنجلا کر پاؤں پٹختے، مجھے بُری طرح گھورتے شیراز دروازے کی طرف بڑھے۔

"یہ لیتے جائیے مسٹر شیراز اور یاد رکھیے کہ پیسہ کبھی کبھی دھوکا بھی دے جاتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر نفیسہ نے سُرخ کرارے نوٹوں کی گڈی شیراز کی طرف اچھال دی جو ان کے قدموں میں جا گری۔ ربر بینڈ کے حصار میں جکڑی اس گڈی میں وہ رقم بھی شامل تھی جو صبح میں نے نرسنگ ہوم کے کاؤنٹر پر ادا کی تھی۔

مسز ہمدانی کے گھر تک مجھے ڈاکٹر نیلوفر نے چھوڑا۔ شام ڈھل چکی تھی اور مسز ہمدانی قدرے برافروختہ تھیں۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے کے ناگوار تاثرات مزید گہرے پڑ گئے۔

"بی بی! آگ پانی کا جو کھیل تم کھیل رہی ہو اس کا تماشا دیکھنا اب میری برداشت سے باہر ہو چکا ہے۔" انھوں نے خاصے ترش لہجے میں مجھ سے بات کی۔

"آپا..... !" میں نے سر جھکا کر کہا: "یہ کھیل اب ختم ہو چکا ہے..... آگ کے جس سمندر سے میں گزر کر آئی ہوں اس نے میری روح کو بھی داغ داغ کر دیا ہے۔ میرے دل پر شیراز کی اندھی محبت کے فریب نے جو زخم لگائے ہیں انھیں بھرنے میں بہت وقت لگے گا مگر اس ایک امید کے سہارے جیسے میں بڑی مشکل سے ایک دغاباز اور فریبی شخص سے بچ سکی ہوں، میں اس کڑی منزل سے بھی گزر جاؤں گی۔"

مسز ہمدانی نے نظریں تیز کر کے مجھے دیکھا اور بولیں: "میں نے نور کو ٹرنک کال کر کے سب کچھ بتا دیا ہے اور ہدایت کی ہے کہ وہ حالات کے مزید ابتر ہونے سے قبل یہاں پہنچ جائے۔"

"اوہ آپا! یہ آپ نے کیا کیا..... اب بھیا کو پریشان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔"

"خواہ دیر سے سہی میں نے اپنا فرض پورا کیا۔"

"کاش! کاش آپ تھوڑی دیر اور انتظار کر لیتیں میرا۔"

"پھر کوئی نیا مسئلہ سامنے لے آئی ہو گی۔" مسز ہمدانی نے کھٹک جانے والی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

"نہیں آپا کوئی نیا مسئلہ نہیں، بلکہ سارے مسائل اپنے دامن سے جھٹک کر ایک امید کی کرن بچا کر لائی ہوں۔" میں پل بھر کو رُکی پھر میں نے ان سے کہا: "آپا! پچھلے ہفتے میں نے اخبار میں "الفا ایڈورٹائزنگ" کی جانب سے ایک اشتہار دیکھا تھا۔ انھیں اپنی لاہور شاخ کے میڈیا ڈیپارٹمنٹ کے لیے ایک خاتون اسسٹنٹ کی ضرورت ہے۔ میں خود عسکری صاحب سے بات کرنے کی ہمت نہیں رکھتی، کیا آپ سفارش کر دیں گی؟"

مسز ہمدانی نے متذبذب نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

میری آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔

پھر مسز ہمدانی میرے قریب آئیں اور میرے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا: "بات کیا ہے آخر؟"

اس وقت مجھے ہمدردی اور اپنائیت ہی کی ضرورت تھی۔ میں نے دھیرے دھیرے انھیں سب کچھ بتا دیا۔ ساری کتھا سننے کے بعد انھوں نے ایک لمبی سانس کھینچی اور کہا: "عجیب اتفاق ہے بی بی کہ تمھاری خوش قسمتی تمھیں ایک ایسی مسیحا کے پاس لے گئی جس کے بارے میں میں نے سنا ہے کہ وہ خود بھی ایسے ہی ایک المیے کی شکار ہے۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے مسز ہمدانی کی طرف دیکھا۔

"ڈاکٹر نفیسہ میری ایک کولیگ کی نند جٹھانی ہوتی ہیں۔ خدا نے ہر نعمت سے نوازا ہے انھیں سوائے اولاد کے۔ سنا ہے کہ ان کی شادی کے کئی برس بعد بھی جب ان کے ہاں اولاد نہ ہوئی تو ان کی ساس نندوں نے انھیں بانجھ

سمجھنا شروع کر دیا اور ان کے میاں کو دوسری شادی پر اکسانا شروع کر دیا۔ اپنی ازدواجی زندگی خطرے میں پڑتی دیکھ کر ڈاکٹر رئیسہ نے مخصوص لیبارٹری ٹیسٹ کے ذریعے میاں اور ساس نندوں پر اپنی سرخروئی ثابت کرنے کی کوشش کی مگر میاں نے ان کی اجازت لیے بغیر دوسری شادی کر لی۔ دوسری بیوی سے بھی اولاد نہ ہوئی تو ماں بہنوں نے ڈاکٹر رئیسہ کے میاں کی تیسری شادی کروا دی۔ لیکن خدا کا کرنا تیسری شادی بھی بے ثمر رہی۔ پھر دوسری اور تیسری بیوی تو میاں سے طلاق لے کر علیحدہ ہو گئیں۔ ڈاکٹر رئیسہ ساتھ رہیں اور آج بھی ساتھ ہیں۔"

واقعی کیسا عجیب اتفاق تھا کہ میری مسیحا ایسا ہی دکھ کی شکار تھیں!

"آپا! عورت کے مقدر میں خدا نے کتنی آزمائشیں لکھ دی ہیں۔" میں نے بوجھل آواز میں کہا۔

"ہاں بی بی..... اور میرے مولا کا شکر ہے کہ اس نے عورت کو ان آزمائشوں سے گزر جانے کا حوصلہ بھی دیا ہے۔" مسز ہمدانی نے تائید کی۔

میرے تصور میں ڈاکٹر رئیسہ کا چہرہ چڑھتے چاند کی طرح ابھر رہا تھا۔

آٹھ دس روز کے اندر اندر بجیا کینیڈا سے پاکستان پہنچ گئیں۔ بیٹے کو وہ ہمراہ نہ لائی تھیں۔ دولہا بھائی بھی اپنی مصروفیات کے سبب نہ آ سکے تھے۔

بجیا کے آنے سے مجھے بڑی ڈھارس پہنچی۔ ان کے سینے سے لگ کر میں جس قدر رو سکتی تھی روئی۔ اپنے ماں جایوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ مسز ہمدانی نے بجیا کو تفصیل سے سب کچھ بتایا۔ داستان کے جن گوشوں سے وہ لاعلم تھیں، میں نے خود بجیا کو ان سے آگاہ کیا۔ بجیا نے مسز ہمدانی کی موجودگی میں مجھ سے کہا: "عینی بس مجھے بہت دکھ پہنچا ہے مگر میں خوش اور مطمئن ہوں کہ ایک خود غرض، دھوکے باز اور دروغ گو شخص سے تمھارا ناتا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ چکا ہے۔ جلال کو میں نے دیکھا نہیں، اس سے بات نہیں کی مگر تمھاری زبان سے جو کچھ سنا ہے اس کی بنا پر میں وثوق سے تو نہیں اندازاً یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ وہ ان مردوں میں سے ہے جو اپنی بیویوں کو اپنی عزت اور وقار سمجھتے ہیں۔ ورنہ وہ یہ ہرگز نہ کہتا کہ وہ تمھیں کسی قیمت پر طلاق نہیں دے گا۔ میں اس سے ملنا پسند کروں گی۔"

"ممکن ہے۔ پاپا! جلال کے خلاف تو میں نے خلع کا دعویٰ کر رکھا ہے عدالت میں۔ چودہ تاریخ کو پیشی بھی ہے۔"

"شکر ہے کہ ابھی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔" ویجیہ نے کہا اور مسز ہمدانی نے تائید میں گردن ہلائی۔

"فیصلہ نہیں ہوا ہے پاپا مگر ایک بات طے ہے کہ جس مصلحت سے میں اس کی زندگی سے نکلی ہوں اس نے جلال کے دل میں میرے لیے نفرت کے سوا اور کچھ نہیں چھوڑا ہوگا۔"

"ہو سکتا ہے نہیں۔" ویجیہ نے تذبذب کے عالم میں کہا۔

▲

تیرہ تاریخ کی رات کا ذکر ہے۔ ویجیہ پاپا شام سے مسز ہمدانی کے ہمراہ اپنی ایک دیرینہ دوست سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔

اور میں اینکسی میں تنہا پڑی اپنے مقدر کی ستم ظریفی پر رو رہی تھی کہ اچانک اینکسی کا دروازہ کھلنے کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ان آنسوؤں کو بجائے چھپانے کے لیے جو میری آنکھوں میں امڈتے ہوئے تھے میں نے کروٹ بدل کر دروازے کی جانب دیکھنے کی ہمت نہیں کی اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی گویا میں سو چکی تھی۔

دھیرے دھیرے چلتا کوئی میرے نزدیک آ بیٹھا۔ اور مجھے اپنے دائیں بازو پر ایک ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ میں نے دونوں لب باہم بھینچ لیے مبادا سسکی نکل جائے۔

"مجھے افسوس ہے کہ وہ تصویر جس کے دو شکستہ ٹکڑوں کو باہم جوڑنے کی کوشش آپ نے مجھ سے کی تھی وہ میں نہیں جوڑ سکا... وہ کبھی جوڑی نہیں جا سکتی تھی۔"

میں نے اپنا چہرہ جو اپنی بازوؤں کے بیچ دبکائے پڑی تھی جھٹک کر بازوؤں کے درمیان سے نکالا۔ جو آواز میں نے سنی تھی وہ جلال کی تھی اور جو چہرہ میرے سامنے تھا وہ جلال کا تھا۔

میں حواس باختہ ہو کر اٹھ بیٹھی۔

"تم... تم... یہاں... کیسے... آ گئے؟" میں نے بدقت تمام پوچھا۔

"اپنی اسکوٹر پر۔" وہ مسکرا دیا۔

"کیوں؟" میں نے اس کے جواب پر جز بز ہوتے ہوئے کہا

"مقدمے کا فیصلہ سننے۔"

میں شرمندہ سی ہو گئی۔

"وہ آپ کی ویجیہ مجھے بہت اچھی لگیں... بہت پُر وقار،

بے حد با اخلاق اور آپ سے اشتیاق محبت کرنے والی۔"

"اور تم ویجیہ سے مل چکے ہو؟"

"جی ہاں وہ اپنی دوست مسز ہمدانی کے ساتھ گاڑی میں میرے قریب سے گزرتے ہوئے نکل گئی تھیں اور میں ان کی گاڑی کے پیچھے پیچھے اپنی اسکوٹر دوڑاتا ہوا ابھی کچھ دیر پہلے ہی یہاں تک پہنچا ہوں۔"

"اوہ!"

مجھے ویجیہ کہہ گئی تھیں کہ وہ مسز ہمدانی کے ساتھ اپنی کسی دیرینہ دوست سے ملنے جا رہی ہیں۔

"میں نے سنا ہے ایک تصویر جو عرصہ دراز سے آپ بھی بنا رہی ہیں وہ ہنستی مسکراتی اور جیتی جاگتی ہو گئی ہے؟"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اس کے لبوں پر شریر سی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں وہ والہانہ پن جو عورت کو مرد کی محبت کا یقین دلاتا ہے۔

اس نے میرے شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر دھیرے سے کہا

"آئی لو یو... آئی لو یو ڈیئر!"

میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ مرد جس سے میرے تعلق کی بنیاد میری خود غرضی پر مبنی تھی اس والہانہ پن سے مجھ سے محبت کا اظہار کرے گا۔

"آپ نے خواہ کچھ بھی جانا ہو میں نے آپ کا ہاتھ پورے خلوص، محبت اور نیک نیتی سے تھاما تھا میں آپ سے محبت کرتا تھا، کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔"

میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ میری بد نیتی کو در گزر کر دے گا۔

میری آنکھیں بھر آئیں اور آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

میں اپنی تیرہ بختی پر بہت رو چکی تھی۔

یہ آخری آنسو تھے۔

بھول بھلیوں اور فریب کے حصار سے نکل کر بالآخر میں ایک سیدھے سادے، صاف ستھرے اور سبک رستے پر نکل آئی تھی۔

جلال میرے بہت نزدیک آ چکا تھا اور میرے تصور میں بنتا ہوا ادھورا سا پھول چہرہ، ستارہ آنکھوں والا ایک گل گوتھنا سا بچہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ہیلو ممّا!

ہائے پپا!

آئی وش یو بیسٹ آف لک!!

شب گزیدہ

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو انسانی زندگی میں کچھ اس طور در آتا ہے کہ صاف نظر آنے لگتا ہے۔ یگانگت اور بیگانگت کے دبیز پردوں میں چھپا ہوا یہ جذبہ اپنے اندر ایثار کے ساتھ ساتھ خود غرضی اور مصلحت کا عنصر بھی رکھتا ہے۔ ایک سچے اور حقیقی عاشق کے لیے بہ یک دل ہی کی نہیں بلکہ دماغ کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور وہ عشق جو محض دل کی طاقت سے سہارا دیئے جانے میں کبھی بڑے عشق قرار نہیں دیے جاتے۔ کامیاب عشق کے لیے دل اور دماغ کی مشترکہ صلاحیتوں کا ہونا از بس ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ان آخری صفحات میں شامل ہونے والی اس کہانی کی مرکزی کردار ایک ایسی دوشیزۂ عشق پیشہ ہے جو محبوب کے طویل انتظار سے تھک گئی تھی۔ اس کی تھکن اتنی جان لیوا تھی کہ وہ ستانے کے لیے کسی دوسرے شجر کی چھاؤں میں پناہ لینے کو تیار ہو گئی اور یہی اس کہانی کا کلیدی موڑ ہے مگر پھر اس کے بعد محبت کے بجھنے والے چراغوں میں روشنی نہ

تھی وہ دور مستقل شک کی ہوا تب سے ایک لمحہ بھی [illegible] زندہ کر سکتے

وہ چودھویں کے چاند اور تاروں سے سجی موسم بہار کی ایک دلفریب اور پرسحر رات تھی۔ تقریباً ساڑھے گیارہ کا عمل تھا۔ میں دوسری شفٹ میں اپنی آخری ہفتے وار ڈیوٹی سے فراغت پانے کے بعد ساحل سمندر پر واقع اپنی جائے کار سے بس اسٹاپ کی طرف جو مری جائے کار سے کافی دور تھا مسے لاابالی انداز میں دونوں ہاتھ اپنی پتلون کی جیبوں میں اڑسے محمد رفیع کے ایک مشہور گیت کی دھن سیٹی پر بجاتا ہے ساری کی ساری دنیا میری جیب میں کی تفسیر بنا اپنی دھن میں مگن جھومتا جاتا کبھی سر پر سایہ فگن تاروں بھرے آسمان کو اور کبھی دور سمندر میں نظر آتی جہازوں کی رنگ برنگی روشنیاں

کر سکتا تھا کیوں کہ میں اس زمانے میں پر حیرانی جہاں آنکھ کے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ چاند تاروں سے مرصع یہ خوب صورت آسمان کس قدر حسین ہے کہ ساتھ اچھے اور بُرے ہر دو قسم کے لوگوں کو اپنے ساتھ لگائے رکھتا ہے۔ میں اس وقت ساحل کے ایسے حصے سے گزر رہا تھا جہاں رات کے سناٹے گیارہ بجے تو کجا دن میں بھی سیر و تفریح کی غرض سے آنے والا کوئی فرد شاذ ہی نظر آتا تھا۔ البتہ ہم جیسوں کی مجبوری تھی کہ ہمیں اپنی جائے کار تک آنے جانے کے دوران ساحل کے اس حصے سے لازماً گزرنا پڑتا تھا۔ سمندر کی طرف سے آنے والی بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا کے لمس پر مجبور لگے مجھے بے خود کیے دے رہے تھے۔ میں اس وقت خود کو اس محفل سے باہر نکلا پا رہا تھا جس میں دل کے ارمانوں اور لوگوں کی موجودگی میں محسوس کیا کرتا تھا۔ اگلے روز ہفتہ واری تعطیل تھی اور لمبی تان کر سونے کا تصور مجھے ایک عجیب طمانیت اور مسرت بخش رہا تھا۔ دفعتاً میری نظر ایک عورت پر پڑی اور میں ٹھٹک کر رہ گیا۔

وہ سمندر کے ساتھ ساتھ ساحل پر ایستادہ پختہ فصیل پر اپنی ہتھیلیاں ٹکائے سمندر کا رُخ کیے کھڑی تھی۔ پورے چاند کی روشنی میں اس کا سراپا نمایاں واضح تھا۔ وہ سر تا پا سیاہ لباس میں ملبوس تھی۔ دوپٹہ اس کے شانوں پر پڑا تھا۔ سر برہنہ تھا اور دراز زلفیں پشت پر لہرا رہی تھیں۔ میں فقط اس کی پشت دیکھ سکتا تھا مگر وہ پشت سے بھی سراپا بہار دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دنیا و مافیہا سے قطعاً بے نیاز سی کھڑی تھی۔ رات کے اس پہر ویران ساحل سمندر پر ایک عورت کو تنہا کھڑا دیکھ کر میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ عام زندگی میں میں خاصا شرمیلا جھینپو، قدرے بزدل اور عورت سے دور دور رہنے والا نوجوان واقع ہوا تھا۔ خود کو کسی عورت کے سامنے پا کر میرے دل کی یہی کیفیت ہو جایا کرتی تھی بلکہ ہاتھ پاؤں بھی کچھ ٹھنڈے سے پڑ جایا کرتے تھے۔ اس کا سبب سمجھنے سے میں قاصر تھا... ہاں مزہ تو تماشا یہ تھا کہ عام زندگی میں عورت ذات سے خائف ہونے کے باوجود میرے خواب، میری آرزوئیں ایک عورت ہی کے تصور سے سجی تھیں... اس عورت کے تصور سے جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جس سے میں حقیقی زندگی میں کبھی ملا نہیں تھا۔ مگر جو میری آنکھ لگتے ہی ہر روز ایک نئے روپ میں میرے خوابوں میں در آیا کرتی تھی۔

ساحل سمندر پر کھڑی پُربہار سراپا والی اس تنہا عورت کو دیکھ کر میرے دل نے چپکے سے کہا: کہیں یہ وہی تیرے خوابوں والی عورت تو نہیں؟

"شاید وہی ہو۔" میں نے اپنے دل سے کہا اور میرا دل پہلے سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ نوجوان دکھائی دیتی ہے

میں نے بھی ہوا کی نمی کی اس آرائی کی۔

وہ میرے دل کی اس گرانی اور میری سوچوں سے بے نیاز پرسکون سمندر کا رُخ کیے کھڑی تھی اور اپنی سوچوں میں اس قدر مستغرق تھی کہ اس کے عقب میں میری موجودگی بھی اس کے استغراق میں خلل انداز نہ ہو سکی۔

پہلے سی فراہمت کر کے اس کے قریب پہنچو اور پوچھو تو سہی کہ وہ کون ہے اور رات گئے اس سنسان ساحل پر کھڑی کیا کر رہی ہے؟ میرے دل نے سرگوشی کی۔

لیکن بُرا ہو میری اس کم ہمتی کا جس نے ہمیشہ کی طرح مجھے اس وقت بھی ڈرانا اور سہمانا شروع کر دیا۔ مجھے اپنا حلق خشک محسوس ہونے لگا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے۔ اپنی بزدلی اور کم ہمتی کو کوستا میں آگے بڑھ جانے کو تھا کہ دفعتاً دبی دبی سی سسکیوں نے میری سماعت کے راستے میرے قدم روک لیے۔ میں ایک بار پھر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اور میں نے کان پوری توجہ سے اس کی سمت لگا دیے۔ ذرا سی توجہ سے چند ہی لمحوں میں یہ بات عیاں ہو گئی کہ سسکیاں سمندر کے رُخ کھڑی اسی تنہا عورت ہی کی تھیں۔ یک بیک میرے دل میں خلا جاگنے لگا اور اس کے لیے ڈھیروں ہمدردی امڈ آئی۔ باوجود یہ کہ میں عورت ذات کی جانب پیش قدمی کے سلسلے میں بہت سادہ، بزدل اور کم دل واقع ہوا تھا لیکن میں نے اس موقع کو کسی عورت سے ہم کلام ہونے اور اس کا قرب حاصل کرنے کا سنہری موقع جانا۔ اظہار ہمدردی کر کے ہی میں بہ آسانی اس سے بے تکلف ہونے کا فائدہ حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن بُرا ہو میری بدقسمتی کا جو اس بار آڑے آ گئی۔ ابھی میں اس اجنبی خاتون سے اس کی گریہ و زاری کا سبب دریافت کرنے اور اظہار ہمدردی کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر ہی رہا تھا کہ اس نے دائیں جانب اپنی گردن کو ساٹھ درجے کے زاویے پر گھما کر میری جانب دیکھا اور مجھے کوئی ایسا ویسا آدمی جان کر بلا توقف پختہ فصیل کے ساتھ ساتھ ساحل پر چلنا شروع کر دیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس سے ہم کلام ہونے کے لیے مناسب ترین الفاظ کی تلاش میں اپنا ذہن دوڑانے لگا۔ چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ تھم گئی اور اس نے گردن موڑ کر اپنے عقب میں دیکھا اور مجھے اپنے پیچھے آتا دیکھتے ہوئے یک بیک اپنا رُخ بدل لیا۔ سمندر کے پہلو میں ایستادہ پختہ فصیل کے متوازی چلنے کے بجائے اس نے ساحل کے پہلو میں دراز پختہ سڑک کا رُخ کیا۔ ریت پر سے چلتی وہ سڑک تک پہنچی، ایک بار پھر اپنے عقب میں دیکھا۔ مجھے پھر اپنے پیچھے دیکھ کر اس نے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے سڑک عبور کی اور سڑک کے اس پار فٹ پاتھ پر ہو لی میں

سڑک عبور کر کے اس کے پیچھے جانے کی جرأت نہ کر سکا۔ تاہم میرا
دل اس کے لیے مضطرب ہو رہا تھا اور میں اپنی کم ہمتی پر خود کو ملامت
کرتے ہوئے بصد ملال سوچ رہا تھا کہ کاش میں نے اس سے اس کی
گریہ و زاری کا سبب تو پوچھ لیا ہوتا! سڑک کے کنارے ایستادہ
بجلی کے کھمبوں کی روشنی میں، میں اسے لمبے لمبے ڈگ بھرتے دیکھ
رہا تھا اور آخری حسرت بھری نگاہ اس پر ڈالنے کے بعد اپنے راستے
پر ہو لینا ہی چاہتا تھا کہ غیر متوقع طور پر میرے حق میں ایک غیبی امداد
آ پہنچی!

اچانک فٹ پاتھ پر اس نوجوان عورت کی مخالف سمت سے
ایک نوجوان لڑکھڑاتا، بَل کھاتا، اس کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کی
چال بتا رہی تھی کہ یا تو وہ نشے میں دھت تھا یا پھر وہ مخبوط الحواس
تھا۔ عورت اپنے راستے سے ذرا ہٹ کر قدرے سمٹتے ہوئے چلنے
لگی۔ جونہی وہ نوجوان کے قریب سے گزری اس نوجوان نے اس
کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لڑکی کے منہ سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی اور وہ
اپنا ہاتھ اس شہدے کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔
میں نے آن کی آن زقند لگائی، سڑک پار کی اور دوڑتا ہوا موقع واردات
پر جا پہنچا۔ مذکورہ نوجوان میرے اندازے کے مطابق واقعی نشے
میں تھا۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی اور وہ اس نوجوان
خاتون سے دست درازی کی کوشش کرتے ہوئے لڑکھڑاتے
ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا "میری جان! اکیلی کہاں جا رہی ہو؟ آؤ
ہمارے ساتھ چلو!" میں جو عام زندگی میں لڑائی جھگڑے اور دنگا فساد
سے ہزار کوس دور رہنے کا عادی تھا، پلک جھپکتے نہ جانے کس جذبے
اور کس قوت کے تحت ہرکولیس بن بیٹھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، میں نے
فلمی اداکاروں کے سے انداز میں اس بدقماش پر گھونسوں کی بارش
کر دی۔ اپنے ہوش میں تو وہ تھا ہی نہیں، زمار رسہ کے چاروں شانے
چت ہو گیا۔ پھر میں نے لاتوں سے اس کی تواضع شروع کرتے
ہوئے مذکورہ خاتون کی جانب دیکھا تو وہ ایک پُرشباب دوشیزہ
نظر آئی۔

"خبیث! شرم نہیں آتی؟ گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں کیا؟"
میں نے دانت پیستے ہوئے غصے اور حقارت سے کہا۔

"ابے ماں بہنیں تو ہیں، گھر والی نہیں ہے۔" وہ بدبخت
فٹ پاتھ سے اٹھ کر اپنا شانہ سہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے ایک زوردار مکا اس کے رخسار پر جڑا۔ پھر لڑکی
کی جانب توجہ کی۔ وہ چاند چہرہ اور ستارہ آنکھوں والی دوشیزہ تھی۔
میرے تصور، میرے خوابوں کی حسینہ سے حسین تر! آسمان پر دمکتے
چاند تاروں اور سڑک کے دو رویہ ایستادہ بجلی کے کھمبوں کی روشنی
میں اس کا خوبصورت چہرہ بدر کامل دکھائی دے رہا تھا۔ اس
کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں خوف و ہراس کی پرچھائیاں
تھیں۔ اور اس کے گلاب کی پنکھڑیوں کے سے لبوں پر ہلکی ہلکی
لرزش طاری تھی۔ شاید اس کا پورا سراپا ہی لرز رہا تھا۔ چہرے مہرے
سے وہ زیادہ سے زیادہ بیس بائیس برس کے لگ بھگ نظر آتی تھی۔

"خاتون! آپ گھبرائیں نہیں، میں آپ کی مدد اور دفاع
کر رہا ہوں۔" میں نے بڑی رسانیت سے کہا۔

اتنے میں اس بدبخت نوجوان کی شامت اسے ایک مرتبہ
پھر میرے روبرو کھینچ لائی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا میرے سامنے آ کھڑا ہوا
اور بولا: "ابے! تو کدھر سے آ گیا رنگ میں بھنگ ڈالنے؟" پھر اپنا
سینہ ٹھونکتے ہوئے اس نے کہا: "ابے! یہ ہماری محبوبہ ہے، کیا
سمجھا؟" اور ستارہ آنکھوں والی اس دلربا حسینہ کی جانب پیش قدمی
کرنا چاہی۔

وہ گھبرا کر الٹے قدموں پیچھے ہٹی، اچھلی اور لپک کر میرے
قریب آ کھڑی ہوئی۔ پھر اس نے بے اختیار میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے
ایک جھٹکا سا لگا۔ زندگی میں پہلی بار کوئی عورت اور وہ بھی ایسی
دلکش اور دلربا میرے اتنے نزدیک کھڑی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ
کسی عورت نے میرا ہاتھ تھاما تھا۔ مجھے اپنی روح میں امرت سا
گھلتا محسوس ہونے لگا۔ اس بدمست نوجوان کا سارا نشہ گویا میری
رگوں میں سرایت کر گیا۔ میں نے اسے مخمور نگاہوں سے دیکھتے
ہوئے جی ہی جی میں کہا: "اے میرے بدمست حریف! کس
زبان سے میں تیرا شکریہ ادا کروں کہ تیرے طفیل... ہاں تیری خرمستی
کے طفیل اس نازنین نے میرا ہاتھ تھاما ہے۔ کاش! تو ساری زندگی
یہیں کھڑا رہے تاکہ یہ ہاتھ میری روح میں یونہی امرت گھولتا رہے
اور میں ساری زندگی یونہی سحر زدہ اور مخمور کھڑا رہوں... کاش...!
اے کاش!"

مگر اس بدبخت نے میرے من کی اس بے صدا التجا پر کان
دھرنے کے بجائے اپنی شامت کو ایک بار پھر آواز دیتے ہوئے

لبوں اور داڑھیوں کے گچھوں پر پلا جو دھڑ میں ناقابل انتقال تھا
نظر آتا ہے۔ ہمیں اس دعوے پر کوئی اعتراض نہیں، ہم بلا
اختیار سے اتنی گزارش ضرور ہے کہ وہ صرف مخصوص ٹکٹ
ہی میں "ناقابلِ استعمال" والی گزارش نہ دیں بلکہ اس فہرست
میں بیچارے مسافروں کو بھی شامل کر لیں جو سفر کے دوران
"ناقابلِ استعمال" ہوا ٹکٹ جیب میں رکھنے کے باوجود استعمال
کر جاتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی کتاب "روزن دیوار سے" کے ایک باب "جعلی ٹکٹ کی حرمت" سے

میرے منہ کو آنے کی کوشش کی اور بولا "مردود! دوسرے کی چیز پر ہاتھ ڈالتا ہے؟"

تو میری آنکھیں چاہا تھا کہ اس دلربا حسینہ کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لوں مگر اس پہلی ہی چولفردی کی دھاک بٹھانے کی خاطر ایسا کرنا ضروری سمجھا اور میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا پھر پوری قوت سے میں چار نکتے اس خانماں خراب کے اس طرح جڑ دیئے کہ اس کا منہ پھر کر رہ گیا اور چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس نے نعرہ کی ایکائی لی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا "میرے بھائی! میرے باپ! جانے بھی دے مجھے معاف کیا... آئندہ ایسا نہ..." میں نے پھر ایک گھونسا اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ بلبلا اٹھا اور اپنا منہ سہلاتا دم دبا کر بھاگ نکلا۔

اس کے بھاگ نکلنے کے بعد میں نے فتح مندانہ نگاہوں سے اس نازنین کی جانب توجہ کی تو وہ نگاہیں جھکا کر ممنون لہجے میں بولی "آپ کا بہت بہت شکریہ"۔

"کوئی بات نہیں اس وقت آپ کی مدد کرنا میرا اخلاقی فرض تھا" میں نے کہا۔

"اگر آپ نے اس وقت میری مدد نہ کی ہوتی تو خدا جانے کیا ہوتا؟" وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔

"محترمہ! ہوتا تو بہرحال وہی تھا کیوں کہ منظور خدا یہی تھا" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ پھر قدرے شاکی لہجے میں بولا "مگر آپ ایک شریف آدمی سے خواہ مخواہ خائف ہو کر تقریباً دوڑتے ہوئے ساحل سے سڑک کا رخ نہ کرتیں اور پھر تقریباً دوڑتے ہوئے ہی سڑک پار کرنے کے بعد فٹ پاتھ پر ہر انسان اور تنہا نہ جا رہی ہوتیں کہ شاید خدا کو یہ سب کچھ منظور نہ ہوتا"۔

"میں آپ کو سمجھ بیٹھی تھی" وہ سر جھکا کر خجالت سے بولی "دراصل میں یہ سمجھی تھی کہ شاید آپ بھی..."

"بھائی تو خیر اب بھی نہیں ہیں آپ مجھے" میں نے کہا۔

"نہیں، اب تو خیر کسی حد تک جان چکی ہوں" اس نے رشوق سے کہا۔

"کس حد تک؟" میں نے برجستہ پوچھا۔

"اس حد تک کہ آپ ایک شریف آدمی ہیں"۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟ شرافت کی کوئی مہر تو لگی نہیں ہے میری پیشانی پر"۔

"مہر لگی ہو یا نہ لگی ہو لیکن پورے یقین سے یہ بات کہہ سکتی ہوں کہ آپ ایک شریف آدمی ہیں"۔

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر آپ یہ بات کیوں کر کہہ سکتی ہیں؟"

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ پھر بولی "ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ بدمعاش یہاں تھا اور میں نے اس سے خوف زدہ ہو کر آپ کا ہاتھ بے اختیار اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا تو آپ کا ہاتھ بری طرح کانپنے لگا تھا اور کچھ ٹھنڈا بھی پڑ گیا تھا"۔

"اوہ! تو آپ نے بوجھ لیا کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں" میں نے گری ہوئی میں اس حسین دوشیزہ کی ذہانت کا اعتراف کرنے کے بعد مزید کہا "آپ کا اندازہ غلط نہیں ہے۔ ہاں واقعی یہ سچ ہے کہ میں خواتین سے انتہائی شرماتا ہوں۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تردد نہیں کہ اس وقت بھی ایک خاتون کو اپنے روبرو پا کر میرے دل کی حالت دگرگوں ہے۔ مجھ پر ایک نامعلوم سا اضطراب طاری ہے۔ شاید اس وقت بھی کچھ اسی طرح خود کو آپ سے خائف پا رہا ہوں جیسا کہ کچھ دیر قبل آپ... خود خائف دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے یہ سب کچھ ایک خواب سا محسوس ہو رہا ہے بلکہ اس کے کہ شاید میں خواب میں بھی ایک خاتون سے ہم کلام ہونے کی توقع کر سکتا تھا نہ جسارت"۔

"حیرت ہے!" اس نے تعجب سے کہا "میں یقین نہیں کر سکتی کہ ایک بدمعاش مرد سے نمٹ لینے والا آپ جیسا بہادر مرد، صورت ذات سے اس قدر خائف ہو سکتا ہے۔ کہیں آپ یہ سب کچھ مذاق میں تو نہیں کہہ رہے؟"

"ہرگز نہیں" میں نے کہا "بلکہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ حرف بحرف درست ہے۔ دیکھیے اگر اس وقت آپ نے میرا ہاتھ اپنی گرفت میں لینے پر اسے کپکپاتا ہوا محسوس کیا تو اس کا سبب فقط یہی تھا کہ آپ کے دست نازک سے پہلے میرا ہاتھ ایسے کسی نسوانی ہاتھ نے نہیں تھاما تھا۔ میں خواتین سے بہت شرماتا ہوں۔ مجھے ان سے بات کرتے ہوئے انتہائی جھجک محسوس ہوتی ہے بلکہ جھجک کیا محسوس ہوتی ہے، آپ یہ سمجھیے کہ میں کسی خاتون سے بات کر ہی نہیں سکتا۔ آپ پہلی خاتون ہیں اس دنیا کی جن سے میں اس قدرے بےتکلفی کے ساتھ بات کر رہا ہوں۔ مجھے یہ خدشہ خواتین سے ہم کلام ہونے سے ڈرایا کرتا ہے کہ شاید مجھے خواتین سے ہم کلام ہونے کا ڈھنگ ہی نہیں آتا۔ یقین کیجیے، اس وقت بھی میرا دل اس خیال سے کانپے جا رہا ہے کہ کہیں میں آپ سے کوئی غلط یا معیوب بات تو نہیں کر رہا ہوں... دیکھیے اگر کوئی ایسی بات نکل گئی ہو میری زبان سے یا آئندہ نکل جائے تو مجھے فوراً ٹوک دیجیے گا۔ کیا کوئی ایسی بات کہی ہے میں نے جو آپ کو ناگوار گزری ہو؟"

"ہرگز نہیں" وہ مسکرا کر بولی پھر اس نے قدرے دھیمی آواز میں کہا "ایک بات بتاؤں میں آپ کو کہ بیشتر خواتین

شرمیلے مردوں کو ہی پسند کرتی ہیں اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تردد نہیں کہ خود مجھے بھی آپ جیسے شرمیلے اور مہذب مرد ہی اچھے لگتے ہیں۔"

میرا دل دیوانہ وار ناچنے لگا۔

"آئیے چلتے جائیں اور باتیں کرتے جائیں۔"

"کہاں چلتے جائیں؟"

"میرے گھر تک۔"

"کیا آپ یہیں کہیں رہتی ہیں؟"

"جی ہاں۔ وہ جو سامنے گھر نظر آ رہے ہیں آپ کو، انہی میں سے ایک گھر میں رہتی ہوں۔" اس نے کچھ دور روشن دانوں والے گھروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو گویا آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو آپ کے گھر تک پہنچا دوں اور آپ رستہ میں میرا شکریہ ادا کر کے خدا حافظ کہتی اپنے گھر میں چلی جائیں۔"

"کیا یہ کافی نہ ہوگا؟"

"نہیں۔" میں نے تڑپ کر کہا۔ "بلکہ سچ پوچھیے تو یہ ظلم ہوگا مجھ پر اور گناہ ہوگا آپ پر۔"

"میں سمجھی نہیں۔" اس نے قدم آگے بڑھائے اور مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔

"دیکھیے میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میری پچیس سالہ زندگی میں آپ پہلی خاتون ہیں جن سے میں اس طرح بات کر رہا ہوں۔ یہ بات ہرگز نہیں کہ آپ سے پہلے میں کسی خاتون سے ہم کلام نہیں ہوا ہوں۔ بے شک چند خواتین کا میری زندگی میں کچھ نہ کچھ عمل دخل رہا ہے مثلاً بوڑھی خوابانی جس کے مکان کے ایک کمرے میں پے انگ گیسٹ کے طور پہ رہتا ہوں۔ مگر ان خواتین کی حیثیت میرے نزدیک خاصی بزرگ اور محترم ہستیوں جیسی ہے۔ یوں سمجھیے کہ مادرانہ اور خواہرانہ سی۔ شاید آپ یقین نہ کریں مگر یہ سچ ہے کہ آپ سے مل کر مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں برسوں سے اپنے خوابوں میں بسنے والی اس لڑکی سے مل رہا ہوں جو میری آئیڈیل ہے۔"

"خوب! تو گویا آپ آئیڈیلز پر یقین رکھتے ہیں؟"

"ہاں! میں آئیڈیلسٹ ہوں۔" میں نے کہا "اور مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن میں خوابوں سے باہر حقیقی دنیا میں بھی اپنی آئیڈیل کو پا لوں گا اور اس کے سامنے زندگی میں اپنے جذبات یونہی کھول کر رکھ دوں گا جیسے کہ میں خوابوں میں کیا کرتا ہوں۔"

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ خوابوں میں اپنی آئیڈیل سے کیا باتیں کیا کرتے ہیں؟"

"پھر تو پوچھیے۔"

"پھر بھی۔"

"آپ خوابوں اور آئیڈیل کی بات چھوڑیے، میرے دل کی بات پوچھیے۔"

"چلیے دل ہی کی بات بتا دیجیے۔"

"دل کی بات تو یہ ہے۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچتے ہوئے کہا "کہ بیسیوں بلکہ سیکڑوں مرتبہ میرا دل چاہا ہے کہ کسی نوجوان اور خوبرو دوشیزہ سے ہم کلامی کا شرف حاصل کر کے سکون تنہائی میں اپنا دل اس کے سامنے کھول کر رکھ دوں۔ اسے بتاؤں کہ میں کس قدر تنہا اور دل گرفتہ ہوں۔ اس بھری پری دنیا میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے مجھے کبھی قابل اعتنا سمجھا ہو۔ میرے تنہا اور الم رسیدہ دل پر محبت بھرے دو لفظوں کے پھائے رکھے جائیں اور اسے یہ سب کچھ بتانے کے بعد بصد لجاجت اس سے گزارش کروں کہ عورت ہونے کے ناتے اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ مجھ جیسے تنہا اور اداس شخص کو، اپنوں کی طرح ناقابل التفات گرداننے کے بجائے لائق محبت جانے۔ اسے بتاؤں کہ میں اس سے فقط اتنا چاہتا ہوں کہ وہ میرے دل کی بات پوری ہمدردی کے ساتھ سنے۔ اگر میرے غم پہ ہنسنا چاہتی ہے تو ضرور ہنسے، بے تکلف میرا مضحکہ اڑائے مگر محبت اور ہمدردی کے دو بول مجھ سے ضرور بولے۔ میرے مایوس اور تنہا دل میں امید کی جوت ضرور جگا دے، چاہے اس کے بعد وہ دوبارہ مجھے خود سے ملنے کی اجازت نہ دے۔"

میں نے دیکھا وہ میرے اس جذباتی مکالمے پر منہ چھپا کر ہنسنے لگی تھی۔

"آپ ہنس رہی ہیں! خیر کوئی بات نہیں۔ اگر آپ میرا مضحکہ اڑا کر خوش ہونا چاہتی ہیں تو بھی میں برا نہیں مناؤں گا۔" میں نے قدرے دل گرفتگی سے کہا۔

"غلط مت سمجھیے۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "میں آپ کا مضحکہ نہیں اڑا رہی ہوں بلکہ میں تو آپ کی سادگی پہ ہنس رہی ہوں۔" وہ پل بھر کو رکی پھر بولی۔ "آپ نے کسی خاتون سے یہ سب کچھ کہنے کی کوشش تو کی ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی رحم دل اور مہربان خاتون بشرطیکہ وہ احمق نہ ہوتی یا اس وقت کسی اور سبب سے بیزاری و خفگی کے عالم میں نہ ہوتی آپ کی خواہش کا ضرور بالضرور احترام کرتی اور آپ سے محبت اور ہمدردی کے دو بول ضرور بولتی۔" اس نے دوبارہ توقف کرنے کے بعد کہا۔ "مگر میرا یہ خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس خاتون نے آپ کو دیوانہ ہی گردانا ہوتا۔ کیوں کہ پہلے میں نے جس خیال کا اظہار کیا وہ سراسر میری اپنی مرضی کے مطابق تھا۔"

"میں سمجھی نہیں آپ کی بات۔"

"میرا مطلب ہے میں چونکہ ایک نرم دل لڑکی ہوں اس لیے اگر آپ جیسے کسی دل گرفتہ شخص نے مجھ سے ایسی ہی دل گرفتگی اور لجاجت سے جس کا اظہار آپ کر رہے ہیں، ہمدردی اور محبت کے دو بول کی طلب گاری ظاہر کی ہوتی تو میں یقیناً اسے مایوس کرنے کی ہمت نہ کر پاتی۔"

"اوہ! شکریہ... بہت شکریہ... ہزار شکریہ!" میں نے انتہائی خوشی سے مغلوب ہوتے ہوئے کہا۔ "آپ اندازہ نہیں کر سکتیں کہ آپ کے ان الفاظ نے مجھے میری زندگی کی کتنی بڑی مسرت سے ہمکنار کر دیا ہے۔"

"اچھا اب آپ یہ بتائیے کہ آپ نے مجھ میں ایسی کون سی بات دیکھی جس کی بنا پر آپ نے مجھے ان خواتین سے جدا کر ڈالا جو بقول آپ کے آپ کی زندگی میں مداخلت ضرور ہوئی تھیں مگر رنگ اور محترم حیثیت میں۔ میرا مطلب ہے وہ ایسی کون سی بات تھی جس نے آپ کو میری جانب متوجہ کر ڈالا؟"

"یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جبھی آپ تنہا تھیں اور وہ نامعقول شخص آپ کو تنگ کرنے کے درپے تھا۔ آپ کی مدد کرنا میری اخلاقی فرض داری تھی۔"

"نہیں نہیں! میں اس سے پہلے کی بات کر رہی ہوں۔"

"پہلے کی؟" میں نے استفہامیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں جب میں وہاں سمندر کنارے فصیل کے ساتھ کھڑی تھی اور آپ مجھے دیکھ کر اچانک ٹھٹک گئے تھے اور جب میں آپ کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے وہاں سے ہٹی تو آپ نے میرا تعاقب کرنے کی کوشش بھی کی مگر پھر نہ جانے کیوں رک بھی گئے تھے۔"

"اوہ! تب!" میں قدرے خجل ہو گیا پھر میں نے کہا۔

"دراصل آج پہلی تاریخ ہے اور میری جیب بھاری ہے۔ ہر تنخواہ دار آدمی کی طرح میں بھی جیب بھاری ہونے کے احساس سے سرشار و مسرور خوش خوش گھومتا گھامتا چلا جا رہا تھا کہ آپ تنہا کھڑی نظر آئیں۔ میں آپ کو دیکھ کر رک گیا مگر پھر آگے بڑھ جانے کو ہی تھا کہ آپ کی دبی دبی سسکیوں نے میرے قدم پکڑ لیے۔ معاف کیجیے گا میں اگر غلطی پر نہیں ہوں تو آپ واقعی رو رہی تھیں۔ ایک ناتوان عورت کو رات گئے سمندر کنارے تنہا کھڑے اور روتے دیکھ کر میں آگے بڑھ جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ میں نے آپ سے آپ کی گریہ زاری کا سبب پوچھنا اپنا اخلاقی فریضہ جانا اور بجائے آگے بڑھ جانے کے ٹھہر گیا۔ مگر آپ نے مجھے غلط قسم کا آدمی سمجھتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ میں بھی چپ چاپ آپ کے پیچھے چلتے ہوئے آپ سے ہم کلام ہونے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈتا رہا مگر ابھی میں آپ سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر پایا تھا کہ آپ نے رخ بدلا اور سڑک عبور کر لی اور مجھ سے دور نکل گئیں۔ آپ نے مجھے غلط آدمی سمجھا جب کہ میں تو آپ سے آپ کے رونے کا سبب فقط اس خیال سے دریافت کرنا چاہتا تھا کہ شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔" میں نے لحظہ بھر کو توقف کرنے کے بعد کہا۔ "امید ہے اب آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ میں آپ کی جانب کیوں متوجہ ہوا تھا۔ اگر اس وضاحت کے باوجود بھی آپ کے دل میں میری بابت کوئی بدگمانی ہو تو اسے رفع کر ڈالیے۔"

"بس اب اور کچھ مت کہیے اس سلسلے میں۔" وہ سر جھکا کر خجالت سے بولی پھر اس نے مزید کہا۔ "مجھے اعتراف ہے کہ اس وقت میں آپ کو کوئی ایسا ویسا آدمی ہی سمجھی تھی مگر اب میری رائے یکسر بدل چکی ہے۔" وہ چلتے چلتے تھم گئی اور اس نے کہا۔ "اچھا اب میرا گھر تو آ پہنچا۔ وہ دیکھیے میں اس سامنے والے گھر میں رہتی ہوں۔" اس نے انگلی سے ایک بڑے مکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کی تمام بتیاں ماسوا صدر دروازے کے ستونوں پر نصب برقی لیمپوں کے گل تھیں۔ "میں آپ کی بہت ممنون ہوں اور اب اجازت چاہتی ہوں۔"

"کیا ہم پھر کبھی نہیں ملیں گے؟"

اس نے میری جانب دیکھا پھر پورے چاند کی نقرئی روشنی میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "آپ نے تو محبت اور ہمدردی کے فقط دو بول کی طلبگاری ظاہر کی تھی اور اب آپ... بہرحال، اگرچہ میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتی اور نہ ہی کرنا چاہتی ہوں مگر میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ ہم پھر ملیں گے۔"

میرا دل نامعلوم سی خواہش سے بے تحاشا دھڑکنے لگا۔

"فکر نہ کیجیے! اگرچہ آج میری آخری نائٹ ڈیوٹی تھی۔ اور اب دو ہفتوں بعد ہی نائٹ ڈیوٹی شروع ہو گی مگر میں کل رات پھر یہاں آؤں گا اور فصیل کے پاس آپ کی راہ دیکھوں گا۔ معاف کیجیے گا آپ بھی سوچیں گی کہ یہ نامعقول آدمی تو پیچھے ہی پڑا جا رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں آپ کر تو رہے ہیں خاصی بے تابی کا اظہار۔ کر رہے ہیں نا؟ بلکہ سچ پوچھیے منہ پکڑتے پکڑتے کوئی دلو... پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سچ بتاؤں آپ کو" میں نے جذبات کی شدت سے بوجھل آواز میں کہا۔ "میں خوابوں کی دنیا میں رہنے والا آدمی ہوں۔ جیسی مسرت مجھے آج ملی ہے حقیقی زندگی میں ایسی بالفرض مسرت سے میں کبھی دوچار نہیں ہوا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خوابوں میں بھی میں نے ایسی مسرت کا مزہ شاید کبھی نہیں چکھا۔ وہ شاید اس لیے

کہ جس ذائقے سے آدمی حقیقی زندگی میں کبھی آشنا نہ ہوا ہو اس کا مزہ وہ خواب میں بھلا کیونکر چکھ سکتا ہے۔ مگر اب جب کہ میں آپ جیسی نوجوان اور خوبرو خاتون سے نہ صرف ہم کلامی کا شرف حاصل کر چکا ہوں بلکہ آپ کی زبان سے اپنے لیے ہمدردی اور محبت کے رس بھرے کلمات بھی سن چکا ہوں، یہ تجربہ مجھے اپنی زندگی کا حاصل محسوس ہو رہا ہے۔ آج ساری رات آپ میرے خوابوں کا محور بنی رہیں گی۔ بلکہ شاید پورا ہفتہ میں آپ ہی کو اپنے خوابوں کا محبوب دیکھتا رہوں گا... بلکہ پورا برس... نہیں تمام زندگی میں اپنے خوابوں میں آپ ہی کو دیکھتا رہوں گا۔ دیکھیے آپ دوبارہ ملنے اور کل یہاں آنے کا وعدہ کریں یا نہ کریں میں کل شب پھر اسی وقت سمندر کنارے آؤں گا۔ ٹھیک اسی مقام پر جہاں آپ کھڑی تھیں اور وہاں کھڑے ہو کر سمندر کی موجوں کا دل گداز شور سنتے ہوئے میں آج کے تصور سے کل کو روشن کروں گا۔ یقین کیجیے کہ اس مقام کو میں اب ساری زندگی نہیں بھول سکوں گا۔ میں بلکہ یہاں آؤں گا اور کبھی سمندر کو اور کبھی چاند کو تکتے ہوئے آپ کے تصور سے اپنی تاریک راتوں کو روشن کرنے کی کوشش کروں گا اور کیا عجب کہ آج کے دن کی یاد مجھے بھی اسی طرح گریہ وزاری پر مجبور کر دے جیسا کہ کچھ دیر قبل میں نے آپ کو کرتے دیکھا تھا۔"

وہ میرے اس طویل جذباتی مکالمے سے خاصی متاثر نظر آنے لگی۔

"میرا خیال ہے کل رات دس بجے میں پھر وہاں آؤں گی۔ میرا مطلب ہے سمندر کنارے فصیل کے پاس۔ آپ اگر چاہیں تو وہاں آ سکتے ہیں۔" اس نے کہا۔ پھر ہلکی سی تنبیہ کے ساتھ بولی "مگر دیکھیے آپ یہ نہ سمجھیے کہ میں بطور خاص آپ سے کوئی وعدہ وعید کر رہی ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اپنے ہی کسی کام سے رات دس بجے وہاں آنا ہے۔ اگر آپ آنا چاہیں تو آ جائیے گا۔ مجھے آپ سے ہمدردی اور محبت کے دو بول بول کر مسرت ہو گی۔ مگر آپ اپنے دل میں میری جانب سے کوئی غلط خیال مت آنے دیجیے گا۔ خدانخواستہ یہ نہ سمجھ بیٹھیے گا کہ شاید میں اجنبی مردوں پر ہمیشہ یونہی پلک جھپکتے مہربان ہو جایا کرتی ہوں۔ میں آپ پر اتنی مہربان نہ ہوتی اگر... مگر خیر اس امر کو آپ میرا ہی راز رہنے دیجیے۔" اس نے پل بھر کو توقف کیا پھر بولی۔ "آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا..."

"اوہ! آپ حکم کیجیے۔ میں آپ کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دوں گا۔ آپ فقط وعدہ کرنے کی بات کرتی ہیں، جان بھی مانگیں گی تو آپ پر نثار کر دینے سے دریغ نہیں کروں گا۔ میں آپ کا فرماں بردار اور تابعدار رہوں گا... اب تو آپ مجھ سے واقف ہو ہی چکی ہیں، آپ کو میری طبیعت کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہو گا۔"

"بہت اچھی طرح۔" وہ ہنس کر بولی۔ "اور اسی واقفیت کی بنا پر میں آپ کو کل رات یہاں آنے اور ملنے کی اجازت بھی دے رہی ہوں مگر واضح رہے کہ یہ اجازت مشروط ہو گی۔"

"مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہو گی۔" میں نے بے تابانہ کہا۔

"اچھا تو سنیے۔ شرط یہ ہے کہ آپ مجھ سے کوئی غلط توقع منسوب نہیں کریں گے۔ زیادہ واضح الفاظ میں اس بات کو میں یوں کہنا چاہوں گی کہ آپ اپنے دل کو میری محبت میں گرفتار نہیں ہونے دیں گے۔"

"کیوں؟" میں نے بے ساختہ کہا۔

"کیوں کہ اس کا فائدہ کچھ نہ ہو گا۔ میرے لیے یہ امر قطعاً بعید از امکان ہے کہ میں کسی اجنبی کی محبت کو اپنے دامن میں سمیٹ سکوں۔ میں آپ کی دوست بننے کو تیار ہوں بلکہ تیار کیا ہوا بن ہی چکی ہوں مگر آپ مجھ سے محبت کرنے کی غلطی ہرگز نہیں کریں گے۔"

"میں... میں قسم کھاتا ہوں کہ..." اس سے آگے میری آواز گھٹ کر رہ گئی۔

"ارے نہیں! مجھے آپ سے کوئی قسمیہ وعدہ نہیں چاہیے۔ سچ پوچھیے تو آپ کو یہاں دوبارہ بلانے میں کچھ میری اپنی غرض بھی ہے۔ مجھے ایک اہم معاملے میں مشورہ درکار ہے اور بدقسمتی سے میرا کوئی دوست نہیں جو مجھے مشورہ دے سکے کیوں کہ میں کسی راہ چلتے سے تو مشورے کی طلبگار ہو نہیں سکتی تاہم آپ مجھے ذرا مختلف قسم کے آدمی لگتے ہیں۔ شاید کسی کی بیس سالہ رفاقت بھی اسے میرے لائق اعتماد نہ بناتی جتنا کہ میں اس مختصر دورانیے کی ملاقات کے بعد آپ کو سمجھ رہی ہوں۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ آپ مجھے مایوس نہ کریں گے۔"

"آپ مجھ پر بھروسا کر سکتی ہیں لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کل رات کا انتظار میں بھلا کیونکر کر سکوں گا۔ کیسے گزریں گے آئندہ بائیس گھنٹے؟"

"گھر جا کر گہری نیند سو جائیں اور نیند میں بھی اس خیال کو ذہن سے محو نہ ہونے دیں کہ میں نے آپ پر بھروسا کرتے ہوئے اپنی زندگی کے اہم ترین معاملے میں آپ سے مشاورت کی ٹھانی ہے۔"

"کیا آپ میرے صبر کا امتحان لینے کے بجائے مجھے اس معاملے سے آج اور ابھی آگاہ نہیں کر سکتیں؟"

"اتنی بے تابی مت دکھائیے۔ فی الحال اسے راز ہی رہنے دیجیے۔"

"آپ کا مطلب ہے کل رات تک؟"

"ہوسکتا ہے کل تک، اور یہ بھی ممکن ہے کہ پرسوں یا پھر اس کے بعد۔ دراصل میں وہ اہم معاملہ آپ کے گوش گزار کرکے آپ سے مشورہ لینے سے قبل آپ سے تفصیلی تعارف حاصل کرلینا چاہتی ہوں۔"

"گویا آپ ابھی میری جانب سے تذبذب میں ہیں؟"

"نہیں، یہ بات نہیں بلکہ میں بے تکلفی اور دوستی کی فضا میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں، تفصیل سے اور کھل کر میں چاہتی ہوں کہ اپنے بارے میں کچھ بتانے سے پہلے میں آپ کے بارے میں جتنا بھی جان سکتی ہوں، جان لوں۔"

"ٹھیک ہے، میں کل رات آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔ میرے خدا! مجھے تو یہ سب کچھ ایک خواب سا لگ رہا ہے یا شاید یہ کوئی معجزہ ہے۔ اس مختصر سی ملاقات میں آپ نے مجھے بے اندازہ خوشی دی ہے... ٹھیک ہے کل رات میں آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔"

"میں آپ کی منتظر رہوں گی۔"

"وہیں جھیل کے نزدیک؟"

"ہاں، وہیں۔"

"اچھا تو میں آپ کو آپ کے گھر کے دروازے تک پہنچا دوں۔"

"نہیں نہیں میں آپ ہی چلی جاؤں گی، دو قدم کا تو فاصلہ ہے۔"

"جیسے آپ کی مرضی... تو مجھے اجازت ہے؟"

"ہاں، بالکل اجازت ہے۔"

"خدا حافظ!"

"خدا حافظ!"

اس رات میں خوشی کے مارے تمام رات جاگتا رہا۔ آنے والی کل کا تصور میرے دل کے نہاں خانوں میں چمن زار مہکائے دے رہا تھا!

★

اگلی رات جب میں وقت مقررہ سے قبل مقام مقررہ پر پہنچا تو اس کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ مجھے تقریباً دو گھنٹے اس کا انتظار کرنا پڑا۔ جب وہ آئی تو میں نے بے تابانہ کہا۔ "دو گھنٹے سے میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ کاش! تم جان سکتیں کہ میں نے کل کی رات اور آج کا دن کتنی مشکل سے گزارا ہے۔"

"بہرحال گزار تو لیا نا!" وہ مسکرا کر بولی۔

"کیا خیال ہے ذرا آگے نہ چل کر بیٹھیں، قدرے تاریکی میں تاکہ لوگوں کی نظروں میں نہ آئیں؟"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

"آؤ تو پھر آگے چلتے ہیں۔"

ہم ساحل کے نیم روشن حصے سے قدرے تاریکی میں جا بیٹھے۔

"یہاں ہم لوگوں کی نگاہوں کی پروا کیے بغیر اطمینان سے باتیں کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اور آج ہم اوٹ پٹانگ باتیں کرنے کے بجائے ڈھنگ کی باتیں کریں گے۔ خدا معلوم میں کل کیا کچھ کہہ گئی اور آپ نے نہ جانے کیا سمجھا ہوگا۔" وہ بولی۔ پھر اس نے مزید کہا۔ "کل رات میں بھی تادیر جاگتی رہی اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچی کہ آنے والی کل یعنی آج جب ہم ملیں گے تو ذرا سنجیدگی سے باتیں کریں گے اور پہلے میں آپ کے بارے میں ساری تفصیل معلوم کروں گی..."

"کیا مطلب، کیسی تفصیل؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب ہے آپ کون ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ کہاں رہتے ہیں؟ وغیرہ، دوسرے الفاظ میں یہ سمجھیے کہ میں آپ کی کہانی سننا چاہتی ہوں، یعنی آپ کی داستان حیات۔"

"کیا تمہارے خیال میں میری کوئی کہانی ہوسکتی ہے؟"

"کیوں نہیں، ہر شخص اپنے ساتھ ایک کہانی لیے پھر رہا ہے... اپنی کہانی اور سچی کہانی۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ میری بھی کوئی کہانی ہے۔"

"میں مان ہی نہیں سکتی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ ہر شخص کی کوئی نہ کوئی کہانی ضرور ہوتی ہے۔"

"یقین کرو، میری کوئی کہانی نہیں ہے۔ میں تو خوابوں کی دنیا میں رہنے والا ایک انسان ہوں جو حقیقی زندگی میں بہت کم لوگوں سے ملتا ہے، بہت کم لوگوں سے بات کرتا ہے اور وہ بھی ضرورتاً۔ ایک شرمیلے اور ڈرپوک آدمی کی بھلا کیا کہانی ہوسکتی ہے؟"

"نہیں ایسا تو نہیں کہ میری دادی جان کی طرح آپ کی بھی کوئی نانی یا کوئی سخت گیر دادی ہوں جو آپ کو باہر نکلنے، لوگوں سے ملنے اور ان سے بات کرنے کی اجازت نہ دیتی ہوں؟"

"نہیں، میری کوئی دادی یا نانی نہیں مگر کیا واقعی تمہاری دادی جان اسی قدر سخت ہیں؟"

"جی تو یہ کہیے ایسی ویسی سخت گیر اور بلا کی شکی۔ پتا ہے یہ کوئی دو سال پہلے کی بات ہے، مجھ سے کچھ گستاخی سرزد ہوگئی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، مجھے دن بھر دادی جان کے گھٹنے سے

لٹ کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ وہ صبح ہوتے ہی میری قمیص کا دامن
اپنی قمیص کے دامن سے باندھ لیتی ہیں۔ دن بھر مجھے ان کے
ساتھ یوں ہی بندھے بندھے رہنا پڑتا ہے۔ وہ کروشیا یا سلائی
پر بنائی کیا کرتی ہیں اور میں یا تو سلائی کڑھائی کرتی رہتی ہوں یا
انھیں کوئی کتاب پڑھ کر سنایا کرتی ہوں۔ کسی اشد ضرورت کے
تحت ہی گرہ کھول کر اٹھ پاتی ہوں ورنہ تو دادی جان کے ساتھ بندھے
رہنا پڑتا ہے۔ اب آپ خود سوچیے کہ کیا یہ مضحکہ خیز صورت حال
نہیں کہ تقریباً دو برس سے میں اپنی بوڑھی اور نابینا دادی جان
کے ساتھ صبح سے شام تک بندھی بیٹھی رہتی ہوں! جب رات
ہونے لگتی ہے تب دادی جان خود گرہ کھول کر میری قمیص کا دامن
اپنے دامن سے جدا کیا کرتی ہیں۔"

"حیرت کی بات ہے! خدا کا شکر ہے کہ میری ایسی کوئی
دادی نہیں۔" میں نے کہا۔

"تو پھر آپ لوگوں سے کیوں نہیں ملتے؟"

"بس مجھے اچھا نہیں لگتا یا یہ مجبوری ہے مجھے اپنے خول میں
ہی رہنا پسند ہے۔"

"کمال ہے! آپ خدا جانے کیسے آدمی ہیں۔ سچ میرا
تو اتنا جی چاہتا ہے باہر نکلنے، لوگوں سے ملنے اور ان سے باتیں
کرنے کو کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی! میں تو دادی جان کے پہلو
سے لگ کر بیٹھے بیٹھے بھی تصور ہی تصور میں ایک شہزادے
سے شادی بھی کر لیتی ہوں!"

"خوب! تو گویا میری طرح تم بھی خوابوں کی دنیا میں
رہا کرتی ہو!"

"شاید... مگر میں مردوں سے اس درجہ خائف نہیں جیسے
کہ آپ بقول آپ کے عورت ذات سے ہیں۔ خیر یہ بحث
چھوڑیے، آپ اپنی کہانی سنائیے مجھے۔"

"کیا سنا دوں! بہت مختصر اور بظاہر بڑی عجیب سی ہے
میری کہانی تو!"

"جیسی بھی ہے اور جو کچھ بھی ہے آپ سنائیں تو!"

"ابھی بات شروع کرتا ہوں مگر کیا یہ بہتر نہ ہوگا
کہ پہلے ہم ایک دوسرے کا نام تو جان لیں؟"

"میں بھی کتنی بے وقوف ہوں، مجھے تو اب تک اس کا
دھیان ہی نہیں آیا!"

"کوئی بات نہیں، مجھے خیال آ گیا ہے سو بتائے دیتے
ہیں ایک دوسرے کو اپنا نام... میرا نام مونس ہے۔"

"اور مجھے الفت کہتے ہیں۔"

"بھلا سا اور بڑا بامعنی نام ہے!"

شکریہ!"

"اچھا تو اب میں اپنی کہانی شروع کرتا ہوں۔ ذرا سنو کہ
کیسی عجیب و غریب داستان ہے یہ!"

"آپ شروع کیجیے میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

میں نے ایک ہلکی سی کھنکار کے ساتھ گلا صاف کیا اور
اپنی کہانی کچھ یوں شروع کی۔

"میں خوابوں کی دنیا میں رہنے والا آدمی ہوں۔ زندگی کی
کڑوی حقیقتوں سے مجھے ہول آتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ
ہو کہ والدین کے انتقال کے بعد میرا بچپن اور لڑکپن انھی تلخ حقیقتوں
کے بیچ گزرا ہے۔ اس تلخی کو کم کرنے کی خاطر میں نے خوابوں میں
پناہ لی اور ایک خول میں محصور ہو گیا اور اب عالم یہ ہے کہ میں اس
خول ہی کو کل کائنات سمجھتا ہوں اور اس سے نکلنا پسند نہیں کرتا۔ اس
وسیع و عریض دنیا میں میرا کوئی مونس و رفیق نہیں۔ لوگوں سے مجھے
ایک نامعلوم سا خوف محسوس ہوتا ہے۔ میں ان سے ملتے ہوئے
ہچکچاتا ہوں اور اگر بھولے سے بھی میرے غریب خانے پر کوئی مہمان
آ نکلے تو میں بلی کے اس بچے کی طرح سہم جاتا ہوں جسے شرارتی
بچوں نے اپنی حرکتوں سے اس قدر تنگ کیا ہو کہ معمولی سی آہٹ
پر بھی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور وہ خوف زدہ نگاہوں سے
ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سمٹ کر چوکنا ہو جائے۔ میری اس ہچکچاہٹ
کو دوسرے لوگ بھی محسوس کیے بنا نہیں رہتے چنانچہ جو ایک
مرتبہ مجھ سے ملتا ہے وہ مجھ سے دوبارہ ملنے کی خواہش نہیں کرتا۔
شاید لوگ مجھے اکل کھرا سمجھتے ہوں۔ لیکن حقیقت وہی ہے جو میں
تمھیں پہلے بتا چکا ہوں کہ میرے بچپن اور لڑکپن کے حالات نے
مجھے ایک خول میں محصور کر دیا ہے۔ یہ خول میری پناہ گاہ ہے جہاں
تلخ حقیقتوں کے بجائے میٹھے اور سہانے سپنوں کا راج ہے اور
میں ان سپنوں کو سینے سے لگا کر زندگی کی کڑوی حقیقتوں سے فرار
حاصل کیا کرتا ہوں..."

"مونس صاحب! اس وقت تو آپ خوابوں کی دنیا سے
نکل آئیں اور آگے چلیں، میں بے تابانہ آپ کی کہانی سننے کی
منتظر ہوں۔"

"الفت!" میں نے بوجھل آواز میں کہا۔ "یہ میں تمھیں اپنی
کہانی نہیں سنا رہا ہوں تو اور کیا ہے۔ برائے خدا اب مجھے نہ ٹوکنا۔ تم
نہیں جانتیں کہ اس وقت میں کتنا جذباتی ہو رہا ہوں۔ اس
وقت مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرے لبوں پر لگی خاموشی
کی مہر یک لخت ٹوٹ گئی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے
میں جنم جنم سے تم سے واقف ہوں اور صدیوں تمھاری تلاش میں
کسی سودائی کی طرح بھٹکنے کے بعد آج ہی تم سے ملا ہوں۔ تم سے مل کر مجھے

یک بار گویا میرے ذہن کے بیک ہزاروں وہ محفل سجتے ہیں اللہ کر چپ ہو کر لفظوں کے آبشار میں بہہ کر ہمیشہ کے لیے گم ہو جاؤں گا اس لیے میری تم سے التجا ہے کہ چپ چاپ ایک اچھی اور سعادت مند لڑکی کی طرح میری بات سنو اور مجھے ٹوکنے کی اب اور کوئی کوشش نہ کرنا اور اگر تم خاموشی سے سننے کے لیے آمادہ نہیں ہو تو میں اپنی کہانی سناتا ہی نہیں ہوں۔"

"نہیں، نہیں! آپ اطمینان رکھیں، میں اب مداخلت نہیں کروں گی اور چپ رہوں گی۔" اس نے کہا۔

"وعدہ؟"

"بالکل۔"

"الفت!" میں نے دوبارہ اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ "حقیقی زندگی میں، میں عورت ذات سے خائف رہا کرتا ہوں لیکن میرے خوابوں کا محور ایک عورت ہی ہے جو ایک بوڑھے اور دیو نما بدصورت شوہر کے شکنجے میں ہے۔ وہ مجھ سے پیار کرتی ہے اور میں اس سے مگر ہم اس بدہیئت بوڑھے کے خوف سے ایک دوسرے سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کر پاتے۔ ہمیں دنیا والوں کا خوف بھی ہے جو سچی محبتوں کو بھی میلی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ پھر ایک روز میں کسی اجنبی کی زبان سے یہ مژدۂ جانفزا سنتا ہوں کہ بوڑھا مر چکا ہے اور پھر میری محبوبہ رنگ و نور کے سیلاب اور گلابوں کے جلو میں مجھ سے آملتی ہے۔ 'میں آزاد ہو چکی ہوں!' وہ کہتی ہے اور میرے سینے سے اپنا سر ٹکا کر سسکنے لگتی ہے۔"

میرے خاموش ہو جانے پر الفت نے میری جانب استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا اور بولی: "آپ چپ کیوں ہو گئے؟"

"کیوں کہ میری کہانی بس اتنی ہی سی ہے۔"

میرا خیال تو تھا کہ وہ ہنس پڑے گی مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا: "کیا آپ ہمیشہ ایسے ہی خواب دیکھتے ہیں؟"

"ہاں۔"

"اور ہمیشہ اسی طرح اپنے خول میں محصور رہتے ہیں؟"

"ہاں۔"

"اور کب تک اپنے خول میں محصور یونہی خواب دیکھتے رہیں گے؟"

"شاید ساری زندگی!"

"نہیں، ساری زندگی ایسا مت کیجیے گا!" وہ تڑپ کر بولی۔ "ورنہ شاید مجھے بھی ساری زندگی دادی جان کے ساتھ بندھ کر بیٹھ رہنا پڑے گا۔ کیا آپ کے خیال میں اس طرح کی زندگی گزارنا اپنی ذات کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی نہیں؟"

"ہاں میں جانتا ہوں۔ مجھے اس امر کا بخوبی احساس ہے اور خود اپنی ہی ذات کے ساتھ اپنی اس ناانصافی پر میں اپنے آپ کو اکثر برا بھلا بھی کہتا رہا ہوں۔ جب سے میں تم سے ملا ہوں تب سے تو اور شدت سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے کئی سنہری سال ضائع کر دیے اور اب تمہارے کہنے پر یہ احساس اور گہرا ہو گیا ہے۔ مستقبل کے اندیشے میرے دل کو ہولائے دے رہے ہیں۔ حقیقی زندگی میں اپنے خوابوں کے مرکزی کردار یعنی تم سے ملنے، تمہاری زبان سے خلوص اور اپنائیت کے بول سننے اور تمہیں اپنے اتنے قریب بیٹھا دیکھنے کے بعد اب میرے پاس خواب میں دیکھنے کو بچا ہی کیا ہے۔ خدا تمہیں خوش رکھے کہ تم نے مجھے دھتکارنے کے بجائے اپنائیت کا برتاؤ کیا اور مجھے موقع دیا کہ میں اپنی آیندہ زندگی میں فخر سے کہہ سکوں کہ میری زندگی میں بھی دو راتوں کے ازل پھر ایسے ہیں جنھیں میں حاصلِ زیست کہہ سکتا ہوں!"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ گزشتہ رات جب تم پہلی بار مجھے ملی تھیں اور آج رات جب تم نے مجھے دوبارہ ملنے کا موقع دیا، جو وقت میں نے کل تمہارے ساتھ گزارا اور جو آج گزار رہا ہوں اس کی یاد مستقبل میں میری تاریک راتوں کو مہکاتی رہے گی۔"

"تو کیا آپ آیندہ مجھ سے ملنے نہیں آئیں گے؟"

"کیا مجھے اس کی اجازت ہے؟" میں نے ایک ناقابلِ بیان خوشی سے معمور ہو جانے والے دل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"بالکل... آپ آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔"

"اوہ! الفت! تم نہیں جانتیں کہ تم نے مجھے کیسی خوشی سے سرفراز کر دیا ہے۔ اب میں خود کو اپنی ذات سے ناانصافی کرنے پر نہیں کوسوں گا۔ مجھے یک بیک تمام اندھیرے مٹتے محسوس ہو رہے ہیں۔ میرے دل سے نامعلوم خوف کا احساس چھٹ گیا ہے۔ مایوسی کے سائے روشنی میں تبدیل ہوتے محسوس ہو رہے ہیں۔ خوابوں کی وہ دنیا جو مجھے اپنی پناہ گاہ محسوس ہوا کرتی تھی، اب ایک حماقت محسوس ہوتی ہے۔ واقعی میں احمق تھا جو حقیقی زندگی کی مسرتوں سے کٹ کر اتنے برس خوابوں میں گم رہا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ حقیقت اتنی دلفریب ہو گی! اب تو ان خوابوں کی ناگزیر ... لینے کو جی چاہتا ہے۔ کاش! میں نے اتنا بہت سا وقت لاحاصل خوابوں میں گم رہنے کی حماقت کی نذر نہ کیا ہوتا۔ کیا دیتے ہیں یہ خواب انسان کو سوائے اس کے کہ ان کے پیچھے دوڑتے دوڑتے انسان بے دم ہو جاتا ہے اور بکھر کر تنہا رہ جاتا ہے۔ جیسا کہ انھوں نے مجھے تنہا کر دیا تھا۔ اگر تم نہ ملی ہوتیں تو میرے

دامن میں صفر کے سوا اور بھلا کیا ہوتا ہے"

"بس کیجیے اب انتہا درجہ بھی مت ہوں۔ ورنہ شاید آپ کی باتیں مجھے رُلا دیں گی۔ جو ہوا سو ہوا۔ گزرا وقت تو اب واپس نہیں آسکتا مگر یہ طے ہے کہ اب ہماری دوستی سدا قائم رہے گی خواہ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ ویسے آپ یہ جان لیں کہ میں بالکل معمولی سی لڑکی ہوں۔ زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں ہوں۔ دراصل میرے والدین کے ایک حادثے میں انتقال کر جانے کے بعد حالات کچھ ایسے رہے کہ میں انٹرمیڈیٹ کے بعد تعلیم حاصل نہ کر سکی۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے اپنے بارے میں بہت کچھ بتا دیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تنہائی کا جیسا گہرا احساس آپ کو ہے کچھ ویسا ہی مجھے بھی ہے۔ آپ کو آپ کے والدین نے دنیا سے الگ تھلگ کر دیا جب کہ مجھے دادی جان نے۔ ویسے آپ کے اندازِ گفتگو اور آپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں... میرا اندازہ درست ہے نا؟"

"نہیں کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ بی اے پاس ہوں اور بس۔"

"لیجیے، بی اے بھی کچھ کم ہوتا ہے کیا! پورے چودہ جماعتیں۔ یہ بتائیے آپ کرتے کیا ہیں؟"

"ایک نجی انشورنس کا ملازم ہوں۔"

"اب میں آپ سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکی ہوں۔" اس نے کہا، پھر کچھ توقف کیا پھر بولی۔ "یہ بتائیے کہ اگر میں آپ پر بھروسا کرتے ہوئے آپ کو اپنی کہانی سنا دوں تو کیا آپ مجھے کچھ مشورہ دے سکیں گے؟"

"کیسا مشورہ؟"

"وہ تو آپ کو میری کہانی سننے پر ہی پتا چلے گا۔ فی الحال تو آپ وعدہ کیجیے کہ مجھے مشورہ دیں گے۔"

"دیکھو! میں نے کہا نہ میں معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی ہوں اور مجھے آج تک کسی کو مشورہ دینے کا اتفاق نہیں ہوا ہے مگر تمھارے طرزِ عمل نے مجھے ایسی ان کہی مسرت بخشی ہے کہ میں تمھارے لیے اپنی جان تک دے سکتا ہوں!"

"نہیں، مجھے جان نہیں چاہیے۔" وہ ہنس کر بولی۔ "فقط مشورہ چاہیے۔"

"اچھی بات ہے۔" اس کی ہنسی نے مجھے خفت سے دوچار کر دیا۔

"رازداری شرط ہو گی۔"

"میں بھلا کس سے کہنے جاؤں گا!"

"وعدہ؟"

"پکا وعدہ!"

"اچھا تو اب میں اپنی داستان شروع کرتی ہوں۔"

★

"سو تس صاحب! میری آدھی کہانی تو آپ سُن ہی چکے ہیں یعنی میری ایک ضعیف العمر اور نابینا دادی جان ہیں۔ اب میں آپ کو اپنی بقیہ داستان سناتی ہوں۔" اس نے مدھم سُروں میں کہا۔

میں بے ساختہ ہنس پڑا اور اس سے کہا: "یہ خاتون! بات سنو! اگر آپ کی بقیہ آدھی داستان بھی اسی قدر مختصر ہے تو واللہ یہ اختصار ایک عالمی ریکارڈ ہو گا۔"

"اچھا اب یوں مذاق نہ اڑائیے میرا۔" وہ بولی۔ "چپ چاپ سنیے بلکہ پہلے تو وعدہ کیجیے کہ آپ درمیان میں نہیں بولیں گے، چپ چاپ سنیں گے۔"

"حساب برابر کرنے کی کوشش کر رہی ہو!"

"یہی سمجھ لیجیے۔"

"اچھی بات ہے چُپ بیٹھوں گا۔"

"وعدہ؟"

"جی بالکل پکا وعدہ جناب!"

"اچھا تو سنیے... میں چھوٹی سی تھی کہ میرے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد میں دادی جان کی سرپرستی میں آ گئی۔ دادی جان کے پاس دادا مرحوم کا چھوڑا ہوا بہت کچھ تھا۔ میرے ڈیڈی کے ترکے نے اس میں مزید اضافہ کر دیا۔ دادی جان اس وقت بھی جب کہ میں ان کی سرپرستی میں آئی ساحلِ سمندر پر واقع اسی بڑے سے گھر میں رہا کرتی تھیں جہاں کہ ہم اب بھی رہتے ہیں۔ دادی جان نے مجھے بہت پیار دیا۔ میری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ مجھے اچھے اسکول میں داخل کروایا۔ میرے لیے ٹیوٹر رکھا اور مجھے والدین کی کمی کا احساس نہ ہونے دینے کی ہر ممکن کوشش کی مگر میری بدقسمتی کہ جن دنوں میں نویں جماعت میں تھی، دادی جان کی دونوں آنکھوں میں موتیا بند اُتر آیا۔ آپریشن کروایا جو کامیاب رہا مگر پھر نہ جانے کیسے دادی جان کی آنکھوں کے چراغ یک بیک بجھ گئے اور ماہرینِ چشم نے صاف جواب دے دیا۔ تب تک میں کالج میں پہنچ چکی تھی۔ انٹر کے سالانہ امتحانات کے بعد کا ذکر ہے ایک روز میں نے اپنی عزیز ترین دوست کی سالگرہ میں جانے کے لیے دادی جان کی اجازت چاہی تو انھوں نے انکار کر دیا۔ میں ان کے انکار کو نظر انداز کر کے تقریب میں چلی گئی۔ جب رات گئے میری سہیلی کا ڈرائیور مجھے گھر پہنچا کر گیا تو دادی جان جاگ رہی تھیں اور ہماری گھریلو ملازمہ رابعہ سخت پریشان اور سہمی ہوئی تھی۔ دادی جان نے مجھ پر خاصی برہمی کا اظہار کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ میری اس حکم عدولی اور سرکشی کی سزا وہ مجھے اس صورت میں دیں گی کہ

بچے آگے نہ پڑھنے دیں گی۔ مزید برآں مجھے صبح تا شام ان کے قریب ہی بیٹھنا پڑے گا۔ میں نے یہ سوچا کہ وقتی غصہ ہے، اگلی صبح تک دادی جان ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گی۔ لیکن اگلی صبح انھوں نے مجھے اپنے پاس بلا کر میری قمیص کا دامن اپنے کرتے کے دامن سے باندھ لیا اور کہا کہ اب رات تک مجھے ان کے ساتھ اسی طرح بندھے رہنا پڑے گا۔ میں نے جی ہی جی میں مسکراتے ہوئے اسے وقتی سزا سمجھ کر قبول کر لیا لیکن میری بدقسمتی کہ یہ سزا مستقل طور پر میرا مقدر بن گئی اور دادی جان اس جواز کے ساتھ کہ چونکہ میں کالا اکھی کی ڈسنے والی ہوں اور ایک بار ان کی حکم عدولی کر چکی ہوں چنانچہ اپنے نابینا پن کے سبب وہ آئندہ کے لیے مجھے ناقابلِ اعتبار سمجھتی ہیں اور اسی باعث دن بھر میری نگرانی کرنا چاہتی ہیں' یہ سزا مستقلاً لاگو کر دی اور میرا نتیجہ نکل آنے کے بعد میرے پاس ہونے کے باوجود مجھے مزید تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ میں دن بھر دادی جان کے ساتھ بندھی بیٹھی رہتی۔ ہماری خادمہ رابعہ۔ جو بہری تھی نے ہماری دن بھر گھر کے کام دھندے نمٹاتی اور بروقت کھانے پینے کا سامان ہمارے سامنے لا دھرتی۔ میں دادی جان کے ساتھ بندھی بیٹھی رہتی اور انھیں کتابیں پڑھ کر سناتی جاتی یا پھر سلائی کڑھائی کیے جاتی۔ حوائج ضروری کے لیے بھی دادی جان مجھے بمشکل اٹھنے دیتیں۔ دن میں نیند آتی تو ہم باہم ایک دوسرے کے دامن سے بندھے بندھے سو جاتے۔ مجھے اپنی دوستوں کے ہاں جانے کی اجازت ملنا تو درکنار ان کے فون سننے یا ان کے اپنے ہاں آنے پر انھیں گھر کے اندر بلانے کی اجازت بھی نہ ملتی۔ دادی جان کے حکم پر رابعہ باہر سے باہر انھیں ٹال دیتی۔ رات کو عشاء کی اذان کے بعد دادی جان اپنے اور میرے دامن کی گرہیں کھولتیں تب کہیں جا کر میں اٹھ پاتی۔ ایک روز جب میں بہت عاجز آ چکی تو میں نے اپنی اس عزیز ترین دوست سے جس کے جنم دن کی تقریب میں دادی جان کی اجازت کے بغیر جانے کے سبب مجھے اتنی کڑی سزا ملی تھی، ملنے کی خاطر ایک منصوبہ بنایا۔ رابعہ کی منت سماجت کے بعد میں نے کسی نہ کسی طرح اسے آمادہ کر لیا کہ دوپہر کو جب کھانے کے بعد دادی جان پر حسب معمول غنودگی طاری ہوگی اور وہ سو جائیں گی تو میں چپکے سے ان کے اور اپنے دامن کی گرہ کھول کر اپنی جگہ رابعہ کا دامن دادی جان کے دامن سے باندھ دوں گی اور اپنی دوست سے ملنے چلی جاؤں گی۔ میری واپسی تک رابعہ جو دوپہر کو سرونٹ کوارٹر میں چلی جایا کرتی تھی میری جگہ دادی جان کے گھٹنے سے لگی بیٹھی رہے گی اور اپنی زبان پہ پہرا لگائے رکھے گی۔ میں نے رابعہ کو سکھایا کہ میں ڈیڑھ دو گھنٹے میں واپس آ جاؤں گی۔ میری دوست ایک عرصے بعد مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ نہ ملنے کا شکوہ بھی کیا، تعلیم جاری نہ رکھنے کا سبب بھی پوچھا، مگر میں نے اسے دادی جان کی دی ہوئی سزا کے بارے میں بتانا مناسب نہ سمجھا۔ مبادا وہ یہ سمجھے کہ یہ سب کچھ اس کے جنم دن میں میری شرکت کے سبب ہوا۔ ویسے بھی میں اپنی ذاتیات میں دوسروں کو شامل کر لینے کی منطق کی بھی قائل نہیں ہوں۔ اپنی دوست سے ملنے کے بعد گھر واپس لوٹتے ہوئے میں بہت خوش تھی۔ ہاں میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ دادی جان کے نابینا ہونے سے پہلے ہمارے پاس گاڑی بھی تھی اور ڈرائیور بھی مگر جب دادی جان نابینا ہو گئیں تو انھوں نے گاڑی بیچ دی، ڈرائیور اور مالی کو جواب دے دیا۔ فقط رابعہ کو رکھا جو بیوہ اور تنہا تھی اور لاولد بھی۔ خیر قصہ مختصر اس روز میں اس خیال کے ساتھ گھر واپس لوٹی کہ بس اب تیسرے چوتھے دن یہی کیا کروں گی کہ رابعہ کو اپنی جگہ دادی جان کے دامن سے باندھ کر بٹھایا اور خود سیر سپاٹوں کو نکل لی مگر برا ہو اس قسمت کا جب میں گھر واپس لوٹی تو پتا چلا کہ میری عدم موجودگی میں دادی جان کے جاگنے پر انھیں کوئی ایسی ضرورت درپیش آئی کہ رابعہ کے پاس سوائے اس کے کوئی اور چارہ نہ رہا کہ یا تو بول اٹھے یا پھر دم دبا کر بھاگ لے کیونکہ دادی جان حسب عادت میری طرح اسے بھی جھنجوڑ جھنجوڑ کر اپنی ضرورت کا اظہار کر رہی تھیں۔ اور وہ انھیں اس گمان میں بھی نہ رکھ سکتی تھی کہ وہ یعنی میں سو رہی ہوں۔ چنانچہ کوئی دوسرا راستہ نہ پاتے ہوئے اپنی بچت کی خاطر اس نے چپ چاپ دادی جان کے دامن سے بندھا اپنا دامن کھولا اور بھاگ لی۔ جب میں گھر واپس لوٹی تو دادی جان مجھے پکارتے ہوئے ٹٹول ٹٹول کر گھر میں بھٹکتی پھر رہی تھیں اور اس گمان میں تھیں کہ میں گھر ہی کے کسی کونے کھدرے میں دبکی ہوئی ہوں۔ رابعہ کی بابت تو ان کے ایقان نے انھیں یہی بتایا ہوگا کہ وہ حسب عادت گدھے گھوڑے بیچ کے سرونٹ کوارٹر میں سو رہی ہوگی۔ خیر جب میں گھر لوٹی تو رابعہ کو بے تابانہ اپنا منتظر پایا۔ وہ خاصی متوحش تھی اور اس نے دادی جان کے دامن سے اپنا دامن کھول کر بھاگ اٹھنے کا جو منظر الفاظ میں بیان کیا اس سے میں خاصی محظوظ ہوئی...''
اس کے ساتھ ہی وہ بے ساختہ ہنس پڑی اور میں بھی اپنی

احترامِ آزادی

ہم اپنی آزادی کی حفاظت صرف اسی وقت کر سکتے ہیں جب تو دوسروں کی آزادی کا احترام کریں گے اگر ایسا نہ ہوا تو جلد ہی دنیا دوزخ کی شکل میں ڈھل جائے گی۔
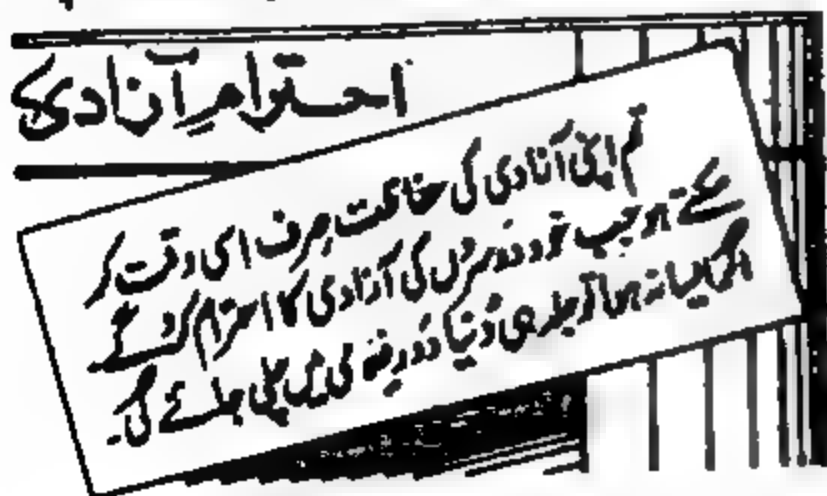
ہنسی پر قابو نہ رکھ سکا۔ جونہی میں نے اس کی ہنسی میں شریک ہونے کی کوشش کی، وہ یک بیک خاموش ہو گئی۔

"دیکھیے۔۔ مونس صاحب!" وہ عجیب سے لہجے میں بولی "آپ کو میری دادی جان پر ہنسنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ مجھے اس تمام سختی کے باوجود جو انھوں نے گزشتہ دو ڈھائی برس سے میرے ساتھ روا رکھی ہوئی ہے، بے حد عزیز ہیں۔ مجھے ان سے پیار ہے بلکہ کبھی کبھی تو ترس بھی آتا ہے مجھے ان پر۔"

"سوری!" میں نے معذرت کا اظہار کیا۔

"قصہ مختصر اس روز تو کسی نہ کسی طرح میں نے بات بنا لی لیکن آیندہ کے لیے رالعہ نے بھی اس سلسلے میں میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور دادی جان نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر آیندہ میں نے ان کی اجازت کے بغیر ان کے دامن سے اپنا دامن کھول لینے کی جسارت کی تو وہ مجھے اس کی سخت ترین سزا دیں گی۔۔۔ خیر اس قصے کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک نیا کرایہ دار ہمارے گھر کی انیکسی میں آ بسا۔۔۔"

"یعنی کوئی پرانا کرایہ دار بھی تھا؟" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اس سے پہلے ایک دوسرا کرایہ دار تھا جو آپ کی طرح موقع بے موقع دوسرے کی بات نہ کاٹتا تھا۔ وہ کئی برس دادی جان کا کرایہ دار رہا۔ بہت ہی خشک مزاج کا آدمی تھا شاذ ہی بات کرتا بس مہینے کے مہینے دادی جان کو کرایہ ادا کرنے کے لیے آتا یا پھر کوئی اشد ضرورت ہی اسے ان کے پاس کھینچ کر لاتی تھی۔ وہ بالکل تنہا تھا اور دادی جان کو اس نے اپنے بارے میں فقط اتنا بتایا تھا کہ اس کی بیوی اور ایک بیٹا اس سے علیحدگی کے بعد کسی دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔ وہ شخص کسی دفتر میں افسر تھا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جانا اس کے نزدیک غالباً مقصد حیات تھا۔ ایک روز اس کے دفتر کے دو ساتھی دادی جان کے پاس آئے اور انھوں نے بتایا کہ دفتر میں کام کے دوران اس پر دل کا دورہ پڑا تھا اور اسے اسپتال میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ پھر کوئی ہفتے بھر بعد خبر ملی کہ وہ مر گیا تھا۔ اس کی تکفین و تدفین اس کے دوستوں ہی نے کی اور دادی جان کی درخواست پر انھی میں سے ایک دو دوستوں نے اس کا سامان ہماری انیکسی سے اٹھوا کر ایک رفاہی ادارے میں پہنچا دیا۔ اس کے بعد جو نیا کرایہ دار انیکسی میں آیا وہ ایک نوجوان آدمی تھا جو بقول اس کے رہنے والا تو سکھر کا تھا مگر اپنی ملازمت کے سلسلے میں کراچی میں رہا کرتا تھا۔ اسے ہماری انیکسی کے کرائے کے لیے خالی ہونے کی خبر ہمارے سابقہ کرایہ دار کے کسی دفتر کے رفیق کار سے ملی تھی اور وہ دادی جان کا کرایہ دار بننے چلا آیا تھا۔ دادی جان کو اس نے اپنے بارے میں یہی بتایا کہ اس کے اہل خانہ سکھر میں رہا کرتے تھے اور وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں یہاں مقیم تھا چونکہ اس نے دادی جان کو پیشگی کرایہ ادا کرنے میں کوئی تردد نہ کیا اس لیے دادی جان نے انیکسی کرائے پر دینے میں اصولاً تو کوئی تردد نہ ہونا چاہیے تھا مگر انھوں نے اسے فوری طور پر انیکسی کی چابی دینے کی بجائے اگلے دن بلایا جب وہ چلا گیا تو دادی جان نے مجھ سے کہا: 'الفت جان! ایک بات تو بتاؤ۔'

'جی دادی جان پوچھیے۔' میں نے کہا۔

'یہ جو شخص ہماری انیکسی کرائے پر لینا چاہ رہا ہے کیسا ہے؟'

'کیا مطلب دادی جان؟'

'میرا مطلب ہے میری جان کہ پہلے والے کرایہ دار کی طرح عمر رسیدہ ہے یا نوجوان؟'

'چونکہ میں دادی جان سے جھوٹ نہیں بولنا چاہتی تھی اس لیے میں نے کہا: 'دادی جان نہ تو وہ بہت بوڑھا ہے اور نہ نو عمر لڑکا ہے۔'

'دیکھنے میں کیسا ہے؟' دادی جان نے کہا۔

'برا نہیں ہے۔'

'اوہ!' دادی جان متوحش ہو کر بولیں: 'یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔ میں نابینا تم نابالغ اور متوقع کرایہ دار جوان بھی ہے اور دیکھنے میں بھی برا نہیں۔ بہرحال چونکہ وہ گفتگو سے معقول آدمی محسوس ہوا ہے مجھے اور کرایہ دار رکھنا اس لیے اہم ہے کہ گھر کی ہنڈی رقم ملنا بھی ضروری ہے اس لیے میں اسے انیکسی کرائے پر دینے پر تو مجبور ہوں مگر دیکھو تمھیں سمجھائے دیتی ہوں کہ ابھی بچیوں کی طرح گھر میں رہنا۔ جوان اور خوبرو مرد دیکھنے میں جتنے دل کش نظر آتے ہیں بسا اوقات اندر سے اتنے ہی مکروہ کر کے ہوتے ہیں۔ سیدھی سادی اور بھولی لڑکیوں پر جال پھینکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جان! گو میں اندھی ہوں مگر تمھاری بھلائی کے لیے تمھیں اپنے تجربۂ حیات کی روشنی میں زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کر دینا ضروری سمجھتی ہوں بہت احتیاط سے چلنے کی ضرورت ہے۔ زمانہ بھی کتنی تیزی سے بدلتا ہے آہ کیسا اچھا تھا وہ پرانا زمانہ۔۔۔'

"میں جی ہی جی میں مسکرا دی۔ دادی جان کو تو ہر وقت پرانے زمانے اور گئے دنوں کی یاد ستاتی رہتی تھی کیوں کہ تب وہ جوان ہوا کرتی تھیں اور حسین بھی۔ سورج کی روشنی میں زیادہ چمک اور زیادہ حدت ہوا کرتی تھی۔ چاندنی کی روشنی موجودہ زمانے کے مقابلے میں زیادہ سحر انگیز ہوا کرتی تھی۔ کھانے پینے کی چیزیں زیادہ خالص ہوا کرتی تھیں اور لوگ بھی آج کل کی طرح بیہودہ 'واہیات'۔۔۔ غیر مہذب اور بے ایمان نہ ہوا کرتے تھے۔ دادی جان کے خیال میں پرانے زمانے میں سب ہی کچھ

آنے کی نسبت بدرجہا بہتر ہوا کرتا تھا! خیر جب دادی جان نے مجھے اس نوجوان کی بابت جو بقول ان کے ہمارا کرایہ دار بننے والا تھا متنبہ کیا تو میں نے دل ہی دل میں سوچا: دن بھر تو میں دادی جان کے ساتھ بندھی بیٹھی رہتی ہوں۔ اس وقت بھی جب کہ وہ کرایہ داری کی استدعا لے کر ان کے پاس آیا تو میں ان کے ساتھ ہی بندھی بیٹھی تھی پھر انھیں مجھے متنبہ کرنے یا خود فکر مند ہونے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ اور دل ہی دل میں اس امر پر غور کرتی ہوئی میں اپنی سلائی کڑھائی میں مشغول ہو گئی۔ اگلے دن دادی جان نے اس شخص کو ٹیکسی کرائے پر دیتے ہوئے اس سے ایک ماہ کا پیشگی کرایہ اور زرِ ضمانت وصول کر لیا۔

مہینہ ختم ہونے کے بعد جب وہ حسبِ شرائط اگلے ماہ کا کرایہ پیشگی دینے آیا تو میں دادی جان کو ایک ناول سُنا رہی تھی۔ وہ گزشتہ ماہ اور اس ماہ کے کرائے کی باضابطہ رسیدیں بھی بنا کر لایا تھا اور ان پر دادی جان کے دستخط لینا چاہتا تھا۔ دادی جان چونکہ دیکھ نہ سکتی تھیں اس لیے انھوں نے مجھ سے کہا کہ رسید کے مندرجات انھیں سُناؤں اور ان کی جانب سے دستخط کر دوں۔ مندرجات سے دادی جان کو آگاہ کرنے کے بعد دستخط کرنے کے لیے میں نے اس شخص سے قلم طلب کیا تو پتا چلا کہ قلم وہ نہ لایا تھا۔ دادی جان نے مجھ سے اپنا قلم لے آنے کو کہا۔ میں بے ساختہ اٹھی تو اپنے ساتھ میں نے دادی جان کو بھی کھینچ لیا اور تب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو کر اٹھنے سے پہلے میں نے دادی جان کے دامن سے اپنا دامن کھلوایا۔ خفت کے مارے میرا چہرہ تپ اٹھا۔ میرا جی چاہا، زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ خدایا! کیا سوچا ہوگا اس نے مجھے دادی جان کے ساتھ بندھا اور میرے بے ساختہ اٹھنے پر دادی جان کو میرے ساتھ کھنچتا دیکھ کر۔ غم، غصّے اور خفت کے احساس سے میری آنکھیں بھر آئیں: ابھی میں رنج و ملال، غصّہ اور ندامت کے اس سمندر میں غلطاں تھی کہ دادی جان نے گرج کر کہا: "الفت کیا کر رہی ہے یہاں کھڑی؟ جا کر قلم کیوں نہیں لے آتی؟" دادی جان کی اس پھٹکار نے مجھے اس کے سامنے اور بھی شرمسار کر دیا اور باوجودیکہ اس دوران دادی جان میرا دامن اپنے دامن سے علیحدہ کر چکی تھیں، میں شرمندگی کے احساس سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ وہ میری کیفیت کو بھانپ کر خود ہی اٹھ کھڑا ہوا اور دادی جان سے بولا: "میں اپنا قلم لے کر آتا ہوں۔" اس کے جانے کے بعد دادی جان مجھ پر وہ برسیں کہ الاماں اور میرا یہ حال کہ آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی مگر کچھ دیر بعد وہ قلم لے آیا اور رسیدوں پر دستخط کر دیے گئے۔

"اس دن کے بعد تو میرا یہ حال ہو گیا کہ جونہی اطلاعی گھنٹی بجتی میں چپ چاپ اپنے اور دادی جان کے دامنوں کے بیچ کی گرہ ڈھیلی کر کے اس خیال کے تحت اسے پورے طور کھولنے کو چوکنا ہو جاتی کہ شاید وہی آیا ہو۔ سو کوئی دن نہ گیا البتہ ایک روز اس نے رابعہ کے ذریعے دادی جان کو پیغام بھجوایا کہ اس کے پاس کتابوں کا بہت عمدہ ذخیرہ ہے۔ چونکہ وہ بیٹھے بیٹھے اکتا جاتی ہوں گی اس لیے اگر دادی مناسب سمجھیں تو وہ انھیں کتابیں بھجوا سکتا ہے۔ دادی جان اس کے پیغام پر پہلی تو خاصی ہچکچائیں لیکن پھر انھوں نے رابعہ کے ہاتھوں اس سے چند کتابیں منگوا لیں۔

شاید اسے آزمانے کو: اس نے جو کتابیں بھجوائیں، دادی جان نے پہلے تو خود انھیں ٹٹول ٹٹول کر دیکھا۔ اپنے دامن میں انھیں خوب اچھی طرح ایک کے بعد ایک کو جھاڑا۔ الٹا پلٹا پھر مجھ سے بولیں: "اگر کوئی الٹی سیدھی کتاب بھجوائی ہو اس نے تو مجھے بتلانے میں تردد نہ کرنا۔" میں نے دادی جان سے ان کی اس بات کی وضاحت چاہی تو وہ بولیں: "زمانہ بڑا خراب ہے بیٹا! میں اندھی، تم ناسمجھ اور کرایہ دار نوجوان۔ کسی کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے کہ وہ تمھیں ورغلانے کو کوئی ایسی ویسی کتاب بھیج دے۔"

"آپ اطمینان رکھیے دادی جان! میں آپ کو یہ ساری کتابیں یکے بعد دیگرے سُناؤں گی۔ آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ یہ اچھی کتابیں ہیں یا بُری۔"

"اچھا دیکھو ویسے تو میں نے انھیں جھاڑ جھٹک کر دیکھ لیا ہے۔ احتیاطاً تم بھی دیکھ لو کہ کہیں اس نے کسی کتاب میں کوئی خط وط تو نہیں رکھ بھیجا ہے۔"

"کیسا خط دادی جان؟"

"میری بھولی بھالی پوتی کو بہکانے کے لیے کوئی نامۂ محبت۔" میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

"ایک ایک ورق الٹ پلٹ کر دیکھو۔ گرد پوش اتار کر دیکھو۔ بعض دفعہ یہ بدذات مرد نوجوان اور معصوم لڑکیوں کو بہکانے کے لیے کتاب کی جلد اور گرد پوش کے درمیان محبت نامہ رکھ کے بھیجا کرتے ہیں۔" دادی جان نے کہا۔

"مجھے حجاب آنے لگا کہ دادی جان کیسی عجیب و غریب باتیں کر رہی تھیں۔ تاہم ان کے اطمینان کی خاطر میں نے نوجوان کرایہ دار کی بھجوائی ہوئی پانچوں کتابوں کا خوب اچھی طرح پوسٹ مارٹم کر ڈالا مگر وہاں محبت نامہ تو کُجا خالی لفافہ بھی برآمد نہ ہوا۔ البتہ ہر کتاب پر اس کا نام "علی نواز" جلی حروف میں درج تھا۔

"اگلے ماہ جب وہ کرایہ ادا کرنے دادی جان کے پاس آیا تو میں دادی جان کو اس کی بھجوائی ہوئی پانچ کتابوں میں سے چار پڑھ کر سُنا چکی تھی جو دادی جان کو سب کی سب پسند آئی تھیں اور اس کے آنے پر دادی جان نے ان کتابوں کی بابت اپنی پسندیدگی کا اس سے برملا اظہار بھی کیا۔

"اگر آپ کو یہ کتابیں پسند آئی ہوں تو میں مزید کتابیں پہنچا دوں؟" اس کے لہجے میں استفہامیہ کیفیت تھی۔

اگر ہیں اور تم پڑھ چکے ہو تو رابعہ کے ہاتھ بھجوا دینا۔ انیکسی کی صفائی تو وہ کرتی ہے نا باقاعدگی سے؟'

'جی ہاں باقاعدگی سے اور کتابیں اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں خود پہنچا دوں؟'

'نہیں، تم تکلیف نہ کرنا رابعہ سے بھجوا دینا۔'

'جی بہتر' وہ دادی جان کے تردد کو تاڑ گیا۔

"کرائے کی ادائیگی کے بعد جب وصولی کی رسید پر دستخط لینے کا مرحلہ آیا تو اس نے اپنا قلم پیش کیا اور میں جو رابعہ کی زبانی اس کی آمد کی اطلاع سنتے ہی اپنا دامن دادی جان کے دامن سے کھول چکی تھی اس کے ہاتھ سے قلم لیتے ہوئے گزشتہ ماہ پیش آنے والے واقعے کو یاد کر کے خفت کے مارے سرخ پڑ گئی جب وہ جانے کو اٹھا تو دادی جان نے وہ چاروں کتابیں جو میں انھیں پڑھ کر سنا چکی تھی اس کے ساتھ کر دیں۔ اس کے جاتے ہی میں نے جلدی سے اپنا دامن دادی جان کے دامن کے ساتھ باندھ لیا۔ اگلے ہی دن اس نے رابعہ کے ہاتھ مزید کتابیں بھیج دیں۔

"کوئی ہفتہ بھر بعد کی بات ہے رابعہ بخار میں مبتلا اپنے کوارٹر میں پڑی تھی اور میں اپنی نرم دلی اور مدارس دادی جان کی ہدایت پر رابعہ کو گرم دودھ کا پیالہ اور بخار کی گولی پہنچانے کے بعد اس کے کوارٹر سے لوٹ رہی تھی کہ وہ انیکسی کی جانب پیش قدمی کرتا نظر آیا۔

'سلام علیکم!' اس نے کہا۔

'سلام علیکم!' میں نے ہڑبڑا کر کہا اور وہ میری اس ہڑبڑاہٹ پر دھیرے سے مسکرا دیا۔

"میں نے آگے بڑھ جانا چاہا مگر اس کی آواز نے میرے قدم پکڑ لیے۔ 'سنیے!' اس نے آہستگی سے کہا۔ میں نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا تو وہ بولا۔ 'آپ تمام دن اپنی دادی کے پاس بیٹھے بیٹھے تھک نہیں جاتیں؟'

'آپ... آپ سے کس نے کہا کہ میں تمام دن ان کے پاس بیٹھی رہتی ہوں؟' میں نے اس کی اس دخل در معقولات کا برا منانے کی کوشش کی۔

'مجھے اندازہ ہے اور اسی باعث آپ سے ہمدردی بھی ہے۔'

"اس کے اس جواب نے مجھے خفت سے دوچار کر دیا۔ مجھے اس خیال نے آزار پہنچایا کہ میرے ساتھ دادی جان کے ناروا طرز عمل کے باعث اب غیر بھی مجھ پر ترس کھانے لگے تھے۔ میں نے ایک بار پھر قدم آگے بڑھانے کی کوشش کی مگر اس کی آواز نے پھر میرے قدم پکڑ لیے۔

'تم بہت اچھی لڑکی ہو اور میں تمھیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمھارے چہرے پر بکھرے اداسی اور مایوسی کے یہ سائے مجھے رنجیدہ کرتے ہیں۔ کیا تمھاری کوئی سہیلی نہیں جسے تم اپنے ہاں بلا سکو یا خود اس کے ہاں جا سکو؟'

"اس کے ہمدردانہ انداز تخاطب پر میرا جی بھر آیا اور میں نے بوجھل آواز میں کہا: 'ہاں ایک سہیلی ہے تو سہی مگر دادی جان نہ اس کا یہاں آنا پسند کرتی ہیں نہ میرا اس کے ہاں جانا۔'

'کبھی کبھار گھر سے پہلے ہی کو باہر نکل جایا کرو۔ دن بھر گھر میں بند رہنا کسی طور بھی اچھا نہیں۔' اس نے کسی ہمدرد دوست کی طرح کہا۔

'دادی جان اس کی بھی اجازت نہیں دیتیں۔'

'میرے ساتھ پکچر دیکھنے چلو گی؟'

میں نے گھبرا کر اس کی جانب دیکھا اور بڑبڑائی 'پکچر!'

'ہاں بڑی اچھی پکچر لگی ہوئی ہے قریبی سینما ہاؤس میں۔' وہ لحظہ بھر کو تھما پھر بولا۔ 'چلو گی؟'

'نہیں۔' میں نے دھیرے سے جواب دیا۔

'کیوں؟'

'کیوں کہ دادی جان اجازت نہیں دیں گی۔'

'دادی جان کو بتائے گا کون۔ آخری شو میں چلیں گے۔ نو بجے تک تو تمھاری جان بخشی ہو ہی جاتی ہے۔' وہ مسکراتے ہوئے کہا۔

'آپ کو کیسے پتا؟'

'تمھارے کمرے کی بتی جو جل اٹھتی ہے عشا کے بعد۔'

'اوہ! تو کیا آپ...؟'

'ہاں میں روزانہ یہ بات نوٹ کرتا ہوں اور اسی لیے تمھیں فلم کے آخری شو میں چلنے کی دعوت دے رہا ہوں۔'

'معاف کیجیے گا جناب!' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ 'آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو آپ جیسے لوگوں کی باتوں میں آ کر اپنے بزرگوں کے اعتماد کو دھوکا دیا کرتی ہیں۔ مجھے اپنی دادی جان سے پیار ہے اور میں کسی قیمت پر ان کے اعتماد کو دھوکا نہیں دوں گی۔' پھر میں نے زہر خند نگاہوں سے اسے گھورا اور آگے بڑھ گئی مجھے اس خیال نے خاصا دکھ پہنچایا کہ میں تو اسے شریف اور ہمدرد فطرت کا انسان سمجھ رہی تھی مگر وہ تو کچھ دوسری قسم کا آدمی نکلا تھا۔

"اس شام وہ دو نئی کتابیں لے کر دادی جان سے ملنے آیا اور تادیر دادی جان کے پاس بیٹھا رہا! اس نے دادی جان کو اپنی باتوں سے ایسا بہلایا کہ دادی جان نے مجھ سے کہا: 'الفت! انوار صاحب کے لیے چائے تو بنا لاؤ اور ہاں کچھ کھانے کو بھی لیتی آنا۔' اس نے منع کیا مگر میں جو چپکے سے اپنے اور دادی جان کے دامنوں کے بیچ بندھی گرہ کھول

سائرس اعظم

ایران کا شہنشاہ سائرس اعظم جس نے ۵۵۸ قبل مسیح سے ۵۲۹ قبل مسیح تک حکومت کی تھی، اب بھی کسی نہ کسی شکل میں ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہے۔ مثلاً اسی کی وجہ سے ہم دن رات کو بارہ بارہ گھنٹوں کے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اشیا کی گنتی درجن کے حساب سے کرتے ہیں۔ فن تعمیر میں ستون استعمال کرتے ہیں اور پتلون والا جامہ پہنتے ہیں۔ یہ تمام اختراعات سائرس اعظم ہی سے منسوب کی جاتی ہیں۔

بچی تھی، مگر تبھی غنیمت جان کر انھیں سیدھی کرکے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ جب جانے لگی تو وہ دادی جان سے کہہ گیا تھا: ”نانی جی! کبھی کبھی آپ گھومنے پھرنے کو باہر بھی نکلا کریں۔ گھر بند بیٹھے بیٹھے تو آپ کو بیماریاں گھیر لیں گی اور آپ کی صحت خراب ہو جائے گی۔ تازہ ہوا آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔“

”خدا جانے اس نے میری عدم موجودگی میں دادی جان پر کیا جادو پڑھ پھونکا تھا کہ میں نے دادی جان کو اس سے کہتے سنا: ’بیٹے! میں بوڑھی اور نابینا عورت باہر بھلا کیونکر نکل سکتی ہوں۔‘

’الفت کے ساتھ گھر سے نکل جایا کریں اور کچھ نہیں تو ساحل پر کچھ دیر کو چہل قدمی کر آیا کریں۔‘ اس نے کہا۔

’زمانہ خراب ہے بیٹا! الفت خیر سے جوان بچی ہے، اسے ساتھ لے کر نکلوں اور خدانخواستہ کوئی پیچھے لگ جائے، بگڑ گئی اور پریشانی ہو جائے تو میں بوڑھی اور ماندی عورت بھلا کیا کر پاؤں گی۔ کوئی مرد ساتھ ہو تو گھر سے باہر نکلنے کی ہمت بھی کر لوں، مگر جوان بچی کے ساتھ نہیں۔‘

’اگر آپ میرے ہمراہ چلنا پسند کریں تو میری خدمات حاضر ہیں۔‘

’نہیں بیٹا! تمھیں تکلیف ہوگی، ویسے بھی تم کو آج کل پڑھائی کا بخار چڑھا ہوا ہے۔‘

’کوئی بات نہیں، کل سہی۔‘ اس نے کہا۔ ’آپ کو جب بھی دیکھتا ہوں تو جانے کیوں مجھے اپنی والدہ کا خیال آتا ہے۔ آپ بھی مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھیے۔‘

’جیتے رہو۔‘ دادی جان نے کہا۔

”اور میں جی ہی جی میں سوچ رہی تھی کہ کتنا چرب زبان ہے یہ شخص کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دادی جان کو شیشے میں اتار لیا۔

”اگلی شام وہ دادی جان کا ہاتھ تھام کر انھیں ساحل سمندر کی سیر کرانے لے گیا۔ میں بھی ہمراہ تھی۔ ساحل پر چہل قدمی کے دوران وہ دادی جان کا ہاتھ تھامے رہا اور کن انکھیوں سے گاہے گاہے مجھے دیکھتا رہا۔ اس نے ہمیں آئس کریم بھی کھلائی۔

”اور اس روز پہلی بار اس نے ہمیں اپنے بارے میں بتایا کہ وہ پیشے کے اعتبار سے میرین انجینئر تھا اور ان دنوں اپنی ترقی کے امتحان کے سلسلے میں جہاز پر سے اترا ہوا تھا۔

”ہماری گھر واپسی اندھیرا چھا جانے کے بعد ہوئی۔

”اس رات میں دیر تک جاگتی اور تمام وقت اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ دادی جان کو چہل قدمی کے لیے لے جانا تو ایک بہانہ تھا، اصل میں تو وہ مجھے میری محبوس دنیا سے کچھ دیر کو نکال لے جانا چاہتا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میں نے اپنے وقار پر آنچ نہ آنے دی تھی۔ اگر کل خدانخواستہ میں نے اس کی پکچر پر چلنے کی دعوت کو قبول کر لیا ہوتا تو یقیناً ساحل پر دادی جان کے ہمراہ چہل قدمی کرتے ہوئے اس کی نگاہوں میں میرے لیے وہ احترام نہ ہوتا جو کہ میں نے اس شام اس کی آرزو مند نگاہوں میں دیکھا تھا۔

”اگلے ڈھائی تین ماہ کے دوران وہ مجھے اور دادی جان کو بار بار باہر لے گیا۔ وہ دادی جان سے باتیں کیے جاتا مگر مجھ سے ہم کلام ہونے سے گریز کرتا تاہم کن انکھیوں سے مجھے دیکھے جاتا۔ اس کی نظروں میں مجھے اپنے لیے ہمدردی اور رحم کے تاثرات ہلکورے لیتے دکھائی دیتے۔

”پھر جب موسم کے تیور بدلنے لگے اور خنک ہوائیں چلنے لگیں تو دادی جان کے جوڑوں کے درد کے باعث یہ سلسلہ یکسر منقطع ہو گیا اور میں دوبارہ اسی محبوس ماحول میں مقید ہو گئی۔ پھر یاسیت کے دورے پڑنے لگے۔ کبھی میں بیٹھے بیٹھے رونے لگتی، کبھی زور زور سے چلانے لگتی اور کبھی محض دادی جان کو تنگ کرنے کو بلا سبب قہقہے لگانے لگتی۔ مجھے دادی جان کے ساتھ بندھ کر بیٹھنا گراں لگنے لگا۔ نہ میرا کتابیں پڑھنے میں دل لگتا، نہ سلائی کڑھائی میں۔ دادی جان لاکھ کہتیں: ’کوئی کتاب پڑھ کر سناؤ۔‘ مگر میں ایک لفظ دو پھوٹ کر دیتی۔ میں اپنی بدنصیبی پر جی ہی جی میں کڑھے جاتی، کھانا بھی فقط زندہ رہنے کو کھاتی۔ نتیجتاً میرا جسم گھلنے اور رنگ روپ ماند پڑنے لگا۔ وہ کبھی کبھی دادی جان کے پاس آتا یا پھر میرا اور اس کا کبھی کبھار زینے پر آتے جاتے سامنا ہو جاتا۔ ایسے میں میں سرخ ہو جاتی، ٹھٹھر جاتی مگر وہ یوں خاموشی سے گزر جاتا جیسے مجھ سے بات ہی کرنا چاہتا ہو۔ میں دل ہی دل میں حیران ہو کر سوچتی کہ اسے ایسی ہی بیگانگی کا مظاہرہ کرنا تھا تو پھر اس نے مجھے پکچر پر چلنے کی دعوت کیوں دی تھی اور کیوں وہ مجھے اور دادی جان کو گھمانے پھرانے باہر لے جاتا رہا تھا؟

”رات کو میں دیر تک اپنے اور دادی جان کے مشترکہ کمرے کی کھڑکی سے انیکسی کی طرف دیکھے جاتی۔ رات گئے تک انیکسی میں بتی جلتی رہتی۔ یقیناً وہ اپنے امتحانات کے لیے پڑھ رہا ہوتا تھا۔

"پھر ایک روز وہ دادی جان کے پاس آیا اور اس نے انھیں بتایا کہ وہ اپنے امتحانات سے فراغت پا چکا تھا اور کچھ عرصے کے لیے اپنے ابا جان کے پاس سکھر جا رہا تھا۔ اس نے ان سے مزید کہا کہ وہاں سے واپس آنے کے بعد وہ تقریباً برس بھر کے سفر پر چلا جائے گا چنانچہ اسے بھلا کرایہ دار رہنے کی ضرورت نہیں رہی اور وہ پرسوں تک انیکسی خالی کر کے چلا جائے گا۔

"میں یہ خبر سن کر ایک گہرے صدمے سے دوچار ہوئی مگر اس نے تھا کہ اسی کے سامنے سو پڑتی۔ صد شکر کہ دادی جان میرے تاثرات دیکھنے سے قاصر تھیں۔

"اس کے جانے کے بعد میں سخت اضطراب کے عالم میں تادیر یہی سوچتی رہی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

"اور بالآخر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔

"میں جانتی تھی کہ دو روز بعد وہ جا رہا ہے۔ چنانچہ اگلی رات پچھلے پہر جب دادی جان گہری نیند میں تھیں، میں نے بے پاؤں بستر سے اٹھ کر اپنے دو چار جوڑے کپڑے ایک گٹھڑی کی صورت باندھے اور گٹھڑی سینے سے لگائے انیکسی تک جا پہنچی۔ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے، جسم لرز رہا تھا اور دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ انیکسی کے دروازے پر دستک سن کر جب اس نے دروازہ کھولا اور مجھے کھڑے دیکھا تو گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

'تم...!' اس نے حیرانی سے کہا۔ 'اور اس وقت؟'

"میں متوحش سی انیکسی میں داخل ہوئی اور کپڑوں کی گٹھڑی بستر پر رکھ کر خود مسہری کے کنارے ٹکتے ہوئے میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر رونا شروع کر دیا۔ وہ جلد صورت حال سمجھ گیا۔ میرے نزدیک آ کھڑا ہوا اور جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مجھے اس قدر دل گرفتگی اور مایوسی سے دیکھتا نظر آیا کہ میرا دل بھی رونے لگا۔

'دیکھو الفت!' اس نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ 'فی الحال تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ بہت سی ذمے داریاں ہیں مجھ پر۔ بہت عرصہ نہیں ہوا ہے مجھے نوکر ہوئے اور کتنی مشکلات سے گزرنے کے بعد میں نفٹنٹ انجینئر کی حیثیت سے بحری جہاز پر اپنے کیریئر کا آغاز کر سکا ہوں، اس کا شاید تم اندازہ بھی نہ کر سکو۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ والدہ اور چھوٹے بھائی بہنوں کی کفالت میری ذمے داری ہے لیکن ڈھائی تین برس کی ملازمت میں انھیں کچھ زیادہ راحت نہیں پہنچا سکا ہوں۔ حالات میں بہتری کی خاطر میں ایک غیر ملکی کمپنی کے جہاز پر ملازمت کے لیے معاہدہ کر کے تقریباً برس بھر کے سفر پر نکلنے والا ہوں۔ ہفتے بھر کی مہلت تھی سو میں نے سوچا طویل سفر پر جانے سے قبل والدہ اور بھائی بہنوں سے بھی مل آؤں۔ اس سفر سے واپسی پر ہی میں اپنے بارے میں سوچ سکوں گا، اس سے پہلے کہیں نہیں۔'

"پھر وہ کافی دیر مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے مجھ سے میری کہانی سنی، تمام احوال سن کر افسوس کیا اور سمجھانا بجھانا شروع کر دیا۔ میں نے اس سے صاف صاف بتا دیا کہ میں دادی جان کے ساتھ بندھ کر بیٹھے بیٹھے عاجز آ چکی تھی اور اب زیادہ عرصہ ایسے نہیں گزر سکتی تھی۔ میں نے اسے واشگاف الفاظ میں بتا دیا کہ اپنی زندگی کے سنہری دن دادی جان کے ساتھ بندھ کر بیٹھے رہنے کے بجائے میں اس کے ہمراہ فرار ہو جانے کو ترجیح دوں گی۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ اس کی چند روزہ گرم جوشی نے میرے دل میں ایسی چاہت جگا دی تھی کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ خدا جانے کہاں سے مجھ میں اتنی ہمت آ گئی تھی کہ میں نے شرم و حیا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنا دل کھول کر اس کے آگے رکھ دیا۔

"جب میں دل کی ہر بات اس سے کہہ چکی تو وہ میرے نزدیک آ بیٹھا اور اس نے گمبھیر آواز میں کہا۔ 'دیکھو الفت! اچھی لڑکیاں اپنے گھروں سے فرار نہیں ہوا کرتیں، وہ حالات کا مقابلہ کرتی ہیں، ہمت نہیں ہارا کرتیں۔ تم ایک شریف گھرانے کی اچھی لڑکی ہو، یہ بات میں بہت وثوق سے کہہ رہا ہوں۔ اگر تم اچھی لڑکی نہ ہوتیں تو اتنا عرصہ اپنی دادی جان کے ساتھ بندھ کر نہ بیٹھی رہتیں۔ بے شک تمھارے حالات خاصے پیچیدہ ہیں مگر تمھاری دادی جان بے چاری بھی مجبور ہیں۔ زمانہ واقعی خراب ہے۔ انھیں یقیناً تمھاری بہت فکر رہتی ہوگی بہرحال زیادہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس دنیا میں اگر کسی لڑکی کا مجھ پر سب سے زیادہ حق ہے تو وہ تم، اور صرف تم ہو۔ اپنی مجبوریوں کے سبب فی الحال میں تم سے شادی نہیں کر سکتا اور نہ ہی اوباشوں کی طرح تمھیں بھگا لے جا سکتا ہوں لیکن یہ میرا وعدہ ہے تم سے کہ میں نے جب بھی شادی کا ارادہ کیا تو تم میرا پہلا انتخاب ہوگی۔ جیسا کہ میں نے کچھ دیر پہلے تم سے کہا کہ میں اپنے معاشی حالات میں بہتری کی خاطر ایک غیر ملکی جہاز ران کمپنی سے ملازمت کا معاہدہ کر چکا ہوں۔ سکھر میں اپنے اہلِ خانہ سے مل کر آنے کے بعد میں ایک طویل سفر پر چلا جاؤں گا۔ میرا اندازہ ہے کہ میری واپسی میں تقریباً برس بھر لگ جائے گا اور اس دوران میں اچھی خاصی رقم کما لوں گا۔ کوشش کروں گا کہ اس دوران میری ان دو بہنوں کی شادی ہو جائے جو منگنی شدہ ہیں مگر جہیز نہ ہونے کے سبب گھر بیٹھی ہیں۔ میری واپسی پر اگر تمھاری کہیں اور شادی نہ ہوئی اور تمھارے دل میں میری محبت برقرار رہی تو میں تمھارا ہاتھ تھام لوں گا مگر دیکھو اسے وعدۂ محبت مت سمجھنا کیوں کہ اول تو مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں تمھیں وعدے کی کسی زنجیر میں باندھ کر جاؤں، دوسری بات یہ کہ یہ بھی تو ممکن ہے برس بھر بعد بھی میرے حالات اتنے بہتر نہ ہو پائیں کہ میں خود کو شادی کرنے کا اہل پا سکوں لیکن اتنا یقین ضرور دلا سکتا ہوں تمھیں کہ برس بھر بعد یا جب کبھی بھی میرے حالات بہتر ہوئے اور میں نے شادی کا ارادہ کیا تو میری نظریں بلا تردد پہلے تمھاری طرف

ہی اٹھیں گی بشرطیکہ اس وقت بھی تمھارے دل میں میرے لیے محبت کے یہی جذبات رہے اور تم نے کسی اور سے شادی کرنے کو مجھ سے شادی کرنے پر ترجیح نہ دی۔ یہ بات میں تم سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں تمھیں ناحق کسی وعدے کی زنجیر میں باندھنا نہیں چاہتا۔ تمھیں پوری آزادی ہوگی کہ اس دوران اگر تمھیں کوئی بہتر اور مخلص آدمی مل جائے تو تم اس کا ہاتھ تھام لو۔'

میں نے دھیرے سے کہا: 'میں آپ کا انتظار کروں گی۔'

'ٹھیک ہے، میں تمھیں مایوس نہیں کروں گا۔' اس نے کہا پھر بولا: 'ہاں مگر ایک بات کا خیال رکھنا۔'

'وہ کیا؟'

'میرے سفر سے واپس لوٹ آنے اور حالات کے ہمارے حق میں سازگار ہونے تک تم اپنی دادی جان کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتاؤ گی۔'

'آپ کو یہ ہدایت کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ بھلا دادی جان کو بتا کر مجھے اپنی اور زیادہ شامت کو دعوت دینا ہے۔ ابھی تو وہ رات کو میرا دامن اپنے دامن سے کھول کر مجھے اپنے کمرے میں سونے کی اجازت دے بھی دیتی ہیں پھر تو وہ رات کو بھی مجھے اپنے ساتھ باندھ کر [illegible] گی۔'

'خاصی عقلمند لڑکی ہو تم۔'

'وہ تو میں ہوں۔' میں نے اترا کر کہا: 'خیر آپ یہ تو بتائیں کہ مجھے آپ کی واپسی کی اطلاع کیونکر ملے گی؟'

'بندرگاہ پر جہازوں کی آمد و رفت کا شیڈول اخبار میں دیکھتی رہنا۔ اس سے تمھیں میرے جہاز کی آمد کا علم ہو جائے گا۔'

'پھر؟'

'پھر جیسے ہی جہاز کراچی پہنچے گا میں تم سے ملنے آؤں گا۔ خواہ مجھے بیچ سمندر میں کھڑے جہاز سے کشتی میں سوار ہو کر ہی آنا پڑے۔'

'مجھ سے ملنے؟' میں نے گھبرا کر کہا۔

'گھبراؤ مت تمھارے گھر نہیں آؤں گا۔'

'تو پھر؟'

'سمندر کنارے اسی فصیل کے پاس جہاں بیٹھ کر ہم تم اور تمھاری دادی جان آئس کریم کھایا کرتے تھے۔' اس نے توقف کیا پھر بولا: 'دیکھو میں جہاز کے کراچی پہنچنے کے بعد پہلے ہی روز تم سے رات دس بجے ٹھیک اسی مقام پر ملنے آؤں گا۔ تم میرا انتظار کرنا۔'

'اور اگر آپ نہ آئے؟'

'کیا تمھیں مجھ پر بھروسا نہیں؟'

'آپ پر تو بھروسا ہے۔ تبھی تو آنکھیں بند کر کے آپ کے پاس چلی آئی ہوں البتہ... وقت کا اعتبار نہیں۔'

دہلی کا واقعہ

محمد اعظم نے ٹی وی خریدا، جس کی گارنٹی ایک سال کی تھی جب بھی ٹی وی بگڑا محمد اعظم نے کمپنی کو فون کیا۔ مکینک آیا اور درست کر گیا۔

ایک سال بعد خراب ہوا تو اپنے علاقے کے مکینک سے رجوع کرنا پڑا۔ مکینک نے تیس روپے فیس جمع کرائی۔ شام کو آیا ٹی وی دیکھا، اینٹینا گھمایا اور چلا گیا ٹی وی کام کرنے لگا۔ ہر مہینے میں ایک دو بار ایسا ہوتا رہا۔ ایک روز اعظم نے ایک دوکان پر "ٹی وی گائیڈ" نامی کتاب رکھی دیکھی، دس روپے میں خرید لی۔ پڑھا تو معلوم ہوا کہ جرمن ٹی وی کی خرابی صرف اینٹینا کی خرابی سے ہوتی ہے۔ آخر میں کتاب والا کا چھاپا ہوا کلر ٹی وی گائیڈ کا بھی اشتہار دیکھا، اعظم نے کلر ٹی وی گائیڈ بھی پچیس روپے میں خرید لی اور اسے پوری توجہ سے کئی کئی بار پڑھا۔ بہت سی باتیں معلوم ہوئیں تو اعظم نے ہمت کر کے مرمت کا سامان جو ٹی وی کو چیک کرنے میں مدد دیتا ہے ستر روپے میں خرید لیا۔ اپنے ٹی وی پر ہی پہلا کام کیا اور کامیاب رہا۔ ہمت بڑھی۔ پڑوس کے لوگوں کے ٹی وی بھی درست کیے اور تین مہینے میں خود پر بھروسہ کرنے لگا۔ ایک دن دیکھا۔ اعظم کے گھر پہ بورڈ لگا تھا۔

" کلر و بلیک اینڈ وہائٹ ٹی وی ریپیئر ہاؤس "

ملنے کا وقت: صبح ۸ تا ۹ بجے اور شام ۶ بجے کے بعد۔

اس طرح محمد اعظم نے اپنے لئے پارٹ ٹائم ورک حاصل کر کے اپنی آمدنی بڑھائی اور اپنے ٹی وی کی مرمت فیس سے بھی بچ گیا۔ ہر وہ انسان جو اردو پڑھنا جانتا ہو ہر ٹی وی سے دل چسپی رکھتا ہو "ٹی وی گائیڈ" اور "کلر ٹی وی گائیڈ" پڑھ کر اچھا مکینک بن سکتا ہے۔

.... ______ رام کرشن اگروال

'خدا نے چاہا تو وقت بھی ہمارا ساتھ دے گا۔' یہ کہتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے رائٹنگ ٹیبل پر جھک کر ایک کاغذ پر کچھ لکھا، پھر اس کاغذ کو دستے سے علیحدہ کر کے اسے تہہ کر کے میرے نزدیک پہنچا اور اسے میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ 'یہ میرے ایک قریبی دوست کا پتا ہے۔ احتیاطاً اسے رکھ لو اپنے پاس۔ اگر کبھی خط لکھنے کی ضرورت پڑ جائے تو تم ایک لفافے پر اس کا پتا لکھ کر اس لفافے میں میرے نام اپنا سربمہر خط ڈال کر ارسال کر دینا۔ میرا دوست مجھے یہ خط متوقع منزل پر بھجوا دے گا۔'

'اور اگر آپ کے دوست نے وہ خط الٹا ہمارے گھر ہی بھجوا دیا یا مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تو؟' میں نے تہہ شدہ کاغذ لیتے ہوئے کہا۔

"وہ مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ 'اس عمر میں بھی تم بلا کی دور اندیش ہو... خیر اول تو میرا یہ دوست اس قماش کا ہے نہیں، دوسرے تمھیں اپنے خط میں اپنا نام یا اتا پتا لکھنے کی بھلا ضرورت ہی کیا پڑی ہے۔ خط بھی اسی صورت میں لکھنا جب کہ خط لکھنا ضروری ہو جائے ورنہ مت لکھنا۔ تمھاری طرف سے کوئی خط نہ ملنے کو میں اپنی دانست میں سب ٹھیک ٹھاک ہے پر تعبیر کرتا رہوں گا۔'

'چاہے ادھر میں مر ہی جاؤں۔'

'تمھاری عمر مرنے کی نہیں۔'

'ارے زندگی کا کیا پتا۔ میرے ڈیڈی اور ممی بھی تو اپنی جوانی ہی میں چلے گئے۔'

'پر امید رہنا سیکھو۔' اس نے کہا پھر بولا۔ 'اچھا اب تم اچھی لڑکیوں کی طرح اٹھو اور یہ گٹھڑی اٹھا کر اپنے کمرے میں جاؤ۔ کسی نے دیکھ لیا تو برا ہوگا۔'

'دیکھنے والا ہے کون۔ رابعہ تو سرونٹ کوارٹر میں گھوڑے گدھے فروخت کیے سو رہی ہوگی اور دادی جان بے چاری بھلا دیکھ کہاں سکتی ہیں۔'

'اپنی دادی جان سے پیار ہے تمھیں؟'

'بہت۔'

'تو پھر دکھ کیوں دینے چلی تھیں انھیں؟'

مجھے خجالت نے آلیا۔

'دیکھو۔' اس نے مجھے سمجھایا۔ 'جن سے ہمیں پیار ہو انھیں کبھی کوئی دکھ دینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے... شاباش! اب اٹھ جاؤ۔'

"میں اپنی گٹھڑی سنبھالتے ہوئے اٹھ تو کھڑی ہوئی اور تب ہی مجھے خیال آیا کہ میں نے اس سے اس کے جہاز کا نام تو پوچھا ہی نہ تھا۔

'آپ اپنے جہاز کا نام تو بتائیں؟'

"اس نے جہاز کا نام بتانے کے بعد کہا۔ 'تمھیں جو پتا دیا ہے میں نے اس پر ایک جانب اپنے جہاز کا نام بھی لکھ دیا ہے۔'

'شکریہ۔'

"پھر ہم نے الوداعی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور میں اپنی ٹیکسی سے نکل آئی۔"

اور اس کے ساتھ ہی وہ چپ ہو گئی۔ اس کی خاموشی مجھے انتہائی گراں محسوس ہوئی۔

"پھر؟" میں نے بے تابانہ پوچھا۔

"اگلی صبح وہ چلا گیا۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر میں اس کے انتظار میں دن گزارنے لگی۔ دن، ہفتوں اور مہینوں میں بدلنے لگے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تقریباً ایک برس بعد واپس لوٹنے کو کہہ گیا تھا، میں برس بھر ہونے سے بہت پہلے ہی اخبار میں بندرگاہ پر جہازوں کی آمد و رفت کا شیڈول دیکھنے لگی۔ صبح جیسے ہی اخبار آتا، میں جلدی جلدی اس کے جہاز کے نام کی تلاش میں اخبار کے اوراق دیکھنے لگتی... طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد تقریباً دو ہفتے قبل بالآخر مجھے اخبار میں اس کے جہاز کا نام نظر آ گیا۔ پروگرام کے مطابق اس کے جہاز کو [illegible] بندرگاہ پر لنگر انداز ہونا تھا اور وعدے کے مطابق اسے پرسوں رات دس بجے سمندر کنارے اس اسٹیل کے نزدیک مجھ سے ملنے کے لیے آنا چاہیے تھا مگر میں پرسوں رات بھی اس کا انتظار کرتی رہی اور کل رات بھی مگر نہ وہ آیا اور نہ اس کی کوئی خبر... میں مایوس ہونے کے بعد انتہائی دل گرفتگی کے عالم میں واپس جا رہی تھی کہ آپ کا یہاں سے گزر ہوا اور..."

"دل گرفتہ ہونے کی کیا بات تھی، ہو سکتا ہے اس کا جہاز پہنچا ہی نہ ہو۔"

"نہیں، جہاز تو خیر پہنچ چکا ہے۔"

"تمھیں کیسے معلوم؟"

"کل کے اخبارات میں اس کے جہاز کا نام ان جہازوں کی فہرست میں شامل تھا جو بندرگاہ پر کھڑے ہیں۔ وہ چاہتا تو پرسوں نہیں کل رات تو مجھ سے ملنے کے لیے آ سکتا تھا مگر نہیں آیا۔"

"تو تم خود اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرو۔"

"میرے حالات جانتے ہوئے بھی آپ ایسی بات کر رہے ہیں۔ کیا آپ کو میں نے نہیں بتایا کہ میں آج کل رات کے بعد دادی جان کے ساتھ بند ہو کر بیٹھنا پڑتا ہے۔"

"تو پھر اس کے دوست کی معرفت خط لکھ دیا ہوتا، جس کا پتا وہ تمھیں جاتے وقت دے گیا تھا۔"

"یہ خیال مجھے بھی آیا تھا مگر پھر میں یہ سوچ کر رہ گئی کہ خدا جانے

اس تک میرا خط پہنچ بھی پائے گا یا نہیں اور پہنچے گا بھی تو کب تک۔"

"اوہو! خدشات اور اگر مگر کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ بابا اگر تم نے کل خط لکھ دیا ہوتا اور کل ہی پوسٹ بھی کر دیتیں تو ایک دو روز میں خط اسے مل بھی جاتا۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرنے پر اکتفا کیا۔

"ہو سکتا ہے وہ ابھی جہاز سے اتر ہی نہ سکا ہو، بہت ہی مصروف ہو۔" میں نے کہا۔

"میرا دل یہ بات نہیں مانتا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر جہاز کو رخصت نہ بھی ملی تو وہ کشتی میں سوار ہو کر ساحل تک پہنچے گا اور پہلے ہی دن مجھ سے ملنے آئے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ اپنے گھر ہی نہ چلا گیا ہو۔"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے تائید کی۔

"میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کیا ہوا وعدہ یوں فراموش کر دے گا۔" وہ تڑپ کر بولی۔ پھر اس نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "گزشتہ ایک برس سے میں اس کی راہ تک رہی تھی۔ وہ وعدہ فراموش کیا جائے کہ میں نے ایک ایک لمحہ کس بے تابی سے گزارا ہے۔"

"مایوس مت ہو۔" میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ "آپ کو یاد ہو گا میں نے پرسوں رات آپ سے کہا تھا کہ مجھے ایک اہم معاملے میں آپ سے مشورہ لینا ہے۔ یہی تھا وہ معاملہ اب آپ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"ایسا کرو۔" میں نے سوچ بچار میں وقت ضائع کیے بغیر کہا۔ "تم اس کے نام ایک خط لکھ کر مجھے دو۔ میں تمھارا خط اسے پہنچانے کی کوشش کروں گا۔"

"اس کے دوست کے توسط سے؟" اس نے استفہامیہ لہجے میں کہا۔

"ضروری نہیں ویسے احتیاطاً تم اس کے دوست کا پتا بھی دے دینا۔"

"کیا کوئی اور راستہ بھی ہے اسے خط پہنچانے کا؟"

"بالکل ہے بھئی اس کا جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہے تو اس تک پہنچنا مشکل تو ہو سکتا ہے ناممکن ہرگز نہیں۔ تم خط لکھ کر مجھے دینا اگر وہ یہیں ہے میرا مطلب ہے اپنے جہاز پر یا اپنے اس دوست کے پاس جس کا پتا وہ تمھیں دے کر گیا تھا یا اپنے کسی اور دوست کے ہاں جس کا اتا پتا مجھے اس کے مذکورہ دوست سے مل جانا ممکن ہو تو میرا وعدہ ہے کہ تمھارا خط حفاظت اور رازداری کے ساتھ اس تک پہنچا دوں گا۔"

"کیا واقعی آپ یہ ساری زحمت اٹھانے کو تیار ہیں؟"

"اگر میں تمھارے کام آ سکا تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"اوہ!" اس کے لہجے میں بے پناہ حسرت عود کر آئی۔ "آپ نہیں جانتے کہ آپ نے میری جانب مدد کا ہاتھ بڑھا کر مجھے کیسی خوشی دی ہے۔ میں... میں آپ کو خط ضرور دوں گی۔"

"کل رات تم مجھے یہاں خط لا دینا۔ میں پرسوں صبح پہلا کام یہی کروں گا کہ کسی طرح تمھارا خط اس تک پہنچانے کی کوشش کروں۔"

"کیا آپ کل صبح یہ کام نہیں کر سکتے؟"

"اگر تم نے کل رات مجھے یہ قصہ سنا دیا ہوتا اور آج خط لے آئی ہوتیں تو میں یقیناً کل صبح ہی یہ کام کر دیتا۔"

"وہ... خط..." وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "خط تو میں لائی ہوں لکھ کر۔"

"واقعی!"

"ہاں۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ "نہ جانے کیوں مجھے یقین سا تھا کہ آپ میری مدد ضرور کریں گے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک نلکی کی صورت لپٹا ہوا لفافہ اپنے گریبان سے نکال کر میرے ہاتھ میں دبا دیا۔ جونہی اس کے ہاتھ میرے ہاتھ سے مس ہوئے میرے جسم میں پھر ایک برقی رو سی دوڑ گئی۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔" اس نے کہا اور میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"کام ہوا نہیں اور شکریہ ادا کرنے لگیں۔"

"کام ہو یا نہ ہو وہ میری قسمت... لیکن آپ کے اچھا ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ آپ کی جگہ کوئی دوسرا مرد ہوتا تو وہ میری کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ کیا عجب کہ مجھے بلیک میل کرنے کی دھمکی دیتا۔ اور کچھ نہیں تو اس سناٹے اور تاریکی ہی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا مگر آپ... آپ واقعی فرشتہ صفت آدمی ہیں۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے خدا نے کسی فرشتے کو آپ کے روپ میں میری مدد کرنے کے لیے بھیج دیا ہو۔ اگرچہ علی نواز کے بعد میں اپنے دل کا دروازہ بند کر چکی ہوں اور یہ طے ہے کہ اس حیثیت میں تو کبھی کوئی دوسرا آدمی میرے دل میں داخل نہ ہو سکے گا مگر ایک دوست کی حیثیت سے آپ میرے لیے ہمیشہ محترم رہیں گے۔ میں آپ کی شرافت سے اس قدر متاثر ہو چکی ہوں کہ اس تک میرا خط پہنچے یا نہ پہنچے آپ کی اور میری دوستی ہمیشہ برقرار رہے گی۔"

میں نے موہوم اجیالے میں اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں ٹھہرانے کی کوشش کی۔

وہ واقعی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔

میرے خوابوں کی پری سے بڑھ کر حسین!

مگر اس خیال نے کہ وہ میرے لیے نہ تھی میری آنکھوں کے کنارے بھگو دیے۔ دفعتاً مجھے اپنی بیاض میں محفوظ یہ نظم یاد آنے لگی۔

’عجیب لڑکی تمھیں خبر ہے
میں کتنی صدیوں کی منزلوں سے گزر کے پہنچا ہوں اس جگہ تک
بچا کے رستوں کے پیچ و خم سے میں خود کو لایا ہوں اس جگہ تک
کہاں کہاں سے بھٹک بھٹک کر میں آج آیا تمھارے در تک
مگر یہ تم نے جتا دیا ہے
بڑی ادا سے بتا دیا ہے
تمھارے دل تک پہنچنے والی تمام راہیں سمٹ چکی ہیں
اِدھر یہ عالم کہ میرے اشکوں میں ساری آہیں سمٹ چکی ہیں
حسین لڑکی! میں جانتا ہوں
تمھاری دنیا میں چاہتیں ہیں، مسرتوں کا سُرور بھی ہے!
تمھیں سراپا ہے اتنا کہ اس پہ تم کو غرور بھی ہے
میں ایک سائل غموں سے گھائل
کہاں کہاں سے بھٹک بھٹک کر میں آج آیا تمھارے در تک
جو ہو سکے تو کرم یہ کر دو۔
تم اپنے لمحوں سے ایک لمحہ بچا کے دامن میں میرے بھر دو!‘

اس رات جب ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تو اس وعدے کے ساتھ کہ کل رات پھر اسی مقام پر ملاقات ہوگی۔

★

اگلی صبح میں نے اپنے ایک رفیقِ کار کو سویرے سویرے فون کیا کہ وہ باس کو یہ بتا دے کہ میں ناسازیٔ طبع کے سبب کام پر نہ آسکوں گا اور اپنے مشن پر نکل کھڑا ہوا۔

علی نواز تک پہنچنے میں مجھے کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا یہ ایک الگ داستان ہے۔ بہرحال کسی کی منت سماجت اور کسی کی خوشامد کر کے میں بالآخر علی نواز تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

اور اس کے روبرو پہنچنے کے بعد مجھے اپنی بے وقعتی کا احساس بھی ہوا۔

وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار نہ سہی مگر لائقِ ستائش ضرور تھا۔ الفت کا اس کی محبت میں گرفتار ہونا قطعاً فطری عمل تھا۔ علی نواز جیسے بلند و بالا قد و قامت، مضبوط کاٹھ، نشیلی آنکھوں اور گھنی مونچھوں والے نوجوان پر تو کوئی بھی لڑکی عاشق ہو سکتی تھی۔

میں نے اپنے تعارف کے بعد الفت کا خط اسے دیا تو وہ خط پڑھنے کے بعد مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو الفت کیونکر جانتی ہے؟“

”محض ایک اتفاق ہمارے درمیان شناسائی کا باعث بن گیا۔ وہ آپ کے انتظار میں ساحل پر کھڑی رو رہی تھی کہ میرا وہاں سے گزر ہوا۔ مجھے اس نے آپ تک الفت کا گرداننے کی کوشش کی مگر پھر اسے اپنی بے بسی پہ بیٹھے ہوئے ہیں مجبور ہونا پڑا۔“

”میں کیونکر؟“

”یہ آپ کو الفت ہی بتائیں گی۔ قصہ مختصر یہ کہ اس نے یہ خط آپ تک پہنچانے کے سلسلے میں میری مدد چاہی سو میں آپ تک یہ امانت پہنچا کر جا رہا ہوں۔“

”الفت سے آپ کی واقفیت کتنی پرانی ہے؟“

”پرسوں رات ہی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔“ میں نے علی نواز کی آنکھوں میں تحریر پڑھتے ہوئے کہا۔ ”علی نواز صاحب! آپ میرے اور الفت کے بارے میں زیادہ الجھن میں نہ پڑیں۔ وہ لڑکی واقعی ہمدردی اور محبت کیے جانے کے لائق ہے۔ امید جو آپ اس کے ہاتھ میں تھما گئے تھے وہ اسی کو تھامے آپ کی منتظر ہے اسے مایوس نہ کیجیے گا اور مجھے فقط ایک وسیلہ سمجھیے آپ کو آپ کا وعدہ یاد دلانے کا۔“

”میں آپ کا شکر گزار ہوں مونس صاحب!“ اس نے کہا۔

”شکریہ کی کوئی بات نہیں، انسان ہی انسان کی دوا ہے۔ میں نے تو الفت کی چارہ گری کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر آپ اس سے مل لیے تو میں سمجھوں گا کہ میری کوشش رائگاں نہیں گئی۔“

”میں ضرور ملوں گا اس سے۔ دراصل نوکری بذاتِ خود ایک مجبوری ہے۔ اپنی حتی الامکان کوشش کے باوجود میں وقت نہیں نکال سکا ہوں اب تک۔ تاہم آج رات ضرور امید ہے۔ کیا آپ ایک زحمت اور کریں گے؟“

”ارشاد۔“

”الفت کو یہ پیغام پہنچانے کی زحمت کیجیے کہ میں آج رات دس بجے اس سے ملنے کے لیے آؤں گا وہ میری منتظر رہے۔“

”آپ اطمینان رکھیے، اسے یہ پیغام پہنچ جائے گا۔“

”بہت شکریہ۔“

”اب مجھے اجازت دیجیے۔“

”او میں نے آپ سے چائے کافی وغیرہ کا تو پوچھا ہی نہیں۔“

”جب آدمی کسی کوشش کی نذر سے دیکھ رہا ہو تو اسے ایسی باتوں کا کہاں خیال رہتا ہے۔“

میری اس چوٹ پر وہ خجل نظر آنے لگا اور میرے ہزار انکار کے باوجود اس نے کافی پیے بنا اُٹھنے کی اجازت نہ دی۔

★

اس شب میں جب ساحلِ سمندر پہ پہنچا تو وہ میری منتظر تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے انتہائی بے تابی سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”بادام تو لیتے رہو۔“ میں نے کہا اور مجھے علی نواز پر رشک آنے لگا۔

پھر میں نے انہیں دھیرے دھیرے ملی نواز تک اپنی رسائی
اور اس سے ملاقات کا احوال سنا کر الجھا دیا۔ وہ انتہائی تجسس اور اشتیاق
کے ساتھ سنتی رہی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ ملی نواز آج اس سے
ملنے آ رہا ہے تو وہ خوشی کے مارے اچھل پڑی۔

"مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔"

میرا جی چاہا کہ اسے وہ تمام واہمے اور خدشات یاد دلاؤں جن
کا اس نے ملی نواز کی بابت کل میرے سامنے اظہار کیا تھا لیکن میں
چاہتے ہوئے بھی ایسا نہ کر سکا۔

ملی نواز کے آنے کی خبر نے اس کی جون ہی بدل دی تھی۔ وہ
بات بے بات کھلی پڑ رہی تھی۔ کوہ کے گھیرے بجلی کے کھمبوں کے مدھم
اجالے میں اس کا حسین چہرہ جیسے ترنگ رہا تھا۔ اور تب میں یہ بھی
میں سوچ رہا تھا کہ لوگ جب خوش ہوتے ہیں تو کس قدر خوب صورت
دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنے دل کی خوشی دوسروں
کے دل میں بھی انڈیل دینے کے درپے ہوں۔ وہ چاہتے ہیں پوری
دنیا ان کے سنگ مسکرائے۔ جب وہ کھلکھلا کر ہنسیں تو ساری دنیا بھی ان
کے ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اس رات وہ بھی انتہائی مہربان ہوئی
جا رہی تھی۔ میرے ساتھ اس کے رویے میں ایک عجیب سی حلاوت
تھی۔ اس کی مسکراہٹ، اس کا التفات، اس کی آنکھوں میں بکھرے
یقین کی چمک مجھے بدگمان کیے دے رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید وہ...

غلط! میں بھی کس قدر احمق تھا۔ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی کس
خوش فہمی میں مبتلا کیوں ہوا جا رہا تھا؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی
مسکراہٹ، اس کا التفات، اس کا اضطراب، اس کی آنکھوں میں چھلکتے
یقین کا خمار اس مسرت کے مرہونِ منت تھے جو اسے اپنے محبوب سے
ملنے کے خیال سے ہو رہی تھی۔ میں کیوں اس خوش فہمی کا دامن تھامنے
کی کوشش کر رہا تھا کہ شاید وہ...

"کیا آپ جانتے ہیں کہ میں اتنی خوش کیوں ہوں؟" اس نے
کہا پھر بولی "کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کو دیکھ کر میرا دل ایک ناقابلِ بیان
مسرت سے کیوں معمور ہوئے جا رہا ہے؟ کیوں آپ مجھے آج اتنے
اچھے لگ رہے ہیں؟"

میرا دل یکبارگی دھڑکنے لگا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں کہ آپ کی جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو وہ اب تک جنون کا
روپ دھار چکا ہوتا۔ وہ میری اس طور مدد کرنے کے بجائے جیسی کہ
آپ نے کی ہے، مجھے مزید پریشانی میں مبتلا کر چکا ہوتا اور اس وقت
آپ کی طرح انتہائی شرافت اور انسانیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے
میرے ساتھ بیٹھ کر ملی نواز کا انتظار کرنے کے بجائے اس کا رقیب بنا
تلوار لیے بیٹھا ہوتا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لیتا آہیں بھر کر جلا جاتا کہ

میں دم توڑ چکا ہوتا۔ وہ اس وقت دنیا کا مظلوم ترین انسان دکھائی
دینے کی کوشش کر رہا ہوتا مگر آپ! آپ واقعی عظیم ہیں۔"

اس نے دھیرے سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔
"کتنے اچھے ہیں آپ۔"

وہ میری آنکھوں میں اتر آنے والی نمی کو نہ دیکھ سکی اور
ہنس دی۔ میرا دل چپکے چپکے سسکنے لگا۔

"اگر آپ نے میری مدد نہ کی ہوتی تو میں کیا کرتی؟" اس نے
گھڑی بھر کے توقف کے بعد کہا۔

"آپ کتنے محسن ہیں اور کتنے بے غرض بھی۔ اب آپ کی اور
میری دوستی تا عمر برقرار رہے گی اور میں ملی نواز سے اپنی شادی کے بعد اسے
بھی پابند کر دوں گی کہ وہ آپ کی اسی قدر عزت کرے جتنی کہ میں
کرتی ہوں۔"

میرے دل میں الفت کی بے پناہ مسرت اور ملی نواز کے
وجود کے خلاف ایک جارحانہ لہر ابھری۔ ملی نواز کے مقدر پر رشک کے
احساس نے حسد کی جون لے لی اور میں نے کہا "فرض کرو وہ نہ آیا تو
پھر تم کیا کرو گی؟"

اس نے تڑپ کر میری جانب دیکھا پھر بولی "خدا کے واسطے
زبان سے ایسی بدفال نہ نکالیں۔" پھر اس نے عجیب تیوروں کے ساتھ
کہا "دیکھیے اگر اس وقت میں اتنی خوش نہ ہوتی تو آپ کی اس بات
پر خواہ یہ ایک خیال آرائی یا خدشہ ہی کیوں نہ سہی... اس بری طرح بلبلا
اٹھتی کہ آپ کو مجھے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ اگرچہ آپ نے تو ابھی دراصل
میں ایک خدشے کا اظہار کیا ہے لیکن میں آج اتنی خوش ہوں کہ کسی
بدگمانی یا خدشے کو اپنے دل میں تل بھر جگہ بھی نہیں دینا چاہتی ہوں۔
سچی بات یہ ہے کہ میں آج اتنی خوش ہوں کہ مجھے آسمان پر سجے چاند
ستارے بھی اپنے سنگ قہقہے لگاتے محسوس ہو رہے ہیں۔"

تب ہی ہمیں اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔
اور ہم نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو ایک شخص تاریکی میں ہمیں اپنی جانب
آتا دکھائی دیا۔

جانور

ایک گھنے جنگل میں شکار کھیلتے
ہوئے کسی قدر اناڑی شکاری نے اپنے ملازم سے
پوچھا: "اس جانور کا کیا نام ہے جس پر میں نے ابھی ابھی
جھاڑیوں میں گولی چلائی تھی؟"
ملازم نے جھاڑیوں میں جا کر شکار کو دیکھنے کے
بعد اطلاع دی: "وہ کہتا ہے کہ اس کا نام عبداللہ ہے۔"

"اوہ! وہ آگیا ہے۔" الفت نے خوشی سے معمور لہجے میں کہا۔
'میری بدقسمتی!' میں نے جی ہی جی میں سوچا۔ ایک انجانا دکھ، ایک گہری مایوسی میرے دل کو اپنی مٹھی میں دبوچے لے رہی تھی۔
لیکن تاریکی سے نیم تاریکی میں آنے والا شخص علی نواز نہ تھا۔
جب وہ شخص ہمارے نزدیک سے ہوتا نشیب کی جانب بڑھ گیا تو وہ بولی۔ "انتظار کی کیفیت بھی کیسی صبر آزما ہوا کرتی ہے۔ آج کا دن بھی اتنی مشکل سے کٹا کہ بتا نہیں سکتی۔"
میں ایک دبی دبی سی سرد آہ کھینچ کر رہ گیا۔
"کیا تم جانتی ہو الفت کہ میں نے دن کیونکر گزارا؟" میں نے گھائل لہجے میں کہا۔
"کیونکر بھلا؟"
"دفتر سے تو میں نے چھٹی لے لی تھی۔ تمہاری نامہ بری اور علی نواز سے ملاقات کے بعد میں گھر واپس آکر بستر پر پڑ گیا۔ شام کے گہرے ہونے تک کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا۔ سونے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر آنکھ لگ ہی نہ سکی۔ رات کا اندھیرا پھیل جانے پر جب میں بستر سے اٹھا تو مجھے یک بیک یوں لگا جیسے کسی مسجد کی نقشے کی گم گشتہ صدا ایک عمر کے بعد میری سماعت میں در آئی ہو۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ نغمہ میری ساری زندگی میری روح سے کسی چشمے کی طرح پھوٹ پڑنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہا ہو اور اب..."
"خدا جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں تو خاک نہیں آرہا۔"
میں سر جھکا کر چپ ہو رہا اور وہ ایک بار پھر ویسی ہی شوخ، باتونی اور مسرور نظر آنے لگی۔ مجھے اس کی بے حسی پہ تاؤ آنے لگا۔ وہ دنیا کو اپنے حوالے سے دیکھ رہی تھی۔ میری جذباتی کیفیت کو اس نے بےلحاظی کی حد تک نظر انداز کر دینے کی کوشش کی تھی۔
اس نے شوخی اور سرور کی انتہائی حدوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ "بچ مچ مونس صاحب! آپ گوشت پوست کے انسان ہیں یا کچھ اور؟ کتنی عجیب بات ہے کہ آپ نے مجھ سے بے تکلف ہونے یا اظہار محبت کرنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ اگر آپ اپنی شرافت اور کردار کی پختگی کی داد وصول کرنا چاہتے ہیں تو میرے عشق کی داد بھی دینا پڑے گی آپ کو کہ آپ سے پہلی ہی ملاقات میں آپ کو اپنا ہمراز بنانے کا ارادہ ظاہر کر بیٹھی اور دوسری ملاقات میں اپنا سارا کچا چٹھا کھول کر آپ کے آگے رکھ دیا۔ بھلا کوئی عقلمند لڑکی ایسا کر سکتی تھی؟"
میرے دل میں رشک و حسد کی ایک لہر اٹھی۔
کیوں اتنی مسرور تھی وہ علی نواز کی آمد کے خیال سے اور کیوں اتنی بے نیازی برت رہی تھی وہ میری قلبی کیفیت سے!
"سوا گیارہ بج چکے ہیں۔" میں نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے جتایا۔ میرا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اسے وقت جتا کر ایک ہلکا سا دھچکا تو پہنچاؤں کہ اب رات آگئی ہو چلی تھی کہ اس کے محبوب کا آنا مشکل ہی نظر آتا تھا۔
میرا وار خالی نہ گیا۔
"اچھا!" اس کی آواز کا ترنم جلترنگ کا ساتھ اور لہجے کی شوخی یک بیک ماند پڑ گئی۔ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو اپنی آنکھوں کے بے حد نزدیک کرتے ہوئے اس نے بغور گھڑی میں دیکھا پھر بوجھل آواز میں بولی۔ "واقعی سوا گیارہ بج گئے اور اس کا ذرہ برابر بھی پتہ..." آواز رندھ جانے کے باعث اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
اس کے لہجے کی مایوسی سے مجھے اپنی سفاکی پر شرمندگی محسوس ہوئی۔
کتنی خوش تھی وہ چند لمحے پہلے!
بھلا کیا ضرورت تھی مجھے یہ جتانے کی کہ سوا گیارہ بج چکے ہیں۔ کتنا بےرحم ہو گیا تھا میں جذبہ حسد سے مغلوب ہو کر۔
اپنی اس بےرحمی کے ازالے اور غلطی کی تلافی کی میرے نزدیک بس ایک ہی صورت تھی کہ اسے تسلی دیتا اور اس کی آس بندھانے کی کوشش کرتا۔ سو میں نے کی۔
"ہو سکتا ہے آج اسے کوئی کام پڑ گیا ہو... کوئی ایسا کام کہ اسے یہاں آنے کی مہلت نہ مل پائی ہو۔ میں جہاز پر گیا تھا اور میں نے دیکھا تھا کہ وہ خاصا مصروف رہتا ہے وہاں۔ یقیناً کچھ ایسی مصروفیت ہو گی کہ وہ اب تک نہیں آسکا ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ دیر سے آئے۔"
"میں اس کے انتظار میں پوری رات تو یہاں نہیں بیٹھ سکتی۔ بقول آپ کے اس نے دس بجے یہاں آنے کو کہا تھا اب تو سوا گیارہ بج چکے ہیں۔"
"کچھ دیر اور انتظار کر لو۔"
"اور اگر وہ پھر بھی نہ آیا تو؟"
"تو میں تمہاری خاطر کل پھر اپنے دفتر سے چھٹی کروں گا اور اس کے نہ آنے کا سبب معلوم کرنے اس کے پاس جاؤں گا۔"
"اوہ! شکریہ۔" وہ جذبات سے معمور لہجے میں بولی۔ "آپ کتنے اچھے ہیں۔ میں آپ کے احسان کا بدلہ کبھی نہ اتار سکوں گی۔"
اس کی آنکھوں میں بلوریں لیتی نمی نے مجھے اس کی آنکھوں میں بغور جھانکنے پر مجبور کر دیا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ اس کی آنکھوں میں واقعی آنسو تھے۔
"پیاری دوست! مجھے تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تکلیف ہو رہی ہے۔" میں نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔
"نہیں میں رو تو نہیں رہی۔" اس نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ "بلکہ میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ آپ کتنے اچھے ہیں، کس قدر مہربان

[illegible] ہی دل میں آپ کا اور علی نواز کا تقابل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اگرچہ مجھے اس سے محبت ہے مگر مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ آپ اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہذب اور سلجھے ہوئے ہیں۔ وہ آپ جیسا کیوں نہیں ہے؟ کاش وہ آپ جیسا ہوتا!"

میں کچھ نہیں بولا۔ وہ کچھ دیر میرے کچھ کہنے کی منتظر رہی۔

"پتا ہے کیا؟" وہ بوجھل لہجے میں بولی تب مجھے اس کی سنجیدگی اور خاموشی سے ہمیشہ ڈر لگا کرتا تھا اگرچہ جب میں اپنی گٹھری لے اس کے ساتھ فرار ہو جانے کی نیت سے اس کے پاس پہنچی تو اس نے جس چاہت سے مجھے دیکھا وہ مجھے آج بھی یاد ہے۔ مگر اس نے میری حوصلہ شکنی کی مگر یہ کہہ کر کہ اگر اس نے کبھی شادی کے بارے میں سوچا تو میں پہلی لڑکی ہوں گی جس کا وہ اپنی شریک سفر کے طور پر انتخاب کرے گا"

اس نے میرے دل کو ایک انوکھی مسرت و خوشی سے مالا مال کر دیا تھا۔ اس وقت میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اپنا وعدہ یوں فراموش کر دے گا کہ مجھ سے ملنے کے لیے آنے کی زحمت بھی گوارا نہ کرے گا۔"

"وہ آئے گا ضرور آئے گا۔ آج نہ سہی کل سہی۔" میں نے اسے پھر تسلی دینے کی کوشش کی اور کہا "تم فکر نہ کرو میں کل دوبارہ جاؤں گا اس کے پاس۔"

بارہ بجے کے آس پاس وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میرا خیال ہے اب کافی دیر ہو چکی ہمیں اٹھ لینا چاہیے۔ کل وہ ضرور آئے گا۔ میں کل پھر اس سے ملوں گا اسے بتاؤں گا کہ تم اور میں گزشتہ شب کتنی دیر تک اور کس بے چینی سے اس کا انتظار کرتے رہے۔ کل رات ہم پھر اسی مقام پر ملیں گے۔"

"کتنے بجے؟"

"بھئی میں تو شام ڈھلتے ہی ٹاؤن بن کر یہاں آ پہنچوں گا۔ تمہیں جیسے ہی موقع ملے نکل آنا گھر سے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

★

اگلے روز جب میں نے گزشتہ روز کی طرح پھر علی نواز کے جہاز پر اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ دو دن کی چھٹی لے کر جہاز سے اترا ہوا ہے۔ مجھے آپ ہی آپ یقین سا ہو گیا کہ اس نے الفت سے ملنے کی خاطر چھٹی لی ہوگی۔

اس رات جب وہ آئی تو اس نے آتے ہی بے تابانہ پوچھا۔

"آپ ملنے گئے تھے اس سے؟"

"ہاں۔"

"کیا کہا اس نے کیوں نہیں آیا تھا وہ کل؟"

"بھئی وہ تو کل سے دو دن کی چھٹی لے کر جہاز سے اترا ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے تم سے ملنے کی خاطر چھٹی لی ہوگی۔ انشاءاللہ آج وہ ضرور آئے گا۔"

مگر اس رات بھی اس کے لیے جلا انتظار لاحاصل رہا۔ وہ نہیں آیا الفت کی حالت دیدنی تھی۔

رات ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ سمندر کنارے کھڑی سنگی فصیل پر بعینہ ویسے ہی جھک کر رونے لگی جیسے میں نے اسے پہلی بار روتے دیکھا تھا۔ میں نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی مگر وہ بری طرح تڑپ رہی تھی۔

"مجھے جھوٹی تسلی مت دیں۔" اس نے گھائل لہجے میں کہا۔ "مجھ سے یہ مت کہیں کہ وہ آج نہ سہی کل ضرور آئے گا۔ مجھے یہ سمجھانے کی کوشش مت کریں کہ اس نے میرے ساتھ بے حسی اور بے مروتی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ مجھ سی بے نوا اور مجبور لڑکی سے اسے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ اسے اپنا وعدہ بھلا کیوں یاد رہا ہوگا؟"

اس کی آواز لحظہ بہ لحظہ دھیمی سے دھیمی ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ لحظہ بہ لحظہ گھٹتی ہوئی آواز سسکیوں میں بدل گئی۔ میرا دل کٹنے لگا۔

"کتنا بے رحم ہے وہ!" قدرے توقف سے اس نے پھر بولنا شروع کیا "بے شک نہ آتا وہ مگر آپ سے جھوٹا وعدہ تو نہ کرتا آنے کا۔ صاف کہہ دیتا کہ ملنا نہیں چاہتا مگر جھوٹا وعدہ کر کے مجھے انتظار کی صلیب پر لٹکا کر میرا تماشا تو نہ بناتا کہ مجھے خود اپنے آپ سے شرمندگی محسوس ہونے لگتی۔ میرا قصور فقط اتنا ہی تو ہے نا کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ اور اس محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہی میں اس رات اپنا اسباب سمیٹ کر اس کے پاس جا پہنچی تھی۔ اب سوچتی ہوں تو مجھے اس خیال سے ندامت ہونے لگتی ہے کہ اس محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اس رات خود کو اس کے قدموں میں گرا دیا تھا... میرے اس قصور کی کتنی بڑی سزا دی ہے اس نے مجھے!"

"فکر مت کرو ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے ہیں۔"

"اب بھلا کیا آئے گا!"

"تھوڑی دیر اور انتظار کر لینے میں کیا حرج ہے۔"

"اگر وہ آج بھی نہ آیا تو؟"

"تو ہم کل بھی اس کا انتظار کریں گے کیونکہ وہ دو دن کی چھٹی پر ہے۔"

"اور اگر وہ کل بھی نہ آیا تو؟"

"تو میں پھر جاؤں گا اس سے ملنے۔"

"روز روز دفتر سے چھٹی کریں گے تو افسر خفا نہیں ہوں گے آپ کے؟"

"پرسوں ہفتہ واری تعطیل ہوگی۔"

"ہاں واقعی یہ سوال تو عجیب ہے۔" اس نے کہا پھر یک بیک لہجہ بدل کر بولی۔ "نہیں، اب آپ نہیں جائیں گے اس کے پاس میرا نمائندہ بن کر۔۔۔ بس بہت ہو چکا۔ اب میں یہ باور کرا دوں گی خود کو کہ میں علی نواز نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتی۔۔۔ نہ میں اسے جانتی ہوں نہ اس سے محبت کرتی ہوں۔ اگر اسے اپنے وعدے کا پاس نہیں تو میں بھی اسے بھلا دینے کی کوشش کروں گی۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے پھر اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔

"غلطی میری تھی کہ میں نے خود کو اس کے قدموں میں گرا دینے کی حماقت کی۔ مجھے سزا ملنی چاہیے۔" اس کی بھرائی ہوئی آواز اس کے دلی ملال کی مظہر تھی۔

میرا جی بھر آیا۔ میں نے بولنے کی کوشش کی مگر میری آواز نے ساتھ نہ دیا۔

"اگر اس کی جگہ آپ ہوتے۔" اس نے دھیمے سُروں میں کہا۔ "تو آپ کا طرز عمل یہ نہ ہوتا۔ آپ ایک ناسمجھ اور بے وقوف لڑکی کو یوں تماشا نہ بنا دیتے بلکہ آپ نے اس کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا رویہ روا رکھا ہوتا۔ آپ نے اس کی محبت کا جواب محبت اور خلوص سے دیا ہوتا۔ آپ اسے [illegible] سمجھاتے اور اپنائیت کا رویہ اختیار کرتے۔ آپ اس بکھری ہوئی لڑکی کو ریزہ ریزہ سمیٹ لیتے اور اپنے مشفق ہاتھوں سے آپ نے اس کے دکھی دل پر اپنی محبت کے پھاہے رکھے ہوتے۔ خدایا! کتنا فرق ہے علی نواز میں اور آپ میں! کاش! وہ بھی آپ جیسا ہوتا یا پھر۔۔۔ آپ آپ نہ ہوتے علی نواز ہوتے۔"

"اوہ! یہ کیا کہہ گئی تھی وہ!" میں مضطرب ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا؟" اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں!"

"کچھ تو ہے۔" اس کے لہجے میں اصرار کی کیفیت تھی۔

"کچھ نہیں۔"

"پلیز بتائیں نا۔" اس نے یک بیک میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ میرے رگ و پے میں برق سی لپک گئی۔

"بتائیے نا کیا بات ہے؟ آپ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"مشک اور عشق بھی بھلا چھپے ہیں کبھی۔" میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"میں سمجھی نہیں۔"

نہ جانے کہاں سے مجھ میں ایک ناقابل یقین جرأت عود کر آئی۔

"میں بتائے دیتا ہوں تمہیں۔" میں نے کہا اور میں۔۔۔ میں جو الفت سے ملنے سے قبل محبت ذات سے بے نیاز رہنے والا ایک خشک سا آدمی ہوا کرتا تھا یکایک ایک سرفروش عاشق کا روپ دھار گیا۔ "الفت۔" میں نے جذبات سے مغلوب لہجے میں کہا۔ "میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔"

وہ تھوڑی دیر چپ رہی پھر اس نے کہا۔ "مجھے آپ کی اس غیر معمولی سنجیدگی اور درد بھری آنکھوں سے تھوڑا تھوڑا اندازہ تو ہو چلا تھا۔"

"کیا تم یقین کرو گی کہ میں تمہاری محبت میں کم و بیش ویسے ہی گرفتار ہو چکا ہوں جیسے کہ تم علی نواز کی محبت میں گرفتار ہو کر اس کے پاس جا پہنچی تھیں۔ تمہاری خوش قسمتی کہ جب تم نے اس سے محبت کی تو وہ کسی اور کی محبت کا اسیر نہ تھا جب کہ میری بدقسمتی یہ ہے کہ میرا دل اس وقت تمہاری محبت میں گرفتار ہوا ہے جب تمہارا دل کسی اور کے لیے تڑپ رہا ہے۔"

"یہ۔۔۔ یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ مجھے آپ سے ایسی باتوں کی امید نہ تھی۔ آپ تو بہت شرمیلے سے آدمی ہوا کرتے تھے۔"

"محبت بجائے خود ایک حوصلہ ہے۔"

الفت سر جھکائے بیٹھی رہی پھر اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیاں مضطربانہ چٹخاتے ہوئے بولی۔ "مجھے یقین نہیں آتا کہ لوگ اتنی جلدی بدل سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے اس تیزی سے کایا کلپ ہو جاتی ہے بعض لوگوں کی۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں خود اپنی کایا کلپ پر حیران ہوں۔"

"آپ کھڑے کیوں ہیں بیٹھ جائیے تو سہی۔"

"نہیں میرا اندرونی اضطراب مجھے بیٹھنے کی اجازت نہیں دے رہا۔ زبان کھل گئی ہے تو مجھے دل کی بات کہہ لینے دو۔" میں نے لمحہ بھر کو توقف کرنے کے بعد کہا۔ "میں اب زیادہ دیر یہاں نہیں رکوں گا اور آج کے بعد تم دوبارہ کبھی میری صورت دیکھو گی بھی نہیں۔ مجھے جو کہنا ہے کہوں گا اور پھر چلا جاؤں گا۔ دیکھو الفت! تم شاید کبھی یہ نہ جان پاتیں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں اس راز کو اپنے نہاں خانۂ دل میں پنہاں رکھتا اور کبھی کسی کو کچھ نہ بتا پاتا لیکن۔۔۔ قصور تمہارا ہے تم نے مجھے زبان کھول دینے پر مجبور کر دیا۔ تم نے علی نواز سے میرا تقابل کرتے ہوئے میری بابت اپنے دلی جذبات کا اظہار کر کے مجھے دل کی بات کہہ دینے کا حوصلہ دیا ہے۔ اب میں برملا یہ اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ تم میرے خوابوں میں بسنے والی وہ دوشیزہ ہو جس کی خوشنودی کی خاطر میں اپنی جان تک قربان کر دینے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔"

"نہیں نہیں، مجھے جان نہیں چاہیے۔"

"تم میرا مذاق اُڑانے کی کوشش کر رہی ہو۔" میں نے بُرا مناتے ہوئے کہا۔ "کاش تم میرے دل میں جھانک کر دیکھ سکتیں۔ کاش! تم اندازہ کر سکتیں کہ میں تم سے کس قدر بے لوث محبت کرتا ہوں۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں الفت اور اسی خاطر میں علی نواز کے پاس گیا تھا۔ اتنا صدمہ کر بھی گیا مگر افسوس کہ میں تمہارے کام نہ آ سکا۔ علی نواز کے نہ آنے کا جتنا دکھ تمہیں ہوا ہے اس سے کہیں زیادہ دکھ مجھے ہے کیوں کہ میں تو اسے تمہارے حضور پیش کر کے سرخروئی حاصل کرنا چاہتا تھا مگر میری بدقسمتی کہ اپنے تمام تر خلوصِ نیت کے باوجود میں سرخرو نہ ہو سکا اور میری محبت تمہارے درد کا مداوا نہ کر سکی۔"

"ہاں ہاں بولیے۔ میں سُن رہی ہوں۔" الفت نے میرے خاموش ہو جانے پر کہا۔

"اگر علی نواز آ گیا ہوتا تو میں ہرگز اپنی زبان نہ کھولتا اور تم سے اپنی محبت کو فقط اپنے سینے ہی میں بسائے رہتا۔ مگر علی نواز کی وعدہ فراموشی پر تمہاری تڑپ نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اپنا دل کھول کر تمہارے سامنے رکھ دوں اور تمہیں بتا دوں کہ اگر تم کسی جفا جو سے محبت کرتی ہو تو کوئی وفا پیشہ تم سے بھی سچی محبت کرتا ہے۔ گو میں جانتا ہوں کہ علی نواز کا اور میرا کوئی مقابلہ نہیں۔ وہ خوش قسمت ہے کہ تمہارے دل میں بستا ہے۔ میرا خیال تو شاید کبھی تمہارے دل کے نزدیک بھٹک بھی نہ سکے گا۔ مگر اس تلخ حقیقت کا ادراک رکھنے کے باوجود میں تم سے محبت کرتا ہوں کیوں کہ محبت کے بارے میں میرا مکتبِ فکر یہ ہے کہ محبت ہمیشہ فتحیاب ہو کر ہی تو سربلند نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی اسے سرخرو ہونے کے لیے زہرِ آب بھی پینا پڑتا ہے۔ مجھ میں زہرِ آب پینے کا حوصلہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں کبھی بھی تمہارے دل میں جگہ نہ پا سکوں گا۔ مگر یہ سچ ہے الفت کہ میری بقیہ زندگی اس محبت کے سہارے بسر ہو گی جو میں تمہاری بابت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ میں علی نواز سے تمہاری محبت کے بیچ حائل ہونے کا رتی بھر بھی ارادہ نہیں رکھتا۔ مگر تم سے محبت کیے بنا بھی نہیں رہ سکتا۔" جذبات کی شدت سے میری آواز لحظہ بہ لحظہ بوجھل تر ہوتی چلی گئی۔

الفت کچھ دیر سر جھکائے خاموش رہی پھر اس نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ "آئیے ذرا کچھ دیر چہل قدمی کرتے ہیں۔"

میں چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔

چند قدم خاموشی سے چلنے کے بعد وہ بولی۔ "میری مجبوری یہ ہے مونس صاحب کہ وہ بے وفا اگر مجھے بھلا کر مجھ سے دامن چھڑانا بھی چاہے گا تو میں اسے بھلا نہ سکوں گی۔ عورت اور مرد میں شاید یہی بڑا فرق ہے کہ عورت ہر دم دیوانی ہوتی ہے مرد بے وفا اور ہرجائی... بہرحال اگر وہ مجھ سے دامن چھڑانا چاہتا ہے تو میں بھی اس کی یادوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں دفن کر کے اسے بھول جانے کی کوشش کروں گی۔" اس نے توقف کیا پھر بولی۔ "میرے گمان میں بھی نہ تھا مونس صاحب کہ یوں ہو گا۔ مجھے افسوس ہے کہ اس بے وفا کے آنے کی خبر سُن کر میں خوشی سے ایسی بے اوسان ہوئی کہ شوخی اور ترنگ میں نہ جانے کیا کیا بکتی اور آپ سے مذاق کرنے کی کوشش کرتی رہی... مجھے معاف کر دیجیے۔ اب مجھے اپنے اس طرح کے رویے پر جو میں نے آپ کے ساتھ روا رکھا، واقعی شرمندگی ہو رہی ہے۔"

"شرمندہ تو میں ہو رہا ہوں اس خیال سے کہ تمہارے دکھ کا مداوا کرنے کے بجائے اپنا رونا لے بیٹھا... شرمندگی کا احساس اتنا گہرا ہے کہ آج کے بعد میں تمہیں اپنی صورت دکھانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میں نے اپنے دل کی بات کہہ تو دی ہے مگر اب مجھے خجالت ہو رہی ہے۔ میں جا رہا ہوں اور آئندہ تمہیں اپنا خود غرض چہرہ نہیں دکھاؤں گا۔"

"ٹھہریے! پہلے آپ میری بات سُن لیں۔" الفت کی آواز نے میرے قدم پکڑ لیے۔ "میرا وجدان کہتا ہے کہ آپ انتظار کر سکتے ہیں... کر سکتے ہیں نا؟"

"انتظار! کس بات کا؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟ کس کا انتظار کروانا چاہتی ہو تم مجھ سے؟"

"مجھے اسے بھلانے کے لیے کچھ وقت درکار ہو گا۔ میرے دل میں اس کے لیے جو محبت روشن تھی وہ ماند پڑنا شروع ہو گئی ہے اور اسے ختم ہو بھی جانا چاہیے کیوں کہ اس نے عہد شکنی کی ہے۔ مجھے دھوکا دیا ہے۔ آزار پہنچایا ہے۔ میں اسے بھلا دینا چاہتی ہوں۔ اب مجھے اس سے نفرت ہو چلی ہے۔ ہاں میں اس سے نفرت کرنے لگی ہوں کیونکہ اس نے ایک عہد کو پامال کر ڈالا۔ ایک محبت بھرے دل کو اپنے قدموں تلے بے دردی سے روند ڈالا۔" وہ تھمی پھر بولی۔ "جب میں آپ کا اس سے مقابلہ کرتی ہوں تو آپ مجھے بہت ارفع اور محترم محسوس ہوتے ہیں۔ اس نے مجھے آزار پہنچایا جب کہ آپ نے میرے زخموں پر مرہم لگایا۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس بھی ہو رہا ہے کہ کیوں اس کے وعدے کا اعتبار کر بیٹھی، کیوں اس سے چاہت کی بھیک مانگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ تو ضرور کر لیا تھا مگر اسے مجھ سے محبت نہ تھی! اس نے جھوٹے منہ بھی کبھی یہ نہ کہا کہ وہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔ آپ میں اور اس میں بڑا فرق یہی ہے کہ اسے مجھ سے نہ تو محبت تھی نہ اس نے اس کا اظہار کیا جب کہ آپ نے مجھ سے محبت کا اظہار کر دیا ہے... میں آپ کی محبت کا جواب محبت ہی سے دوں گی مگر اس کے لیے مجھے کچھ وقت چاہیے۔" اس کی آواز جو لحظہ بہ لحظہ بوجھل اور دھیمی ہوتی چلی گئی تھی، یک بیک آنسوؤں اور دبی دبی سسکیوں میں ڈوب گئی۔

"پلیز رحمت! مجھے تکلیف ہوتی ہے۔"

وہ کچھ دیر سسکنے کے بعد چپ ہو گئی۔ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔
کاش، میں اس عہد شکن کی یاد کو فوری اس کے دل سے کھرچ سکتا۔ یا پھر اسے اس کے سامنے لا کھڑا کر سکتا!

کچھ دیر بعد اس نے لرزتی ہوئی دھیمی آواز میں کہا: "یونس صاحب! آپ میرے بارے میں بدگمان نہ ہو جائیے گا۔ یہ نہ سوچیے گا کہ میں غیر مستقل مزاج لڑکی ہوں یا موقع دیکھ کر پینترا بدل لیتی ہوں۔ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ بھی نہ خیال کیجیے گا کہ میں علی نواز کو آسانی سے بھلا سکوں گی۔ بے شک اس کی عہد شکنی نے مجھے صدمہ پہنچایا ہے اور مجھے اس سے نفرت ہو رہی ہے لیکن اس کے لیے میرے دل میں جو محبت تھی اسے فوری اور آسانی سے مٹانا میرے لیے ممکن نہیں۔ ممکن ہو بھی کیونکر سکتا ہے! پورے ایک برس میں اپنے دل میں اس کے نام کی شمع روشن کیے اس کی راہ تکتی رہی اور قسمیہ کہتی ہوں کہ اس ایک برس کے دوران ایک لمحے کے لیے بھی میں نے اپنے دل میں کوئی بے ایمانی نہیں آنے دی۔ مگر وہ بے ایمانی کر گیا۔ اس نے میرے محبت بھرے دل کو روند ڈالا۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے کہ وہ محبت اور بھروسا کیے جانے کے لائق تھا ہی نہیں۔ بہرحال اب..." اس نے پل بھر کو توقف کیا پھر بھیگی ہوئی آواز اور دلگیر لہجے میں بولی: "اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ ہو سکتا ہے آنے والا وقت مجھ پر یہ عقدہ کھولے کہ اس سے میری محبت فقط خود غرضی تھی۔ دادی جان کے جبر اور سختی سے نجات حاصل کرنے کی ایک احمقانہ کوشش تھی۔ ہو سکتا ہے مستقبل مجھے یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جائے کہ مجھے علی نواز سے نہیں بلکہ کسی ہمدرد اور مہربان مرد سے محبت کرنی چاہیے تھی۔ آپ کو اس وقت کا انتظار کرنا ہو گا جب میں پورے خلوص نیت سے آپ کی محبت کا جواب دے سکوں۔ لیکن آپ کو مجھ سے وعدہ کرنا ہو گا کہ وقت کے ساتھ مجھ سے آپ کی محبت گھٹے گی نہیں۔ یونس صاحب! میں محبت اور توجہ کو ترسی ہوئی لڑکی ہوں۔ اگر آپ نے مجھے یہ یقین دلا دیا کہ آپ ہمیشہ اسی طرح مجھ سے محبت کرتے رہیں گے تو میں اقرار کرتی ہوں کہ پورے خلوص کے ساتھ آپ سے محبت کروں گی اور تاعمر آپ کی شکر گزار رہنے کی کوشش کروں گی۔"

"اوہ! الفت! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ ساری زندگی تم سے اسی طرح پیار کرتا رہوں گا۔" میں نے جذبات سے معمور لہجے میں کہا۔

"شکریہ۔ بہت شکریہ... بس اب اس موضوع پر کم از کم اس وقت تک مزید بات نہ کریں گے جب تک میں اس کے خیال کو اپنے دل سے مکمل طور پر محو نہیں کر دیتی۔ میں پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ آپ کا ہاتھ تھاموں گی۔" وہ ہنسی پھر بولی: "بس اب اچھی اچھی باتیں کیجیے کیونکہ اب آپ بھی خوش ہیں اور میں بھی خوش ہوں۔"

گو اس کا لہجہ بوجھل تھا کہ وہ ملول تھی۔
محبت میں اس کی ناکامی کے ذکر میں، میں اس کا شریک ضرور تھا مگر دل ہی دل میں مجھے ایک ناقابل بیان سرخوشی کا احساس ہو رہا تھا۔
پھر کچھ دیر ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور ہنستے ہنساتے رہے۔ وہ جب ہنستی تو مجھے اس کی ہنسی کراہتی ہوئی محسوس ہوتی۔
اس رات ہم نے سر جوڑ کر مستقبل کے سہانے سپنے اپنی آنکھوں میں سجائے۔

میں نے اس سے کہا: "الفت! میں کوئی امیر آدمی نہیں ہوں۔ محدود وسائل ہیں میرے لیکن میرا وعدہ ہے کہ تمھیں خوش رکھنے کے لیے میں اپنی جان بھی تم پر نچھاور کر دینے سے دریغ نہیں کروں گا۔"

"وسائل کی تو مجھے چنداں ضرورت نہیں۔ ہم مکان کا ایک حصہ کرائے پر اٹھا کر بڑی فراغت کی زندگی بسر کر سکیں گے۔ آخر وہ مکان میرا ہی ہے۔ دادی جان بے چاری تو چراغ سحری ہیں۔"

"بھئی مجھے تمھاری دادی جان کے اثاثے وسائل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو اپنے بازوؤں کی قوت سے تمھیں خوش رکھنا چاہتا ہوں۔ ہم ایک چھوٹا سا گھر بنائیں گے اور اسے جنت کی طرح سجائیں گے۔"

"دیکھیے جناب! ایک بات واضح کر دوں میں آپ پر کہ دادی جان کو چھوڑ کر میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ آپ کو گھر داماد بن کر رہنا ہو گا۔"

"چلو تمھاری خاطر یہ بھی منظور، مگر یہ تو بتاؤ کہ دادی جان کے حضور میری پہلی حاضری کب ہو گی؟"

"بھئی پہلے تو راہ ہموار کرنی ہو گی پھر حاضری کی نوبت آئے گی۔"

"اور راہ کیونکر، کب اور کون ہموار کرے گا؟"

"یہ سوچنے والی بات ہے۔"

وہ کچھ دیر کو سوچ میں پڑ گئی پھر بولی: "دادی جان تک آپ کی رسائی کی میرے ذہن میں تو صرف ایک ہی ترکیب آئی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"آپ ہماری انیکسی کے نئے کرایہ دار بن جائیں۔ پہلے دادی جان پر اپنی شرافت کا سکہ بٹھائیں پھر سکہ بٹھانے کے بعد پرپوز کر ڈالیں۔"

"بڑا لمبا اور صبر آزما راستہ ہو گا یہ تو۔"

"نہیں ایسا کوئی زیادہ لمبا اور صبر آزما بھی نہیں۔ علی نواز کے جانے کے بعد انیکسی میں ایک تنہا خاتون کرایہ دار آ بسی تھیں جو تقریباً دو ماہ قبل انیکسی چھوڑ کر جا چکی ہیں۔ انیکسی خالی ہے۔ آپ کو فوری قبضہ مل جائے گا۔ دادی جان جو نوجوان مرد کرایہ دار سے انتہائی کترایا کرتی تھیں علی نواز کو کرایہ دار رکھنے کے بعد ان کی نوجوان مرد

کرایہ داروں کے بارے میں ماننے ایسی بدلی کہ اب وہ دن رات کسی نوجوان مر دکرایہ دار کے نزول کی دُعائیں مانگا کرتی ہیں چند دن پہلے کی بات ہے میں نے ان سے پوچھا کیا بات ہے دادی جان آپ کسی نوجوان مرد کرایہ دار کے آنے کی دُعائیں مانگنے لگی ہیں تو کہنے لگیں ہو سکتا ہے اسی بہانے تیرے لیے کوئی اچھا بر مل جائے۔ اب تیری شادی بھی تو کرنی ہے۔ کب تک میں تجھے اپنے گھٹنے سے لگائے بٹھائے رکھوں گی۔"

"اگر یہ بات ہے تو میں کل ہی کرایہ دار انکیسی کی صورت تمہاری دادی کے حضور حاضر ہوتا ہوں پھر کرایہ داری سے تمہاری اُمیدواری تک ہم دادی جان کو لے کر ہر روز ساحل پر چہل قدمی کو نکلا کریں گے۔ لوگ ہمیں دیکھا کریں گے اور ہم ایک دوسرے کو...

کیوں ٹھیک ہے نا؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔

"کیا سوچنے لگیں؟" میں نے پوچھا۔

"سوچ رہی ہوں کیا یہ وہی شخص ہے جو عورت سے خائف رہا کرتا تھا!"

"ہاں یہ وہی شخص ہے اور اسے اتنا حوصلہ دینے والی بھی ایک لڑکی ہی ہے۔"

ہم تا دیر مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ اس نے کہا۔ "بہت دیر ہو چکی ہے میرا خیال ہے اب مجھے گھر جانا چاہیے۔"

"جی تو نہیں چاہتا مگر کہ تم جاؤ۔" میں نے مجبورانہ انداز میں کہا۔

"اچھا!" وہ دھیرے سے ہنس دی۔

"تم اندازہ نہیں کر سکتیں الفت کہ میں آج کتنا خوش ہوں۔"

"واقعی؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ قسمت کی دیوی مجھ پر یوں مہربان ہو جائے گی میرے خواب تعبیر پا لیں گے یقین کرو الفت کہ میں ایک عمر سے تمہاری تلاش میں سرگرداں تھا اور آج تمہیں پا کر میرے دل کی حالت عجیب ہوئی جا رہی ہے۔"

"بس جناب! زیادہ رومینٹک نہ ہوں۔ انھیں اور مجھے گھر تک چھوڑتے ہوئے اپنے گھر کا رُخ کریں۔ میٹھی نیند سوئیں اچھے اچھے خواب دیکھیں اور کل انیکسی کرائے پر لینے کی درخواست کے ساتھ دادی جان کا سامنا کریں۔"

"ارے نیند کس کمبخت کو آئے گی۔ آج تو رتجگا ہوگا۔ کاش! میں تمہیں اپنا سینہ کھول کر دکھا سکتا کہ میرا دل خوشی سے کیسا بے اوسان ہوئے جا رہا ہے۔"

ارزو اور دُعا ایک ۹۵ سالہ بزرگ نے اپنی سالگرہ منائی تو ایک صاحب نے انھیں مبارک باد دیتے ہوئے اپنی تقریر میں بڑھاپے سے متعلق بہت سے لطیفے بھی شامل کر دیے۔

جوابی تقریر میں بزرگ نے کہا: "میری آرزو بھی ہے اور دُعا بھی کہ اتنی عمر تک میں ضرور جیوں جتنی عمر کے ان صاحب کے سُنائے ہوئے لطیفے ہیں۔"

"بہت ہو چکی جناب! اب چلیں۔"

میں با دلِ ناخواستہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے نیم تاریک ساحل سے جگمگاتی روشنیوں کی سمت پیش قدمی کر رہے تھے کہ دفعتاً ایک شخص مخالف سمت سے ہماری جانب آتا دکھائی دیا۔ الفت نے میرا ہاتھ چھوڑ کر بازو تھام لیا اور سمٹ کر میرے بہت نزدیک ہو گئی۔ نیم تاریکی میں دور سے آتے ہوئے شخص کے نقش و نگار واضح نہ تھے۔ وہ ہمارے نزدیک پہنچا تو خوشبو کے ایک تیز جھونکے نے میری مشامِ جاں کو معطر کر دیا۔ ہمارے نزدیک سے گزرتے ہوئے وہ دفعتاً ٹھہر گیا اور دو قدم اٹھا کر ہمارے بالکل نزدیک آ کھڑا ہوا۔ نیم تاریکی میں ہم نے اسے اور اس نے ہمیں بغور دیکھنے کی کوشش کی لحظہ بھر کو تو مجھے یوں لگا جیسے میرا دل دھڑکنا بھول گیا ہو۔

وہ علی نواز تھا!

"آپ آ گئے۔" الفت نے یک بیک میرا بازو چھوڑ کر اس کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

"معاف کرنا بہت دیر ہو گئی۔" علی نواز کی آواز مجھے دور، بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

پھر میں نے انھیں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے دیکھا۔ الفت پر ایسی شادی مرگ طاری ہوئی کہ وہ اس کے سینے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"رونے کی بھلا کیا ضرورت۔ بس اب۔ میں آ تو گیا ہوں۔" میں نے علی نواز کو کہتے سنا۔

جذبات کا ریلا گزر گیا تو الفت نے علی نواز کی بانہوں کے حصار سے نکل کر اس کا بازو تھاما اور پھر میری جانب متوجہ ہوئی۔

"آپ تو علی سے مل چکے تھے کیا پہچانا نہیں؟" الفت کی آواز چہکتے ہوئے سکے کی مانند میری سماعت میں اترتی چلی گئی۔

"پہچان لیا ہے۔" میں نے آنسو پیتے ہوئے کہا اور اپنا دایاں ہاتھ مصافحے کے لیے علی نواز کی جانب بڑھا دیا۔

"مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے" الفت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر بولی "ہمارا یہ ملن مونس صاحب کا مرہونِ منت ہے۔"

"بے شک" علی نواز نے تائید کی پھر بولا "مونس صاحب! میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔"

"اچھا یہ بتائیں کل آپ کہاں تھے؟ جہاز سے تو آپ کل کے اُترے ہوئے ہیں" الفت نے پوچھا۔

"ماں کی قدم بوسی کو سکھر چلا گیا تھا۔ کل گیا آج لوٹ آیا۔"

"اب تو نہیں جائیں گے؟"

"نہیں بھئی جانا تو پڑے گا کیونکہ کل صبح مجھے ڈیوٹی پر حاضر ہونا ہے البتہ کل شام میں تمہاری دادی جان کی قدم بوسی کو آ رہا ہوں تمہاری والدہ کے جنہیں میں خاص اسی مقصد سے اپنے ساتھ لایا ہوں۔"

"وہ ہیں کہاں؟"

"اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرایا ہے میں نے انہیں... اور ہاں دیکھو ہفتہ عشرہ ہی رکے گا میرا جہاز کیونکہ میں کمپنی سے مزید ایک برس کا معاہدہ کرنے جا رہا ہوں۔ بس ہفتے بھر کے اندر تو شادی کرنی ہے مجھے۔"

میرا دل گھٹ گھٹ کر رونے لگا۔

"مونس صاحب! شادی میں بھی آپ کو اسی طرح پیش پیش رہنا ہوگا۔" علی نواز نے مجھ سے کہا۔

"کیوں نہیں یہ تو اب میرے لیے بھائی سمان ہو چکے ہیں۔" الفت چہکی۔

میں دم بخود رہ گیا۔

محبت کے معاملے میں عورت کا ایسا بے دین ہونا میرے گمان میں بھی نہ تھا۔ علی نواز کے کہنے سے قبل تو وہ مجھ سے وعدے وعید کر چکی تھی۔

"کیا آپ ہمیں اجازت دیں گے؟" علی نواز نے کہا۔

"ضرور" میں نے کہا۔

اس کے سوا میں اور کہہ بھی کیا سکتا تھا!

وہ مجھے بیچ راہ میں چھوڑ کر ایک دوسرے کا بازو تھامے ساحل کے تاریک حصے کی سمت بڑھ گئے اور مجھے یوں لگا جیسے سمندر میری آنکھوں میں سمٹ آیا ہے۔

میں سر جھکائے مضمحل اور ناشاد سا سمندر کنارے ایستادہ فصیل کی جانب بڑھا اور سمندر کا رخ کر کے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دُور سمندر کے پانیوں سے آنے والی جہازوں کی رنگ برنگی روشنیوں کو حسرت سے تکنے لگا۔

تھوڑی دیر ہی گزری ہوگی کہ مجھے اپنے عقب میں الفت کی آواز سنائی دی "میں بھی کتنی بے وقوف ہوں مونس صاحب آپ کا اتا پتا تو لیا ہی نہیں۔"

میں نے بڑی سرعت سے اپنے آنسو پونچھے اور اس کی جانب پلٹتے ہوئے بظاہر ہنس کر کہا "کیا کرو گی اتا پتا پوچھ کر؟"

"بھئی آپ کو شادی کی دعوت جو بھیجنی ہوگی ہمیں۔" علی نواز بولا۔

میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

علی نواز نے جیب میں سے ایک جیبی ڈائری اور قلم نکالا اور میرا پتا لکھنے کو مستعد نظر آنے لگا۔

"جی بتائیے۔" اس نے کہا اور مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اپنا پتا نوٹ کروانا پڑا۔

جب وہ ایک بار پھر مخالف سمت میں پلٹ گئے اور میری نگاہوں کی زد سے نکل گئے تو میں نے شکست خوردہ قدموں سے بس اسٹاپ کا رُخ کیا۔

★

پورے چاند کی روشنی میں شروع ہونے والی اس داستان کا انجام ایسا کربناک تھا۔ چاندنی راتوں نے مجھے ڈس لیا تھا۔

ایسی اضطراب انگیز رات میری زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہ آئی تھی۔ اس رات میں تنہا اور طویل شہر کی سڑکوں پر بھٹکتا پھرتا رہا۔ مجھے دنیا اندھیر لگ رہی تھی۔ میرے دل کا اضطراب مجھے آسمان کے ستارے توڑ لینے پر اکسا رہا تھا۔ مجھ پر اضطراب اور جنون کی ایک کربناک کیفیت طاری تھی۔

رات کے پچھلے پہر جب میں اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو خود کو نیم جاں محسوس کر رہا تھا۔ بے دم سا بستر پر گرا اور ایسا پڑا کہ کئی روز بخار میں مبتلا رہ کر دو ہوش سے بے خبر رہا۔ مالک مکان حوا بائی نہ ہوتی تو شاید کوئی میرے منہ میں پانی کے دو قطرے ٹپکانے والا بھی نہ ہوتا۔ حوا بائی نے گھر پر ڈاکٹر بلا کر مجھے دکھایا۔ میری تیمار داری کی اور دوا دارو کا خیال رکھا۔ نہ صرف یہ بلکہ حوا بائی نے میری علالت کی اطلاع میرے دفتر میں بھی دی۔

کئی روز تک بے سُدھ پڑے رہنے کے بعد جب قدرے ہوش آیا تو مجھے حوا بائی نے بتایا کہ کوئی علی نواز نامی میرے دوست میری علالت کے تیسرے دن مجھے اپنی شادی میں شرکت کا بلاوا دینے آئے تھے مگر میری علالت پر افسوس کرتے واپس چلے گئے تھے۔ حوا بائی کی زبانی یہ بات سُن کر میری آنکھیں بھیگ گئیں اور مجھے اپنی آنکھوں میں اُمڈ آنے والی آبی لہر کو حوا بائی کی نگاہوں سے چھپا لینے کی خاطر آنکھیں موند لینا پڑیں۔

کیونکر بتاتا میں حوا بائی کو کہ علی نواز میرا دوست نہیں میری

خوشیوں کا قاتل، میرا رقیب، بدِ دو سیاہ، میری علالت کا ذمہ دار تھا۔

تیز بخار نے ٹائیفائیڈ کی صورت لے لی۔ حنا باجی نہ ہوتیں تو کوئی مجھے پوچھنے والا نہ تھا۔ میری اس علالت کے دوران انھوں نے میرا ماں کی طرح خیال رکھا۔

ابھی اس طویل علالت کے دوران ایک روز مجھے بیرون ملک سے ایک خط موصول ہوا۔ جب حنا باجی نے ڈاکیے سے خط وصول کرنے کے بعد خط مجھے دیتے ہوئے کہا: "تمھارا خط آیا ہے۔"

میں نے کہا: "دفتر سے آیا ہوگا۔"

"نہیں، باہر سے آیا ہے۔"

'باہر کون ہے میرا، جو مجھے خط لکھے گا؟' میں نے حنا باجی سے لفافہ لیتے ہوئے سوچا اور کہنیوں کے سہارے بستر پر اٹھ بیٹھا۔ ایسی کمزوری ہو گئی تھی کہ اپنے سہارے اٹھ بیٹھنا بھی مجھے محال معلوم ہونے لگا تھا۔

لفافے پر صرف میرا نام اور پتا تھا۔ مکتوب نگار نے لفافے پر تو کہیں بھی اپنا نام اور پتا نہ لکھا تھا۔ لفافہ چاک کر کے میں نے خط نکالا اور مندرجات پر نظریں دوڑانا شروع کیں۔

لکھا تھا:

مونس صاحب!

آداب!

امید ہے آپ کی طبیعت بہتر ہوگی۔ میں یہ خط آپ کو دبئی سے لکھ رہی ہوں۔ یہ پہلی پورٹ ہے جہاں علی کا جہاز رکا ہے۔ دو تین روز یہاں رک کر آگے بڑھ جائے گا۔ علی اس وقت شہر میں اپنے کسی شناسا سے ملنے گئے ہوئے ہیں۔ کہہ رہے تھے شام کو مجھے گھمانے پھرانے کے لیے لے جائیں گے۔ میں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ شام کو جب باہر نکلیں گے تو میں آپ کو خط پوسٹ کرنے کی کوشش کروں گی۔

میری انتہائی خواہش تھی کہ آپ میری اور علی کی شادی میں شریک ہوتے مگر افسوس کہ آپ علیل ہو گئے۔ ہماری شادی ایسی عجلت میں ہوئی کہ اب سوچتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیونکر ہوا۔ ایک روز علی اپنی والدہ کے ہمراہ دادی جان سے ملنے آئے اور دو روز بعد ہم ایک اٹوٹ بندھن میں بندھ گئے۔ پھر ایک دن میں علی نے میرا پاسپورٹ بنوایا۔ جلدی جلدی سفری دستاویزات تیار کروائیں اور مجھے ساتھ لے کر سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ علی کے ساتھ میں بہت خوش ہوں۔ زندگی ایک حسین سپنا محسوس ہوتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی دادی جان بُری طرح یاد آنے لگتی ہیں۔ انھیں رابعہ کے سہارے چھوڑ آئی ہوں۔ آپ کو کبھی فرصت ملے تو علی کے دوست بن کر ان سے ملنے چلے جایا کریں۔

میرے اور علی کے ملن میں آپ نے جو کردار ادا کیا اس کی قدر ہمیشہ میرے دل میں رہے گی۔ علی اب برملا اعتراف کرتے ہیں کہ اگر انھیں آپ کے توسط سے میری جانب سے پیغام نہ ملا ہوتا کہ میں ان کی منتظر ہوں تو وہ اس خیال سے مجھ سے ملنے میں تردد کرتے کہ ہو سکتا ہے میں ان کے خیال کو اپنے دل سے محو کر کے کسی اور جانب راغب ہو چکی ہوں۔

میں آپ کی تہِ دل سے شکر گزار ہوں مگر کچھ شرمسار بھی کہ میں نے آپ کو بھی دھوکا دیا اور خود اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے کی کوشش کی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں علی کو ہرگز تو کبھی بھول سکتی تھی نہ ان سے نفرت کر سکتی تھی۔ وہ تو میرے لیے جانِ جہاں ہیں۔ مجھے معاف کر دیں مونس صاحب کہ رنج و صدمے کی شدت میں، میں آپ سے ایسی بات کہہ بیٹھی جو اب مجھے انتہائی اعتماد شکن ہوتی ہے۔ بے شک مجھے آپ سے محبت ہے مگر ویسی محبت نہیں جیسی علی سے ہے بلکہ آپ کے لیے میں ہمدردانہ جذبات رکھتی ہوں۔ مجھے میری اس خطا پر معاف کر دیجیے گا۔ مجھے اندازہ ہے کہ آپ کو دکھ پہنچا ہوگا۔ میں نے آپ کے ساتھ کچھ خود غرضانہ رویہ روا رکھا۔ لیکن مجھے یہ یقین بھی ہے کہ جو لوگ محبت کرنا جانتے ہیں وہ زخم کھانے کی جرأت بھی رکھتے ہیں اور معاف کر دینے کا حوصلہ بھی اور آپ چونکہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اس لیے یقیناً مجھے معاف کر دیں گے۔

آپ نے جس شدت سے مجھ سے محبت کا اظہار کیا تھا وہ ہمیشہ میرے ذہن کے ایوانوں میں مہکتی رہے گی۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گی کہ آپ نے میرے گھائل دل پر اپنی پُرخلوص محبت کے پھاہے دھر کر مجھے ڈوبنے سے بچانے کی بے لوث کوشش کی تھی۔ مجھے اس وقت ذہنی سہارا دیا جب میں ریزہ ریزہ بکھرنے کو تھی۔ اگر آپ میری سہو کو درگزر کر دیں تو میں تازندگی آپ کی احسان مند رہوں گی۔ اور وعدہ کرتی ہوں کہ تازندگی آپ کے خیال کو اپنے دل میں

بسائے رہوں گی اور کبھی آپ کی یاد سے غداری کی مرتکب نہ ہوں گی کیوں کہ میں نے جان لیا ہے کہ دل میں بسی محبتوں سے غداری کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ دیکھیے ناجب علی وعدے کے مطابق مجھ سے ملنے نہ آئے تو میں نے خود کو دھوکا دینے کی کوشش کی کہ میں ان سے نفرت کرنے لگی ہوں۔ مگر جب وہ میرے سامنے آئے تو میرے دل نے بے اختیار ان کے لیے اپنا در وا کر دیا اور تب مجھے معلوم ہوا کہ میرا دل تو اول و آخر علی کا تھا اور کسی قیمت پر بھی کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا تھا!

مونس صاحب! اس سفر سے واپسی پر میں علی کے ساتھ آپ سے ملنے آؤں گی۔ ہم پھر ملیں گے، ملیں گے نا! اور ابھی اس ملاقات میں نہ میں آپ سے معافی مانگوں گی نہ آپ کوئی گلہ شکوہ کریں گے کیوں کہ یہ خط آپ کو ارسال کرنے کے بعد میں اپنی دانست میں یہ باور کر لوں گی کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے۔

ایک دوستانہ مشورہ آپ کو دینا چاہتی ہوں... کوئی اچھی سی لڑکی تلاش کریں جو آپ کی بے لوث محبت کی واقعی اہل ہو اور گھر بسا لیں۔ امید ہے کہ آپ میری برادری یعنی عورت ذات سے خائف ہونا ترک کر چکے ہوں گے کیوں کہ بارش کا پہلا چھینٹا تو بہرحال پڑ ہی چکا ہے آپ کے دل پر!

آخر میں پھر وہی التجا کہ مجھے معاف کر دیجیے گا اور اپنے دل سے میری محبت کو محو نہ ہونے دیجیے گا! آپ ہمیشہ میرے دل میں اور میری دعاؤں میں رہیں گے۔

اجازت
الفت!

میں نے اس خط کو ایک بار نہیں دو بار نہیں بار بار پڑھا میری آنکھوں میں آنسو امڈتے رہے۔ بالآخر الفت کا خط تھامے تھامے میرے ہاتھ کپکپانے لگے اس کا خط میرے ہاتھوں سے گر پڑا اور میں نے اپنا چہرہ اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے چھپا لیا۔

طویل بیماری بلکہ اسے دکھ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، جھیلنے کے بعد جب میں بستر سے اٹھا تو حوا بائی نے میری صحت یابی پر اپنی مسرت کا اظہار میرے کمرے کی صفائی ستھرائی اور از سر نو تزئین و آرائش کروا کے کیا۔

"مونس:" حوا بائی نے کہا: تمہاری بیماری کے دوران تمہارے کمرے میں کھڑکی کے جالے میری توجہ کا مرکز بنے رہے۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ تمہارے بستر سے اٹھتے ہی سارے جالے صاف کروا دوں گی۔ دیکھو میں نے سارے جالے صاف کروا دیے ہیں۔ کتنا صاف ستھرا ہو گیا ہے تمہارا کمرا۔ ابھی میری مانو تو تم اب شادی کر ڈالو۔ اکیلے آدمی کی کوئی زندگی نہیں۔ کوئی دکھ سکھ کا ساتھی ضرور ہونا چاہیے۔"

میں نے حوا بائی کی جانب دیکھا۔ باوجودیکہ وہ درمیانی عمر کی ایک تندرست و توانا عورت تھی نہ جانے کیوں وہ مجھے بوڑھی نظر آئی۔ اس کا چہرہ مجھے جھریوں بھرا اور آنکھیں زندگی کی رمق سے محروم محسوس ہوئیں۔ یک بیک مجھے اپنا نو آراستہ کمرا بھی صدیوں پرانا محسوس ہونے لگا۔ کمرے کے در و دیوار مجھے بے رونق اور بے رنگ و روغن دکھائی دینے لگے۔ کمرے کی ہر شے مجھے دھندلائی ہوئی نظر آنے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے مکڑیوں نے میرے سارے کمرے میں جالے تان دیے ہوں اور ان جالوں نے میری سانس روک لی ہو۔ میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو نہ جانے کیوں حوا بائی کے مکان کے روبرو ایستادہ وہ بلند و بالا مکان جو کل تک مجھے بہت خوب صورت لگا کرتا تھا شکستہ و خمیدہ دکھائی دیا۔ شاید سورج جلدی چھپ گیا تھا اور ہر شے تاریکی کی زد میں آ چکی تھی یا پھر میری دل گرفتگی نے مجھے پندرہ برس آگے لے جا کر وقت سے پہلے بوڑھا، مضمحل، دل شکستہ اور ایک مرتبہ پھر اسی قدر تنہا کر دیا تھا جتنا میں الفت سے ملنے سے پہلے ہوا کرتا تھا۔

میری چاندنی راتیں گھور تاریکی میں ڈوب چکی ہیں۔ میں بہت تنہا، دل گرفتہ اور اداس ہوں۔ میرے ارد گرد تاریکی ہی تاریکی ہے۔ ہر شے دھندلا سی گئی ہے۔ میرے دل پر جالے سے تن گئے ہیں مگر... مجھے الفت سے کوئی گلہ کوئی شکایت نہیں۔ میری دعا ہے کہ وہ جہاں بھی رہے خوش رہے۔ سدا ہنستی مسکراتی، شاد و آباد رہے اس کے دل پر میرے دل کی طرح کبھی کوئی جالا نہ تن پائے! اسے کبھی کوئی دکھ نہ ملے اس کا چہرہ ہمیشہ روشن اور تاباں رہے۔ خدا اس کو اس کار خیر کی جزا دے کہ اس نے تنہائی کا زہر اب پیتے ہوئے مجھ سے تنہا شخص کی بے آب و گیاہ زندگی میں اپنے دو میٹھے بولوں، اپنی دل کش مسکراہٹوں کا امرت گھول دینے کی نیکی کی۔

خوشی کا تو ایک لمحہ بھی صدیوں پر بھاری ہوا کرتا ہے۔

سورج کی ایک کرن مٹھی میں دبا کر تو گھنگھور اندھیاروں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

تو پھر الفت کی عطا کردہ خوشی کے سہارے میں اپنی باقی زندگی کیوں نہیں گزار سکتا کیونکہ یہی ایک خوشی تو میرے لیے حاصل زیست ہے!

میری ماں نے میرا نام عیدو رکھا تھا' شاید اس لیے کہ میں عید کے دن پیدا ہوا تھا۔ میرے باپ کو سب شبراتی کہتے تھے' میری ماں نذیرن کہلاتی تھی۔ بس یہ تھا میرا خاندان! اس کے علاوہ میری ایک خالہ بھی تھی جو پیدائشی اندھی تھی۔ اس کے چہرے پر چیچک کے بڑے بڑے نشانات تھے۔ اس کی آنکھوں کے بے نور گڑھے اور پپوٹوں پر پھیلا ہوا کیچڑ مجھے اب بھی یاد آتا ہے تو متلی ہونے لگتی ہے۔ البتہ اس کی بیٹی سے میری بڑی دوستی تھی۔ میں اسے شہزادی کہہ کر پکارتا تھا۔ یہ نام میرا دیا ہوا تھا ورنہ نام تو کچھ اور ہوگا جو اب مجھے بھی یاد نہیں۔

میرا تعلق پیشہ ور بھکاری خاندان سے ہے۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ پنجاب کے ایک بڑے شہر میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ہماری جھونپڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہاں ہمارے ہی پیشے کے کئی اور خاندان بھی آباد تھے۔ چاچا فضلو' جیرا' بدھوا' خیرو اور ایسے کئی دوسرے لوگ مجھے اب تک یاد ہیں۔ ان

خاندان

بھی کئی لوگ بندر اور بھالو نچا کر بھی اپنی روزی پیدا کرتے تھے لیکن میرا باپ انہیں اچھا آدمی نہیں سمجھتا تھا' اس کے نزدیک یہ لوگ بھکاری کہلانے کے مستحق نہیں تھے' غیر ہنرمند تھے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا "کسی کی جیب سے پیسے نکلوانا اتنا آسان نہیں۔ جس کو یہ ہنر نہیں آتا' سالا وہ کیا فقیر بنے گا۔ یہ ہنر بڑی محنت سے اور ریاضت سے آتا ہے۔ جو لوگ یہ محنت نہیں کر سکتے' بندر اور بھالو نہیں نچائیں گے تو اور کیا کریں گے۔ کام چور کہیں کے۔"

میری عمر چھ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اپنی ماں نذیرن بھکارن کی انگلی تھام کر پیسہ کمانے کے لیے بازاروں' گلیوں محلوں کا رخ کرنے لگا تھا۔ کہنے کی تو میری عمر نہیں تھی لیکن سوچتا ضرور تھا کہ اماں گھر میں تو ٹھیک ٹھاک رہتی ہے مگر سڑک پر آکر اندھی بن جاتی ہے۔ دراصل وہ اندھی نہیں تھی' ڈھونگ رچاتی تھی۔ جس طرح میرا باپ لنگڑا نہیں تھا لیکن لنگڑا تھا۔ میں بھی اپنی ماں کے اس جھوٹ میں شریک ہو کر صدا لگاتا تھا۔ "اندھے محتاجوں پر رحم کھاؤ' اندھے محتاجوں کی مدد کرو۔" میں جب اپنے ننھے ننھے ہاتھ کا کشکول بنا کر کسی سفید پوش کا راستہ روکتا تو بہت کم ایسا ہوتا کہ مجھے پیسے کے بجائے جھڑکی ملتی۔ شاید پیسہ اس وقت بھی میرے نصیب میں دوسروں سے زیادہ تھا۔ شام کو جب ہم ماں بیٹے کمائی کر کے گھر لوٹتے تو میری ماں کی قمیص میں لگی بغلی جیب ریزگاری اور چھوٹے نوٹوں سے بھری ہوئی ہوتی تھی۔ دوسری عورتیں رشک اور حسد سے میری ماں سے کہتی تھیں۔ "نذیرن! تیرا منڈا بڑا بھاگوان ہے' جادو ہے اس کے سوال میں جادو۔"

میرے کمائے ہوئے یہ پیسے زیادہ دیر تک میری ماں کے پاس نہ رہنے پاتے تھے۔ روز میں یہ تماشا دیکھتا تھا کہ چراغ جلتے ہی میری ماں کے میل سے بھرے بال میرے باپ کے مضبوط ہاتھوں میں ہوتے۔ میری ماں غلیظ گالیوں سے کچھ دیر اس کی تواضع کرتی' اپنے آپ کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتی اور بالآخر وہ سارے پیسے میرے باپ کے ہاتھ لگ جاتے۔ میرے باپ کو جوئے کی لت اور شراب کی عادت تھی۔ میرے باپ میں ہی کیا' اس بستی کے تقریباً ہر مرد کے یہی لچھن یہی تھے۔ عورتوں کی کمائی پر عیش اڑانا بھی فقیروں کی اس دنیا کا عام دستور تھا۔ رات گئے جب میرا باپ نشے میں دھت کوئی فلمی دھن گنگناتا جگی میں داخل ہوتا تو ایک مرتبہ پھر ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ ماں اس سے بہت لڑتی تھی مگر یہ لڑائی رات بھر کی ریہرسل سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ صبح ہوتے ہی ہم ماں بیٹے اس طرح کاروبار پر روانہ ہو جاتے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اور پھر چراغ جلتے وہی تماشا' وہی ہنگامہ' وہی جوا' وہی نشہ!

پیسہ کماتے' سڑکیں ناپتے کئی برس گزر گئے۔ اب میری عمر دس برس کی ہو گئی تھی۔ اب ماں کی انگلی تھامنا میری مجبوری نہیں تھی۔ ماں کہیں اور باقی میں کہیں اور جاتا۔ شہزادی کی عمر ۸ سال کی تھی۔ مجھے اپنے کام سے فرصت ملتی تو میں یہ وقت شہزادی ہی کے پاس گزارتا۔ میری عادتیں اس بستی کے دوسرے بچوں سے بالکل مختلف تھیں۔ ان بچوں سے میری دوستی بھی نہیں تھی۔ شہزادی مجھ سے چھوٹی تھی لیکن وہ میری گہری دوست تھی۔ وہ اپنی توتلی زبان میں مجھے عیدو کہتی تو مجھے بہت اچھا لگتا۔ ہم دونوں کھیلتے ہوئے ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ دور تک نکل جاتے۔ ریل کی پٹڑی پر لوہے کا ٹکڑا رکھ کر ریل کے آنے کا انتظار کرتے۔ ریل آتی اور جب وہ ٹکڑا پچک کر چپٹا ہو جاتا تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ ہوتا۔

"شہزادی! تو میرے ساتھ کراچی چلے گی؟" میں اس سے پوچھتا۔

"کراچی کیا ہوتا ہے؟"

"پگلی! وہ بہت بڑا شہر ہے؟"

"اتنا بڑا؟" وہ ہاتھوں کو پھیلا کر کہتی۔

"اور نہیں تو کیا" میں اس سے کہتا۔ "میرا ابا پچھلی عید پر بھیک مانگنے کراچی گیا تھا۔ اتنے سارے نوٹ لایا تھا۔ وہ ماں کو بتا رہا تھا' کراچی میں سمندر بھی ہے۔"

"سمندر! وہ کیا ہوتا ہے؟" ننھی شہزادی پوچھتی۔

"چل چل! تجھے تو کچھ بھی پتا نہیں۔ دیکھنا میں تو کراچی جاؤں گا۔" ہم تقریباً روزانہ یہی باتیں کرتے' گھومتے پھرتے' کھیلتے گھر لوٹ آتے۔

ایک روز حسب معمول میں اپنے کام پر جانے کے لیے تیار ہوا۔ تیار ہونے سے مراد یہ ہے کہ قمیص اتار کر ایک میلی سی بنیان پہن لی۔ چپل اتار کر ایک طرف رکھ دیے اور ننگے پاؤں اس مخصوص علاقے کی طرف چل دیا جہاں میری ڈیوٹی تھی یعنی جہاں مجھے بھیک مانگنی تھی۔ یہ علاقہ پہلے ابا کا تھا لیکن اب اس نے یہ مجھے دے دیا تھا اور خود زیادہ کمائی والے علاقے کی طرف چل دیا تھا بلکہ چل کیا دیا تھا' وہ جگہ اس نے خرید لی تھی۔ شاید میں نے آپ کو اب تک یہ نہیں بتایا کہ فقیروں کی دنیا میں بھیک مانگنے کی جگہیں باقاعدہ فروخت ہوتی ہیں۔ اس کے لیے فقیروں ہی میں ایک ٹھیکیدار ہوتا ہے جو یہ کاروبار کرتا ہے۔ ایک فقیر کے علاقے میں دوسرا فقیر نہیں آسکتا' اگر آتا ہے تو باقاعدہ جھگڑے کی نوبت آجاتی ہے۔

میں ابھی اپنے علاقے سے کچھ دور تھا کہ میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ میری ماں جو کچھ دیر پہلے گھر سے آئی تھی' دو آدمیوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ بظاہر اس کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا لیکن وہ بھیک نہیں مانگ رہی تھی' یہ تو علاقہ بھی اس کا نہیں تھا اور پھر بھیک مانگتے وقت تو وہ اندھی بن جاتی تھی مگر اس وقت تو وہ اچھی خاصی نظر آرہی تھی' باتیں

کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ بھی رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچتا' ایک ٹیکسی آکر رکی اور میری ماں ان دو آدمیوں کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ ٹیکسی روانہ ہو گئی۔ میری پرورش جس طبقے اور جس بستی میں ہو رہی تھی اس میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اکثر عورتیں بھیک مانگنے کے پردے میں جسم کا سودا بھی کر لیتی تھیں۔ ان کے مردوں کو بھی اس کا علم ہوتا تھا۔ شاید میرے باپ کو بھی ہو مگر اس کو تو پیسہ چاہئے تھا' وہ کیوں برا ماننے لگا تھا۔

"مگر ماں نے ایسا کیوں کیا؟ یہ پیسہ تو اس کے ہاتھ لگے گا بھی نہیں۔" میں نے سوچا۔ لیکن بے بسی کے آنسوؤں کے سوا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مجھے یہ سب پسند نہ آیا۔ اب میری عمر اتنی ہو گئی تھی کہ اس قسم کی باتیں نامحسوس طریقے سے مجھ پر اثر انداز ہونے لگی تھیں۔

مجھے معلوم تھا کہ ماں جہاں کہیں بھی گئی ہے لوٹ کر اپنے اس اڈے پر ضرور آئے گی جہاں وہ بھیک مانگتی تھی۔ میں اپنے اڈے کے بجائے اس کے اڈے کی طرف چل دیا' میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں گئی ہے' کب لوٹ کر آئی اور کس کے ساتھ آئی۔

میں اڈے پر پہنچا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ میدو کے ہوٹل پر بھی آج بہت کم لوگ تھے۔ میں بھی دھوپ سے بچنے کے لئے پان کے کیبن کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔ ماں کا دور دور تک پتا نہ تھا۔

پان سگریٹ والے نے' جو مجھے جانتا تھا' آنکھ دباتے ہوئے مجھ سے پوچھا "اوئے حیدر! آج نذیرن نہیں آئی۔"

"پتا نہیں۔ گھر سے تو نکلی تھی' ابھی تک ادھر نہیں پہنچی" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوئے' کسی یار کے ساتھ چلی گئی ہو گی" دکان پر کھڑے ہوئے گاہک نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

بات سچی تھی مگر مجھ سے برداشت نہ ہوئی۔ میں کیبن کے پاس سے ہٹ گیا۔ میدو کے ہوٹل میں آج بہت کم گاہک تھے' ساری کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ میں نے سوچا' کچھ دیر یہاں بیٹھ جاؤں تب تک شاید ماں بھی آجائے۔ اب مجھے بھوک بھی بہت لگ رہی تھی۔ میں ابھی بیٹھا ہی تھا کہ میدو آگیا۔ "اوئے جیب میں پیسے ہیں؟"

میرے پاس پیسے کہاں! میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔ "تو پھر پتلا کما' چل ادھر سے۔" میدو نے مجھے بھگا دیا۔

"یہ آج میدو کو کیا ہو گیا ہے۔ کبھی ماں کے ساتھ آتا ہوں تو میری بڑی خاطر کرتا ہے۔ اس روز بسکٹ بھی کھلایا تھا۔ مفت بالکل مفت۔" میں نے سوچا اور ہوٹل سے نکل آیا۔

دوپہر گزر گئی' ماں اڈے پر واپس نہ آئی۔ اب مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں وہ میری ماں کو مار نہ ڈالیں۔ میں نے سوچا' چل کر ابا کو بتانا چاہیے۔ میں اس کے اڈے پر پہنچا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ سخت گرمی کی وجہ سے گھر واپس چلا گیا تھا۔ میں بھی گھر واپس پلٹ آیا۔

گھر میں ابا پہلے ہی سے موجود تھا' شاید دن کو کوئی کام ملا ہی نہیں تھا۔ میں نے پوری بات ابا کو بتا دی۔ ابا میری بات سننے کے بعد پریشان ہونے کے بجائے بڑا خوش ہوا۔ "اوئے اچھا! ادھر گئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آج مرغی پکے گی۔" وہ بولا! "اوئے فکر نہ کر' شام تک آپے آجائے گی۔" اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کتنی فکر ہے اس کو ہم سب کی" ابا اپنے آپ سے کہتا ہوا چلم بھرنے چل دیا۔

مجھے بھی صبر آگیا۔ میں شہزادی کو لے کر ریلوے لائن کی طرف نکل گیا۔

"آج ہمارے ہاں مرغی پکے گی۔" میں نے شہزادی سے کہا

"تو کیا ہے' کل میرے گھر بھی پکی تھی۔" شہزادی نے جواب دیا۔

"کل تیری ماں کتنے بجے گھر آئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے کیا پتا' شام کو آئی تھی۔"

"جبھی تو مرغی پکی تھی۔ اب شام ہو رہی ہے۔ میری ماں بھی آگئی ہو گی۔ اب مرغی پکے گی۔" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "آ' تجھے بھی کھلاؤں گا' چل میرے گھر۔"

میں شہزادی کو لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔ ماں ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ابا بہت پریشان تھا۔ اڈے تک دیکھ آیا تھا لیکن وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ اس سے پہلے اس نے کبھی اتنی دیر نہیں لگائی تھی۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا پھیل گیا' آٹھ والی گاڑی بھی گزر گئی مگر اماں نہیں آئی۔ بستی کی کئی اور عورتیں اور مرد اس رات ہماری جگی میں جمع تھے۔ ابا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ آخر کب تک انتظار ہوتا! دس بجے کے قریب سب لوگ یہ کہہ کر اٹھ گئے "شیراتی! صبح تک اور دیکھ لے ورنہ تھانے میں رپٹ درج کروا دیں گے' مل جاوے گی۔ اب سو جا۔"

لوگوں کے جانے کے بعد ابا بہت دیر تک گم صم بیٹھا رہا' پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ہاں شاید لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں' ہو سکتا ہے کام زیادہ ہو گیا ہو' اب وہ صبح ہی آئے گی۔ نہیں آئی تو پھر رپٹ تو لکھوانی ہی پڑے گی۔"

"ابا! آج تو نے تاڑی بھی نہیں پی!"

"نہیں یار! آج دل نہیں چاہ رہا۔ تو بیٹھ' میں تیرے لئے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔" ابا باہر نکل گیا۔

ابا کے جاتے ہی میری اندھی خالہ جگی میں داخل ہوئی۔

"کدھر ہے رے تیرا باپ؟" اس نے آتے ہی پوچھا۔

"میرے لئے کھانا لانے گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیوں' تیرے گھر مرغی نہیں پکی؟" شہزادی نے آخر پوچھ ہی لیا۔

"نہیں ابا! ماں جو نہیں آئی تھی" میں نے جواب دیا۔

خالہ نے مجھ سے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ شاید اسے تمام معاملے کا پہلے سے علم ہو چکا تھا۔

ابا جگی میں داخل ہوا۔ وہ میرے لئے مرغی لایا تھا۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ باپ فقیری کیوں نہ ہو باپ ہوتا ہے۔ وہ میرے لئے گھر میں تو مرغی نہ پکوا سکا لیکن اپنا وعدہ ضرور پورا کیا۔

"ابا! اماں یاد آ رہی ہے۔" میں نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"چپ کر اوئے! اماں یاد آ رہی ہے۔ اُتّی کو تیری پروا ہے جو تجھے یاد آ رہی ہے۔ معافی کما اور سو جا" ابا نے مجھے زور سے ڈانٹا۔

"ہاں یہ تو ہے۔ اماں کو میری یاد تک نہیں آئی پھر میں اسے کیوں یاد کروں۔" میں نے دل میں کہا اور مزے سے مرغی کھانے لگا۔ تھوڑی دیر میں شہزادی بھی شامل ہو گئی۔ ہم دونوں نے پیٹ بھر کر کھایا۔

دیے کی ٹمیالی روشنی میں آج ہماری جگی کا سناٹا بڑا اداس اور خوفناک لگ رہا تھا۔ باہر جھینگروں کی آوازیں اور اندر ابا کے سینے کی گڑگڑاہٹ کے سوا کوئی آواز نہ تھی سوا وقفے وقفے سے ریل کا ہیبت ناک انجن خاموشی کے سینے کو چیرتا ہوا گزرتا تھا۔ معمول تو روز کا یہی تھا لیکن اماں ہوتی تھی تو یہ سناٹا کہیں غائب ہو جاتا تھا۔ کوئی نہ کوئی عورت ماں کے پاس بیٹھی قہقہے بکھیرتی رہتی تھی۔ آدھی رات کے بعد ابا کے ساتھ اس کی بک بک جھک جھک سے جگی آباد ہو جاتی تھی۔ اب کوئی عورت بھی نہیں تھی۔ خالہ بھی شہزادی کو لے کر کب کی جا چکی تھی۔ ابا بھی خاموش تھا، لڑتا تو کس سے لڑتا۔

میں زمین پر پڑے ہوئے ٹاٹ کے ٹکڑے پر لیٹا ہوا تھا۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ نہ جانے کب نیند کی ریل میں بیٹھ کر خوابوں کے شہر جا پہنچا۔ اماں مجھے کراچی میں مل گئی۔ ابھی میں اسے آواز دے کر بلانے والا ہی تھا کہ ابا نے مجھے آواز دے لی "عیدو! اٹھ... اوئے دیکھ تیری اماں آ گئی۔"

میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ابا نے مجھے اٹھانے کے لئے جھوٹ بولا تھا۔ یہ ماں باپ بھی خوب ہوتے ہیں۔ گھر میں باپ نہ ہو تو ماں، باپ کا نام لے کر ڈراتی رہتی ہے۔ ماں گھر میں نہ ہو تو باپ ہر کام کے لئے ماں کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ یہ کر لے، تیری ماں آتی ہوگی، وہ نہ کر، تیری ماں آئے گی تو خفا ہوگی۔

میں نے آنکھیں ملتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ "کدھر ہے ماں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں آئی، اب تھانے جانا ہی پڑے گا۔" ابا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

چاچا فضلو اور ابا نے تھانے جا کر رپٹ لکھوا دی۔ ہونا کیا تھا، پولیس آئی، برادری والوں سے پوچھ گچھ کی، کسی کو ڈرایا کسی کو دھمکایا۔ دو چار دن پولیس کا بستی میں آنا جانا رہا، جب انہیں دینے کے لئے ابا کے پاس کچھ نہ رہا تو یہ کہہ کر انہوں نے تفتیش کے خاتمے کا اعلان کر دیا کہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہوگی۔ کچھ دن تک بستی میں اماں کے یوں غائب ہو جانے کے چرچے ہوتے رہے پھر لوگ بھول گئے۔ یہاں تک کہ ابا نے بھی اس کا خیال چھوڑ دیا۔ شروع شروع میں تو وہ اکثر نشے کی حالت میں اماں کا نام لے کر گالیاں بکا کرتا تھا، پھر اس نے میری ماں کو گالیوں کے لائق بھی نہ سمجھا اور ایک دن کہیں سے میرے لئے دوسری ماں لے آیا۔ یہ عورت صورت شکل کے اعتبار سے تو بہت اچھی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی، جیسے کوئی ناگن! آپ یقین کریں کہ اندھیرے میں اس کی آنکھیں اس طرح چمکتی تھیں جیسے دو چھوٹے بلب روشن ہو جائیں۔ اس کا رویہ بھی میرے ساتھ اچھا نہ تھا۔ ان سب باتوں نے مل کر میرے دل میں اس کے لئے نفرت پیدا کر دی۔ مجھے یقین تھا کہ میری ماں کراچی چلی گئی ہے لہٰذا میں نے سوچا، میں بھی کراچی چلا جاؤں، کیا خبر وہ مجھے مل جائے۔

ایک دن موقع پا کر میں کراچی جانے والی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ ہم فقیروں کو ٹکٹ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن، ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے تک بھیک مانگتے مانگتے میں کراچی آ گیا۔ مسافروں کا ایک سیلاب تھا جو کینٹ اسٹیشن پر اترا، اسی سیلاب میں بہتا ہوا میں اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ نہ منزل کی خبر نہ راستے کا علم، جس طرف منہ اٹھا چل دیا۔

چوڑی چوڑی سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم اور انسانی سروں کی بھیڑ دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ کراچی کو میں بڑا شہر ضرور سمجھتا تھا لیکن بڑے شہر کے معنی مجھے معلوم نہیں تھے۔ "یہاں تو کسی کو کسی کی پروا ہی نہیں ہے۔ یہاں میری مجبوریوں کو دیکھ کر مجھے بھیک کون دے گا؟ مجھے عیدو کہہ کر گالی کون دے گا؟ اور اگر یہ سب کچھ نہ ہوگا تو میں کھاؤں گا کہاں سے اور رات آنے پر کہاں لیٹ کر آنکھیں بند کروں گا۔" میں نے سوچا۔ بھوک اور نیند کا خیال آتے ہی میں پریشان ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں شام ہونے والی تھی۔ بھوک الگ ستانے لگی تھی۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں اوڈین سینما کے پچھلے علاقے تک آ گیا۔ یہاں کئی موٹر گیراج تھے، میں وہاں کھڑی ہوئی گاڑیوں کو غور سے دیکھتا ہوا ہلکے ہلکے قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہاں کام کرنے والے اکثر لڑکے میرے ہم عمر تھے۔ بلکہ بعض تو مجھ سے بھی چھوٹے تھے۔ مجھے یہ بچے اس طرح کام کرتے ہوئے بہت اچھے لگے۔ انہیں دیکھ کر اس خیال نے میرے دل میں کروٹ لی کہ اگر میں بھی ان کی طرح محنت کروں تو روٹی کا آسرا بھی ہو جائے گا اور بھیک مانگنے سے بھی بچ جاؤں گا۔ اس خیال کے آتے ہی میں ایک موٹر گیراج میں

داخل ہو گیا۔ بھیک مانگنے کی عادت نے مجھے کوئی اور فائدہ پہنچایا تھا یا نہیں' اتنا ضرور ہوا تھا کہ میری جھجک اور شرم ختم ہو گئی تھی۔ میں بغیر کسی تکلف کے جو کہنا چاہتا تھا کہہ سکتا تھا۔ اس عادت نے یہاں بھی میرا ساتھ دیا۔ میں نے گیراج میں داخل ہوتے ہی اندر بیٹھے ہوئے ایک آدمی کو مخاطب کیا "اس گیراج کا مالک کہاں ہے؟"

"وہ نماز پڑھنے گئے ہیں" اس آدمی نے مجھے بتایا۔

"کب آئیں گے؟" میں نے عجیب بے تکا سوال کیا۔

"جب نماز ختم ہو جائے گی' ویسے بات کیا ہے؟" اس آدمی نے میرے سراپے کا جائزہ لیا۔

"مجھے نوکری چاہئے۔" میں نے کہا۔

"اچھا۔ کوئی کام وام جانتے ہو؟"

"نہیں۔ کوئی کام جانتا تو نہیں مگر سیکھ لوں گا۔" میں نے یقین دلایا۔

"ادھر بنچ کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ حاجی صاحب ابھی آتے ہوں گے۔ میں ان سے تمہاری بات کرا دوں گا۔ چلو!"

میں جا کر بنچ کے پیچھے بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر میں حاجی صاحب آ گئے تو مجھے ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ حاجی کہیں سے بھی نہیں لگتے تھے۔ نہ منہ پر داڑھی تھی نہ سر پر ٹوپی۔ زبان اور مزاج سے خالص کاروباری آدمی لگتے تھے۔ وہ آدمی جس سے میری بات ہوئی تھی' اب ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اسی نے میرا تعارف حاجی صاحب سے کرایا۔

"حاجی صاحب! یہ لڑکا کام کی تلاش میں ہے۔ آپ نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ میں نے اسے بٹھا لیا تھا۔ آپ دیکھ لیں"

"کام کی تلاش میں! پہلے کہاں کام کرتا تھا بھائی تو؟" حاجی صاحب نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"جی میں کام نہیں جانتا' آپ مجھے سکھا دیں پھر میں یہیں کام کروں گا۔"

"جی میں یہیں کام کروں گا۔" حاجی صاحب نے میری نقل اتاری۔ "ابے ہم تیرے باوا کے نوکر ہیں کہ تجھے کام سکھائیں اور ہاں سرکار' آپ بھاگ کر کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ کراچی کے تو آپ ہیں نہیں۔" حاجی صاحب نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں جی پنجاب سے آیا ہوں۔"

"پھر تو میرا اندازہ درست نکلا۔ بابا' میں پولیس عدالت کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ کل کلاں کو تمہارا باپ تمہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں آ جائے تو میں تو مارا گیا نا" حاجی صاحب نے کہا۔

"نہیں' مجھے کوئی ڈھونڈنے نہیں آئے گا۔" پھر میں نے حاجی صاحب کو پوری تفصیل بتائی۔ ان کے پاس بیٹھے ہوئے آدمی نے بھی میری سفارش کی "حاجی صاحب' نیک کام ہے یہ۔ لڑکا بھیک مانگنے سے نفرت کرتا ہے' محنت کرنا چاہتا ہے۔ آپ نے اسے ٹھکرا دیا تو شاید یہ پھر بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائے گا۔ میں گواہ ہوں' کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو میں آپ کا پورا پورا ساتھ دوں گا۔"

غرض خاصی بحث و تمحیص کے بعد حاجی صاحب مجھے کام سکھانے پر تیار ہو گئے۔

"ابے کچھ رقم ہے تیرے پاس؟" حاجی صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں جی' دو روپے ہیں۔"

میں نے چالاکی دکھائی۔

"چل نکال۔"

ان دو روپوں میں باقی پیسے خود حاجی صاحب نے ملا کر مٹھائی منگائی۔ فاتحہ دلائی گئی۔ پھر وہ مٹھائی پورے گیراج میں تقسیم ہوئی جو اس بات کا اعلان تھی کہ میں حاجی صاحب کا شاگرد بن گیا ہوں۔

مجھے ایک سینئر میکینک کے ساتھ کام پر لگا دیا گیا۔ دن بھر میں کام سیکھتا' رات کو گیراج میں کسی گاڑی کی سیٹ پر آٹھ کا ہندسہ بن کر پڑ جاتا۔ یہ تھی میری زندگی۔ چھٹی والے دن حاجی صاحب مجھے پانچ روپے کا نوٹ دیتے کہ "جا بیٹا عیش کر' گھوم پھر"۔ میں یہ دن بڑے مزے میں گزارتا۔ کبھی کلفٹن چلا جاتا' کبھی فلم دیکھتا اور کبھی یونہی بازاروں میں گھوم کر دن گزار دیتا۔ فرصت کے ان لمحات میں مجھے اپنی ماں بہت یاد آتی تھی۔ میں اکثر بازاروں میں گھومتے ہوئے اپنی ماں کو تلاش کیا کرتا تھا۔ ایک آدھ مرتبہ کلفٹن پر عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر بھی گیا کہ شاید وہاں ماں مل جائے مگر ماں گم ہو جائے تو اتنی آسانی سے تھوڑی ملتی ہے۔ کئی موقعوں پر شہزادی بھی مجھے یاد آئی لیکن میں نے حقارت سے اس کے خیال کو جھٹک دیا۔ "فقیر کی اولاد! اس کا میرا کیا ناتا" اگر وہ مل بھی جائے تو میں اس سے بات نہ کروں۔ مگر میری ماں بھی تو فقیرنی ہے۔" میں سوچتا "وہ میری ماں ہے' ماں تو بس ماں ہوتی ہے اور کچھ نہیں ہوتی۔" میں خود ہی جواب دیتا۔ سینے میں چاہتیں تو چھپیاں ہوتی ہیں۔ نہ جانے کتنی چھٹیاں گزر گئیں مگر ماں کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔

کارخانے میں اکثر لوگوں کو معلوم تھا کہ میں بھکاری خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ دن میں کئی مرتبہ ایسا ہوتا کہ فقیر آتا تو لوگ مجھے چھیڑتے' "ابے حمید' تیرے رشتے دار آ گئے"۔ اس بات پر کئی مرتبہ میرا جھگڑا ہوا۔ ایک مرتبہ تو میں نے ایک بھاری ہتھوڑا اپنے ساتھی پر کھینچ مارا۔ وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ اس کے لگا نہیں ورنہ سیدھی سیدھی جیل ہو گئی ہوتی۔ لیکن اس واقعے کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ لوگ ڈر گئے اور انہوں نے مجھے

پیچھا بند کر دیا۔

دن بھر آنے والی فقیر عورتوں سے یہ لوگ جو فحش مذاق کیا کرتے تھے اس نے میرے دل میں فقیروں کی طرف سے اور بھی نفرت پیدا ہو گئی۔ میں رات کی تنہائی میں اپنے خدا سے شکوہ کیا کرتا تھا کہ اس نے مجھے ایسے خاندان میں کیوں پیدا کیا۔ میں اپنی کوشش سے وہاں سے نکل آیا ہوں مگر کہلاؤں گا تو فقیری۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس نام اور خاندان سے میرا کوئی رابطہ ہی نہ رہے؟ کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی تھی۔ تھک ہار کر سو جاتا۔ کام اور خیالات کی اسی گردش میں دن گزرتے گئے۔

حاجی صاحب کے کارخانے میں کام کرتے ہوئے مجھے تقریباً ایک سال گزر گیا تھا۔ اب میں اچھا خاصا مکینک بن گیا تھا۔ حاجی صاحب نے بینک میں میرا اکاؤنٹ بھی کھلوا دیا تھا جس میں میرے پیسے جمع ہو رہے تھے۔ اب میں عیدو سے عید محمد ہو گیا تھا' اسی نام سے میرا اکاؤنٹ کھلا تھا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک سیٹھ صاحب ہمارے گیراج پر آئے' ان کی گاڑی کی "ڈھولکی" تبدیل کرنی تھی اور بھی دو ایک چھوٹے چھوٹے کام تھے۔ کام مشکل نہ تھا اس لئے حاجی صاحب نے یہ کام میرے ذمے لگا دیا۔ سیٹھ صاحب سے میں نے پیسے طے کر لئے اور بھی ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ سیٹھ صاحب گاڑی چھوڑ کر چلے گئے۔ ان سے دوسرے دن کا وعدہ ہوا تھا۔ دوسرے دن جب سیٹھ صاحب آئے تو میرے کام اور باتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے حاجی صاحب سے میری بہت تعریف کی۔ حاجی صاحب بھی مجھ سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے بھی نہ صرف میری تعریف کی بلکہ میرا ماضی بھی ان کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ سیٹھ صاحب مزید متاثر ہوئے۔ کچھ دیر ان دونوں نے تنہائی میں باتیں کیں۔ مجھے نہیں معلوم' ان کے درمیان کیا بات ہوئی' میں نے ... اطلان سنا حاجی نے مجھ سے کہا "بیٹا عید محمد! سیٹھ صاحب تمہیں بیٹا بنا کر اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں' کیا خیال ہے تمہارا؟"

میں اس اچانک حملے سے پریشان ہو گیا' سر جھکائے کھڑا رہا' کیا جواب دیتا۔

"میرے خیال میں تمہیں مان لینا چاہئے' تمہارا مستقبل بن جائے گا۔ یہاں کیا رکھا ہے۔ ہاتھ منہ کالا کرتے عمر گزر جائے گی۔" حاجی صاحب نے مجھے قائل کیا۔

"تو پھر ایک شرط ہے میری۔" میں نے نیم رضامند ہوتے ہوئے کہا۔

"بولو بیٹا بولو!" سیٹھ صاحب گڑگڑائے۔

"مجھے پڑھنے کا شوق ہے' آپ کو میرا شوق پورا کرنا ہوگا۔" سیٹھ صاحب نے قہقہہ مارتے ہوئے کہا "یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے' یہ سب تو ہمیں خود ہی کرنا ہوگا۔ بس اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

میں نے چور نگاہوں سے اپنے محسن حاجی صاحب کو دیکھا جنہوں نے بڑی محنت سے مجھے کام سکھایا اور اب میں بغیر کوئی صلہ دیئے یہاں سے جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا' حاجی صاحب کی آنکھیں بھیگی ہوئی ہیں مگر وہ مسکرا رہے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں پورے کارخانے میں یہ خبر گردش کر گئی۔ اچانک میں اہم تو بن گیا۔ کوئی معافی مانگ رہا تھا۔ کوئی کبھی کبھی آتے رہنے کا وعدہ لے رہا تھا' کوئی مبارکباد دے رہا تھا۔ مبارک سلامت کے اس شور میں سیٹھ صاحب کی نئی نویلی جھلمل کرتی گاڑی میں بیٹھ کر میں گیراج سے روانہ ہوا۔

گاڑی سیٹھ صاحب کی وسیع و عریض کوٹھی میں داخل ہوئی تو دو باوردی ملازموں نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ سیٹھ صاحب مجھے لے کر ایک کمرے میں پہنچے۔ مجھے اس وقت اپنے غلیظ کپڑوں پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ میں اپنے ساتھ دو جوڑی کپڑے لایا ضرور تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ یہ کپڑے نہانے کے بعد ہی تبدیل کئے جا سکتے تھے۔ سیٹھ صاحب نے میری یہ پریشانی بھانپ لی' انہوں نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹا عید محمد' یہ غسل خانہ ہے' جا کر نہا لو فی الحال اپنے ساتھ لائے ہوئے کپڑوں سے کام چلاؤ۔ کل تمہارے لئے بہت سارے کپڑے آ جائیں گے۔"

میں تو پہلے تیار ہی بیٹھا تھا۔ حکم ملتے ہی غسل خانے میں گھس گیا۔ نہ جانے کتنے دنوں سے ڈھنگ سے نہایا نہیں تھا اور پھر ایسا غسل خانہ تو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اب جو موقع ملا تو اگلے پچھلے سارے حساب چکا دیئے۔ معلوم نہیں کتنی دیر تک نہاتا رہا۔ نہا کر نکلا تو سیٹھ صاحب میرے منتظر تھے' وہ مجھے لے کر ایک دوسرے کمرے میں پہنچے۔ یہ ان کا ڈائننگ ہال تھا۔

"لو میاں! اب بھوک لگ رہی ہوگی' کھانا ہو جائے۔" انہوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ ماحول میرے لئے بڑا اجنبی تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا' کس طرح بیٹھنا ہے' کس طرح کھانا ہے ... میں ندامت سا ہوا تھا۔ میری یہ حالت دیکھ کر سیٹھ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے تم اس ماحول کے عادی نہیں ہو گے۔ یہاں کوئی نہیں دیکھ رہا ہے' تم بے تکلف ہو کر جس طرح کھا سکتے ہو کھاؤ۔ آہستہ آہستہ تمہیں سب کچھ آ جائے گا۔ شاباش! سالن پلیٹ میں نکالو اور شروع ہو جاؤ۔" میں نے ڈرتے ڈرتے پلیٹ میں سالن نکال لیا۔

سیٹھ صاحب نے نوکر سے پوچھا "بیگم صاحبہ کو کھانا پہنچا دیا؟"

"جی سرکار" نوکر نے اقرار میں گردن ہلائی۔

مجھے بڑا تعجب ہوا۔ میں نے سوچا ان کے یہاں عورتیں اور مرد الگ الگ کھانا کھاتے ہیں۔ مجھے سوچ میں گم دیکھ کر سیٹھ

صاحب نے پوچھا "کیا سوچ رہے ہو۔"

"سوچ رہا ہوں بیگم صاحبہ الگ کیوں کھاتی ہیں۔"

"تم اس وقت آرام سے کھانا کھاؤ۔ اب اس گھر میں آ ہی گئے ہو تو تمہیں سب پتا چل جائے گا۔" سیٹھ صاحب نے شفقت سے کہا۔ میں کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔

بعد میں کچھ نوکروں کی زبانی اور کچھ خود سیٹھ صاحب کے بتانے پر جو معلومات میں نے جمع کیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سیٹھ صاحب کا نام برکت علی خان تھا۔ ان کا چمڑے کا بزنس تھا۔ اور بھی کئی کاروبار تھے جن کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ اولاد کوئی نہیں تھی۔ دولت کا ٹھکانا نہیں تھا مگر اس کا وارث کوئی نہ تھا۔ سیٹھ صاحب کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ اس لئے شادی کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا۔ بیگم صاحبہ کو اولاد نہ ہونے کا بہت صدمہ تھا اسی دکھ نے ان کو نیم پاگل بنا دیا تھا۔ وہ اولاد نہ ہونے کا قصوروار سیٹھ صاحب کو سمجھتی تھیں۔ اس لئے ان کا سارا غصہ سیٹھ صاحب ہی پر اترتا تھا۔ سیٹھ صاحب مجھے اس لئے لے کر آئے تھے کہ شاید بیگم صاحبہ کی ممتا کو تسکین مل جائے، مجھے دیکھ کر ان کی حالت میں کوئی تبدیلی آ جائے لیکن میرے بارے میں صرف سن کر ہی ان پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اسی لئے اس دن بلکہ اس کے بعد بھی کئی دن تک انہوں نے ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ ایک ملازم نے مجھے یہ بھی بتایا کہ تم سے پہلے بھی کئی بچوں کو سیٹھ صاحب لے کر آئے لیکن بیگم صاحبہ نے ایسا واویلا مچایا اور ان معصوموں پر ایسے ظلم کئے کہ ان میں سے کوئی بھی چند ہفتوں سے زیادہ نہیں ٹک سکا۔

یہ سب باتیں سن کر میں نے تہیہ کر لیا کہ اب کچھ بھی ہو جائے میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ یہاں رہنا سیٹھ صاحب کی بھی خدمت ہے اور بیگم صاحبہ کی بھی۔ رہی ظلم و ستم کی بات تو میں بہت سخت جان ہوں۔

سیٹھ صاحب کے گھر پہنچنے کے تین دن بعد میں نے بیگم صاحبہ کو دیکھا۔ وہ کسی بات پر مالی کو سخت سست کہہ رہی تھیں۔ میں بھی ان کو دیکھنے کے شوق میں لان پر چلا گیا۔ ان کی نگاہ جیسے ہی مجھ پر پڑی وہ مالی کو بھول کر مجھ پر برس پڑیں "کون ہے یہ؟ اسے کون لایا ہے یہاں؟ آ گیا میری دولت پر قبضہ کرنے۔ ٹھہر جا میں تیری ہڈی پسلی ایک کرتی ہوں۔" وہ میرے پیچھے دوڑیں۔ میرے نصیب اچھے تھے کہ عین اسی وقت سیٹھ صاحب بھی پہنچ گئے۔ بیگم صاحبہ مجھے بھول بھال سیٹھ صاحب کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئیں۔ دونوں کے درمیان جن مکالمات کا تبادلہ ہوا انہیں سن کر تو میں حیرت میں گم ہو گیا۔ اس وقت میری نظر میں ماں اور بیگم صاحبہ میں مجھے کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ مجھ پر پہلی مرتبہ یہ انکشاف ہوا کہ دلوں کے فاصلے، دولت سے کم نہیں ہوتے۔ اس کے لئے تو انسان کی شفقتوں، چاہتوں اور محبت کے سائبان کی

ضرورت پڑتی ہے جس کے نیچے بیٹھ کر وہ تھکے ہارے مسافر حالات کی تیز دھوپ سے نجات حاصل کرتے ہیں۔ یہ سائبان نصیب نہ ہو تو سائے میں چنگاریاں برستی ہیں، خوشی کے پھول غم کے انگاروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

میں اس گھر میں رہتے ہوئے کئی مرتبہ بیگم صاحبہ کے غضب کا نشانہ بنا۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر سے بھگانے میں کسر اٹھا نہ رکھی مگر میں بڑی ڈھیٹ مٹی کا بنا ہوا تھا۔ ان کا ہر ظلم میرے صبر کی دیوار سے ٹکرا کر چکنا چور ہوتا رہا۔ انہیں شاید میرے خاندانی پس منظر کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا، وہ جانتی ہی نہیں تھیں کہ ہم گندی بستیوں میں رہنے والے لوگ تو مہلک جراثیم سے بھی ہار نہیں مانتے۔ زمین پر لیٹ لیٹ کر ہماری ہڈیاں فولاد بن جاتی ہیں۔ صدمے اٹھاتے اٹھاتے ذہن و قلب ایسے شل ہو جاتے ہیں کہ پھر چوٹ کو محسوس کرنے کی سکت ہی نہیں رہتی۔ ہاتھ پھیلانے کی عادت اتنا ذلیل بنا دیتی ہے کہ مزید ذلیل ہونے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ بالآخر وہ ہار گئیں۔ اب وہ صرف اتنا کرتیں کہ میرا سامنا ہوتے ہی نفرت سے منہ پھیر لیتیں یا اٹھ کر چل دیتیں گویا انہوں نے حالات سے مصالحت کر لی تھی۔

سیٹھ صاحب نے مجھے پڑھانے کا وعدہ پورا کیا۔ میرے لئے ایک ٹیچر کا بندوبست کر دیا گیا جو مجھے تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ سوسائٹی میں رہنے کے آداب بھی سکھاتا تھا۔

تھوڑے ہی دن میں میں نے ابتدائی کتابوں پر عبور حاصل کر لیا۔ میری ذہانت نے سیٹھ صاحب کو چونکا دیا۔ میرے ٹیچر نے بھی میری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے۔ ادب تہذیب کے اعتبار سے بھی اب میں سیٹھ صاحب ہی کی دنیا کا ایک فرد معلوم ہوتا تھا۔ اب سیٹھ صاحب مجھے اپنے حلقہ احباب میں بھی متعارف کرانے لگے تھے۔ میں ان کے ساتھ پابندی سے کلب بھی جانے لگا تھا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ میں نے ایم بی اے تک تعلیم حاصل کر لی تھی۔ اب میں نے سیٹھ صاحب کے کاروباری امور میں بھی کچھ نہ کچھ دخل اندازی شروع کر دی تھی۔ اس منزل تک آتے آتے ایک اور معجزہ بھی رونما ہو چکا تھا جس کا میں نے ابھی ذکر نہیں کیا۔ کہ بیگم صاحبہ کے رویے میں اب بے انتہا لچک آ گئی تھی۔ وہ اب مجھے میرا نام لے کر پکارنے لگی تھیں۔ جبکہ اس سے پہلے "اے" اور "اوئے" سے کام چلاتی تھیں۔

سیٹھ صاحب کے کاروباری معاملات سے قربت نے مجھ پر سیٹھ صاحب کی بے اندازہ دولت کے راز آشکار کئے۔ سیٹھ صاحب کے پاس میرے اندازے سے زیادہ دولت تھی۔ اس مرحلے پر میرے گھٹیا خاندانی خون نے اپنا کام دکھانا شروع کیا۔ ہاتھ پھیلانے والی ماں کے دودھ پر پلنے والا بچہ جتنی چھچھوری بات سوچ سکتا تھا وہی میں نے سوچی۔ میں نے سوچا کہ اگر سیٹھ

صاحب اور بیگم صاحب درمیان سے ہٹ جائیں تو میں اس دولت کا تنہا وارث بن جاؤں گا۔ اس وقت نہ تو میں نے یہ سوچا کہ بیگم صاحب نہ سہی سیٹھ صاحب میرے محسن ہیں اور نہ ہی اس پر غور کیا کہ ہمیشہ کون زندہ رہتا ہے۔ قدرے دیر ہی سے سہی سیٹھ صاحب کے بعد میں ہی ان کا وارث ہوں لیکن انتظار کے مصائب تو احمق ظرف اٹھاتے ہیں۔ کیا خبر اتنے عرصے میں ان کا کوئی اور وارث پیدا ہو جائے کیا خبر خود سیٹھ صاحب کی نیت بدل جائے۔ کون جانے کیا ہو جائے۔ مستقبل سنوارنا ہے تو قریب کا راستہ اختیار کرو، دور کیوں جاؤ۔ قطرہ قطرہ سینچنے کے بجائے چلو بھر کر کیوں نہ پیو۔ پی تو لو مگر کیسے؟ موت تو وقت پر ہی آتی ہے۔ سیٹھ صاحب کو وقت سے پہلے موت کا جھوٹا کیسے دکھایا جائے؟ کچھ بھی ہو، کچھ کرنا چاہیے۔ اب میں نے ایک کمینے مقصد کو اپنی زندگی کا حاصل بنالیا۔

میں نے اپنے مشن کا آغاز ماستا کے قتل سے کیا۔ اس بوڑھی عورت کے جذبات سے کھیلنا شروع کیا جو بے چاری میری آنکھوں میں اپنے بیٹے کا عکس دیکھنے لگی تھی۔ میرے وجود نے جس کی دیوانگی کا علاج کردیا تھا، جس کی حالت سنبھل گئی تھی۔ مگر اب میں نے سوچا کہ اس کا پاگل پن ہی میرے حق میں بہتر ہے۔ میں نے اپنے رویے سے اس کے دل کو چھیلنا شروع کیا۔ وہی عورت جو میری ہنسی کی شبنم کی عادی بن گئی تھی، میرا بدلا ہوا روپ دیکھ کر بھونچکا رہ گئی۔ میں اسے کسی ایک حالت کا عادی بنا کر اس میں برداشت کی قوت پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس کے لئے میں دوہری شخصیت کا مالک بن گیا۔ سیٹھ صاحب کے سامنے میں اس کا بیٹا بن جاتا اور سیٹھ صاحب کی غیر موجودگی میں روپ بدل لیتا۔ اس طرح اس کے ذہن کو اتنے جھٹکے لگے کہ بے چاری پھر سے سہمی سہمی رہنے لگی۔ سیٹھ صاحب اس کی یہ حالت دیکھ کر اس کی طرف سے مزید بے پروا ہو گئے۔ اس دوہری مار نے کمزور بڑھیا کو ادھ موا کر دیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر کمرے میں بند ہو گئی۔

سیٹھ صاحب کی کمزور ہڈیاں میرے توانا بازوؤں کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھیں لیکن میں خواہ مخواہ کسی بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت تھی، میں ہر قدم احتیاط سے اٹھا رہا تھا۔ سیٹھ صاحب بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ اور یہ مرض میرے لئے تقویت کا باعث تھا۔ ان کی طبعی موت کا انتظار کرنا میرے بس سے باہر تھا لہٰذا میں نے دوسرا ہی راستہ اختیار کیا۔ دن رات محنت کر کے سیٹھ صاحب کے دستخط بنانے کی پریکٹس کی۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اصل اور نقل میں تمیز کرنا مشکل ہے تو اپنی کارکردگی کے امتحان کے لئے سیٹھ صاحب کی چیک بک سے ایک چیک لے کر اس پر ایک بڑی رقم درج کی اور سیٹھ صاحب کے دستخط کر کے بینک پہنچ گیا۔ اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب بغیر کسی حیل و حجت کے وہ چیک کیش ہو گیا۔ میں پہلے امتحان میں کامیاب ہو گیا تھا۔ دوسرے مرحلے میں، میں نے ایک کاروباری خط کا جواب سیٹھ صاحب کے دستخطوں کے حوالے سے دے ڈالا۔ اعتراض وہاں سے بھی نہیں آیا۔ اب ایک ہی مرحلہ باقی تھا کہ سیٹھ صاحب کو بھی آزمالیا جائے۔ یہ موقع بھی جلدی ہاتھ لگ گیا۔ سیٹھ صاحب نے ایک کاروباری خط دستخط کر کے اپنی میز پر رکھا اور کسی کام سے دفتر سے باہر چلے گئے۔ میں نے وہ خط اٹھالیا۔ دوبارہ ٹائپ کرا کے اپنے ہاتھ سے دستخط کئے اور دوبارہ میز پر رکھ دیا۔ سیٹھ صاحب واپس آئے تو میں نے ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی "ذرا ان دستخطوں کو دیکھئے، ایسا نہیں معلوم ہوتا جیسے بیماری کی وجہ سے آپ کے ہاتھ میں خفیف سا رعشہ پیدا ہو گیا ہے۔"

"نہیں تو، اچھے خاصے دستخط ہیں۔ تمہیں یہ رعشہ کا وہم کیسے پیدا ہوا؟" انہوں نے دستخطوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ذرا غور سے دیکھئے، مجھے تو یہ آپ کے دستخط لگتے ہی نہیں۔" میں نے زور دے کر کہا۔

"تمہیں یہ آج ہو کیا گیا ہے، کیوں میرے دستخطوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ میرے بارے میں زیادہ نہ سوچا کرو۔" انہوں نے کاغذ میرے سامنے سے ہٹالیا۔

میں کمرے سے نکل آیا۔ آج میں اپنی کامیابی پر بہت نازاں تھا۔ اب میری مہارت میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی۔ اب میں کسی وقت بھی اس پلاننگ پر عمل پیرا ہو سکتا تھا جو میرے ذہن میں پل رہی تھی۔ اس پلاننگ کی کامیابی کے لئے مناسب وقت اور موقع کی ضرورت تھی۔ اس دن کے بعد سے میں اسی مناسب وقت اور موقع کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ دولت کی لکیر میرے ہاتھ میں شاید بہت گہری تھی۔ ایک قابل عمل ترکیب میرے ذہن میں آ ہی گئی۔

میرا ایمان ہے کہ پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ دولت سب کچھ نہ سہی لیکن بہت کچھ ضرور ہے۔ میں نے اسی طاقت کا سہارا لیا۔ دولت کمانے کے لئے بعض اوقات دولت خرچ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ خرچ کرنے کے مواقع بھی میں نے فراہم کر لئے۔ سیٹھ صاحب کے وکیل کو ایک بڑی رقم کا نذرانہ پیش کر کے اسے اس بات پر تیار کر لیا کہ وہ ایسے کاغذات تیار کر دے جن میں تحریر ہو کہ "میں یعنی سیٹھ برکت علی اپنی تمام منقولہ و غیر منقولہ جائداد بشمول تمام کاروبار اپنے بیٹے حمید محمد کے نام کرتا ہوں۔ مزید یہ کہ میری بیوی نیم پاگل ہے، وہ اس دولت کی نگرانی سے عاجز ہے، میری صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی اس لئے حمید محمد کو مالکانہ حقوق میری زندگی ہی میں مورخہ ۔۔۔ سے حاصل ہو جائیں گے۔"

وکیل صاحب کچھ دیر تذبذب کا شکار رہے لیکن میرے مسلسل زور دینے اور دولت کے لالچ نے انہیں پگھلا دیا۔ کاغذات تیار ہو گئے۔ میں نے پروگرام کے مطابق اپنے ہاتھ سے سیٹھ صاحب کے دستخط کیے اور کاغذات کو اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ ...اب سوال یہ تھا کہ سیٹھ صاحب کو یہ خبر کیسے سنائی جائے، مزید یہ کہ اس خبر پر ہونے والے ردِ عمل کو بھی ذہن میں رکھا جائے۔ اس ردِ عمل سے بچنے کے لئے مناسب وقت کا انتظار نہایت ضروری تھا۔

میری قسمت یاوری کر رہی تھی۔ یہ موقع بھی جلد ہاتھ آ گیا۔ ...سیٹھ صاحب بلڈ پریشر کے پرانے مریض تو تھے ہی۔ ایک مرتبہ ان کا بلڈ پریشر بہت ہائی ہو گیا۔ وہ صاحبِ فراش ہو گئے۔ ان کا فیملی ڈاکٹر آیا اور چند دوائیں تجویز کر کے چلا گیا۔ تیمار دار تو میں ہی تھا۔ میں نے وہ دوائیں ان تک پہنچنے ہی نہیں دیں۔ اس نازک وقت میں بیگم صاحبہ کی تعریفیں بھی شروع کر دیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ بیگم صاحبہ کی تعریفوں سے چڑتے ہیں۔ میں یہی چاہتا تھا کہ کسی بات پر وہ شدید غصے میں آ جائیں اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بلڈ پریشر کے مریض کو غصہ آتا بھی بہت جلد ہے اور نقصان بھی بہت ہوتا ہے۔ کوئی دوا ان کے پیٹ میں گئی نہیں، میں نے غصے اور جھنجلاہٹ میں انہیں مبتلا کر دیا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ شام تک ان کی حالت بہت بگڑ گئی۔ میں جان بوجھ کر ڈاکٹر کو اطلاع نہیں کر رہا تھا۔ شام کو کسی وقت انہیں ہارٹ اٹیک ہوا۔ اب میں نے ضروری سمجھا کہ ڈاکٹر کو اطلاع کر دوں۔ ...ڈاکٹر فوراً آ گیا۔ معائنے کے بعد اس نے مشورہ دیا کہ انہیں فوراً اسپتال لے جانا چاہئے۔ میں اور ڈاکٹر مل کر سیٹھ صاحب کو جناح اسپتال لے گئے جہاں انہیں داخل کر لیا گیا لیکن شاید یہ دورہ بہت معمولی تھا۔ جلد ہی انہیں ہوش آ گیا مگر مجھے دوبارہ بے ہوش کرنے کی تدبیر بھی آتی تھی۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ دولتمند ...کی سب سے بڑی کمزوری دولت ہی ہوتی ہے۔ جو دولت جمع کرتا ہے اس کے دل میں دولت کی محبت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تنکے جب بکھرتے ہیں، یہ دولت جب چھنتی ہے تو یہ جدائی، یہ رخصت اس سے برداشت نہیں ہوتی۔ میں نے یہی نسخہ استعمال کیا۔ رات کو مجھے سیٹھ صاحب کے ساتھ اسپتال میں رہنا تھا۔ میں ضروری تیاری کی غرض سے گھر آ گیا۔

دوبارہ اسپتال پہنچا تو رات کے دس بج چکے تھے۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد میں اسپتال کے صدر دروازے میں داخل ہوا۔ سیٹھ صاحب کا پرائیوٹ کمرا سیکنڈ فلور پر تھا۔ اسپتال کی عمارت میں اس وقت مکمل خاموشی تھی۔ جو ارادہ میرے دل میں پل رہا تھا اس کی سنگینی نے خود میری نظر میں مجھے پُراسرار بنا دیا تھا۔ ...میں آہستگی سے چلتا ہوا کمرا نمبر ۲۱ کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ کچھ دیر توقف کے بعد میں نے ایک جھٹکے سے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ سامنے سیٹھ صاحب محوِ استراحت تھے۔ ان پر دل کا دورہ پڑا تھا، علاج تو کیا گیا تھا لیکن ڈاکٹروں کے مطابق آئندہ کے چھتیس گھنٹے ان کے لئے خطرناک ہو سکتے تھے۔

"گویا ابھی امکان ہے کہ کوئی غیر معمولی بات ان کے دل کی دھڑکن پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔" میں نے سوچا۔

میں نے یہ بھی سوچ لیا کہ ان سے کس لہجے میں کیا بات کی جائے جس سے انہیں سخت اذیت پہنچے اور وہ اس گرداب میں پھر گرفتار ہو جائیں جس سے فی الحال وہ گزر آئے تھے۔

میں نے آہستہ سے آواز دے کر انہیں جگایا۔ ان کی آنکھوں سے نقاہت صاف ظاہر تھی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔

"میرے خیال میں بہت ہو چکا، اب آپ کو مر جانا چاہئے۔ کیا خیال ہے سیٹھ صاحب؟" میں نے سفاکی سے کہا۔

سیٹھ صاحب نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ان کے لبوں کو جنبش ہوئی۔ انہوں نے نہایت دھیمی آواز میں کہا۔ "شاید تم یہ اس لئے کہہ رہے ہو کہ تم سے میری تکلیف دیکھی نہیں جاتی لیکن پھر بھی تمہیں ایسا نہیں کہنا چاہئے۔"

"مجھے تمہاری تکلیف سے کوئی غرض نہیں، میں نے تو یہ بات اس لئے کی کہ تم بہت عیش کر چکے، بہت جی چکے، اب دوسروں کو موقع دو۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا!" ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن شاید درد کی کسی لہر نے انہیں لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔

میں پھر ہنسا "بڑے میاں! میں چاہوں تو ابھی تمہیں مار دوں لیکن تم میرے محسن ہو، میں یہ ظلم نہیں کر سکتا لیکن اتنا ضرور چاہوں گا کہ جہاں اتنے احسان کئے ہیں ایک اور احسان کر دو۔"

"نکل جاؤ میرے کمرے سے گندی نالی کے کیڑے، میں تمہیں پھر سے فقیر بنا دوں گا۔ میں اپنی دولت میں سے ایک پائی تمہیں نہیں دوں گا" وہ اپنی دانست میں دہاڑے مگر ان کی آواز دروازے تک بھی شاید ہی پہنچی ہو، ان کا سانس تیز تیز چلنے لگا، وہ بے دم سے ہو گئے۔ انہوں نے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے اطلاعی گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا "نہیں نہیں، ایسی بھی کیا جلدی ہے، پہلے میری پوری بات تو سن لو۔ اس کے بعد شاید تمہیں اس زحمت کی ضرورت نہ پیش آئے۔ ابھی کیا کہا آپ نے؟ آپ ایک پائی مجھے نہیں دیں گے۔ مگر آپ شاید بھول گئے کہ تمام دولت تو آپ پہلے ہی میرے نام کر چکے ہیں۔ اگر اب آپ بچ بھی گئے تو فقیر سے بدتر زندگی ہوگی آپ کی۔ یقین نہ آئے تو کاغذات کی فوٹو اسٹیٹ اور اس پر اپنے دستخط بھی ملاحظہ کر لیجئے، یہ دیکھئے۔" میں نے فوٹو اسٹیٹ ان کی طرف بڑھا دئے۔ انہوں نے

کاغذات کو غور سے دیکھا۔ پسینہ ان کے ماتھے پر پھیلنے لگا۔ کاغذات ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے دل کو تھاما۔ میرا تیر نشانے پر لگ چکا تھا۔ میں نے "ڈاکٹر کو اطلاع کی۔

رات کی ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر فوراً حاضر ہوا۔ معائنے کے بعد ثابت ہو گیا کہ ان پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر ضروری تدابیر کرتا' سیٹھ صاحب کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

موت کی باقاعدہ تصدیق ہونے کے بعد رات ہی کو میں ان کی میت لے کر گھر آگیا۔

سیٹھ صاحب جب تک زندہ رہے نوکروں کے ساتھ بڑی نرم دلی سے پیش آئے اور ان کے اس رویّے کی وجہ سے نوکر ان پر جان چھڑکتے تھے۔ سیٹھ صاحب کی اچانک موت نے نوکروں کو بدحواس کردیا تھا۔ میت گھر پہنچتے ہی کہرام برپا ہو گیا۔ تمام نوکروں نے رو رو کر کوٹھی کو سر پر اٹھالیا۔ بیگم صاحبہ لاکھ نیم پاگل سہی' تھیں تو ایک مشرقی عورت ہی نا۔ یا تو زندگی بھر انہوں نے سیٹھ صاحب سے سیدھے منہ بات نہ کی یا اب یہ حال تھا کہ سیٹھ صاحب کی میت کے سرہانے بیٹھے بیٹھے رات آنکھوں میں گزار دی' چوڑیاں توڑ دیں' بال بکھیر لئے۔ اس تمام صورت حال میں' میں واحد آدمی تھا جو نہایت مطمئن تھا' جس کی ہر چال کامیابی سے اختتام پذیر ہوئی تھی لیکن میں اپنے اطمینان دلی سے کسی کو شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے مصنوعی غم کی نقاب اپنے چہرے پر وقتی طور پر اوڑھ لی تھی۔ ساتھ ساتھ نوکروں کو تسلی بھی دیتا جارہا تھا اور تسلی بھی اس بیان کے ساتھ کہ "بس خاموش ہو جاؤ' میں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا ہوا ہے تمہاری حالت دیکھ کر میرے ضبط کا بندھن بھی ٹوٹ جائے گا" مگر نوکر کہاں ماننے والے تھے۔ کچھ تو انہیں سیٹھ صاحب سے محبت تھی اور کچھ مجھے خوش کرنے کے لئے اس طرح بھوں بھوں کرکے روئے چلے جارہے تھے کہ میری طبیعت الجھنے لگی۔ میں سوچنے لگا کہ اگر رات بھر یہ لوگ اسی طرح کمرے میں موجود رہے تو میں تو آرام کر چکا۔ ان مردودوں کی وجہ سے مجھے منہ بسور کر بیٹھا رہنا پڑے گا۔

آخر مجھ سے ضبط نہ ہوا' میں نوکروں سے مخاطب ہوا "کیا تم نے نہیں سنا کہ اس طرح رونے سے مردے کو سخت اذیت ہوتی ہے اور کیا تم یہ چاہو گے کہ تمہارے سیٹھ صاحب کو مرنے کے بعد تمہاری ذات سے تکلیف پہنچے۔ اگر رونا ہی ہے تو دوسرے کمرے میں جا کر آنسو بہاؤ۔ چلو' سیٹھ صاحب کو تنہا چھوڑ دو۔"

تمام نوکر روتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ اب کمرے میں سیٹھ صاحب کی میت کے ساتھ میں رہ گیا تھا یا سرہانے بیٹھی ہوئی بیگم صاحبہ۔ اب بیگم صاحبہ کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ وہ اپنے آپ سے بے خبر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سہاگ کو جی بھر کر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مجھے مسکرائے ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ نوکروں کے جانے کے بعد میں نے کمرے کو اندر سے بند کیا اور خوب جی بھر کر ہنسا۔ بیگم صاحبہ اب لاش کے بجائے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ وہ سوچ رہی ہوں گی لو' ایک پاگل کا اور اضافہ ہوا۔ مجھے اس وقت بے چاری بڑھیا پر بڑا ترس آیا مگر بے وردی رہنے ہی میں عافیت تھی۔ ظلم کا بازار گرم کئے رہنے ہی میں میری نجات تھی۔ میں نے بیگم صاحبہ کے شانوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "تمہارے سرتاج روٹھ گئے ہیں۔ ستاؤ' مگر خبردار! میری نیند نہ خراب ہو' میں سونے جارہا ہوں" بیگم صاحبہ نے زخمی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور سر جھکالیا۔ میں اپنے کمرے میں جانے کے لئے دوسرے دروازے سے نکل گیا۔

میں دن بھر کی بھاگ دوڑ سے بہت تھک گیا تھا۔ اصولاً مجھے بستر پر لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں چلے جانا چاہئے تھا' ویسے بھی میں نیند کا بہت کچا تھا۔ لیکن خلاف توقع ایسا نہ ہوسکا۔ تقریباً تین بجے میں اپنے کمرے میں آیا تھا۔ کپڑے تبدیل کرکے بستر تک آتے آتے ساڑھے تین بج گئے ہوں گے مگر نیند مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔ کروٹ بدلتے بدلتے دن نکل آیا۔

کوٹھی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نوکر بے چارے تھک ہار کے سو گئے تھے حتیٰ کہ بوڑھا رمضانی بھی آج فجر کی نماز کے لئے شاید اٹھنا ہی بھول گیا تھا۔ میں اس طرح ہڑبڑا کر اٹھا جیسے مجھے کچھ یاد آگیا ہو۔ مجھے یاد آیا کہ رات ہی سیٹھ صاحب کا انتقال ہوا ہے۔ ان کی لاش ان کے کمرے میں پڑی ہے۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ان کی موت کا ذمے دار میں ہوں لیکن اس تصور سے میں نے اتفاق نہیں کیا' ہر شخص اپنی موت کا ذمے دار خود ہوتا ہے' میں نے سوچا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا شیو بڑھا ہوا تھا' رات بھر کی بیداری سے آنکھیں انگارے کی طرح لال ہو رہی تھیں "عید محمد آج شیو مت بنانا' سرخ آنکھیں اور بڑھا ہوا شیو تیرے بہت کام آئے گا۔ آخر تو سیٹھ صاحب کا اکلوتا بیٹا ہے' اتنا غم تو تجھے ہونا ہی چاہئے" منہ پر الٹے سیدھے چھپاکے مار کر میں غسل خانے سے باہر نکل آیا۔ سیٹھ صاحب کے قریبی دوستوں اور دفتر والوں کو ٹیلی فون پر اطلاع دینے کے بعد میں سیٹھ صاحب کے کمرے میں پہنچا۔ بیگم صاحبہ' سیٹھ صاحب کا سر اپنے زانو پر رکھے بیٹھی تھیں' ان کی پیٹھ میری طرف تھی "پاگل بیویوں کا کیا تو فائدہ ہے" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ میری آواز پر بیگم صاحبہ نے چونک کر دیکھا اور سر جھکالیا۔

اب کوٹھی میں زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ نوکر بھی جاگ گئے تھے۔ انہوں نے ڈرائنگ روم کا سامان

نکل کر چاندنی کا فرش بچھا دیا تھا۔ اگربتیاں بھی جلا دی گئی تھیں۔ کسی نے قریب کی مسجد سے سپارے بھی لا کر رکھ دیئے تھے۔ پڑوس کے کچھ نوکر اور ان کے بچے سپارے پڑھ رہے تھے۔ صاحب لوگ ابھی سو کر نہیں اٹھے تھے اس لئے نہیں پہنچے تھے لیکن تھوڑی دیر میں تعزیت کرنے والے آنا شروع ہو جائیں گے۔ یہ سوچ کر میں نے سفید رومال سر پر رکھا اور سپارہ پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ دو نوکروں کو قبرستان کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ غسال صبح ہی سے آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اب مجھے دفتر والوں کا انتظار تھا۔ اسٹاف کے لوگ آ جائیں تو میری جان چھوٹ جائے۔ منیجر صاحب سب کچھ خود سنبھال لیں گے اور واقعی منیجر صاحب کے آنے کے بعد میری جان چھوٹ گئی۔ انہوں نے آتے ہی لان میں شامیانہ لگوا کر کرسیاں ڈلوا دیں۔ دفتر کے لوگوں نے مجھے ایک طرف بٹھا دیا کہ "سر، آپ بیٹھیں، ہم سب کچھ سنبھال لیں گے۔" اور انہوں نے واقعی سب کچھ سنبھال لیا۔

دوپہر سے پہلے پہلے سیٹھ صاحب اپنی آخری آرام گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ محلے کی دوسری بیگمات نے بیگم صاحبہ کو سنبھالا ہوا تھا ورنہ ان کا پاگل پن نہ جانے کیا کر بیٹھتا، مجھے اس دن اندازہ ہوا کہ وہ سیٹھ صاحب سے کتنی محبت کرتی تھیں۔

سیٹھ صاحب کو دفنانے کے بعد میں، دفتر کے بعض لوگ اور چند تجارتی خوشامدی گھر واپس آئے تو نئی مصیبت میرا راستہ تک رہی تھی۔ بیگم صاحبہ پر شدید دورہ پڑا تھا۔ عورتوں نے ایک دو نوکر کی مدد سے انہیں رسیوں سے باندھ دیا تھا۔ ان کے منہ سے کف جاری تھا، وہ چیخ چیخ کر مجھے کوس رہی تھیں۔ میں نے ڈاکٹر کو فون کیا، وہ ان کا فیملی ڈاکٹر تھا، ان کے مرض کو بے خوبی سمجھتا تھا۔ اس نے نیند کے انجکشن کے ذریعے انہیں سلا دیا۔

وقتی طور پر تو یہ خطرہ ٹل گیا تھا لیکن ہوش میں آتے ہی انہوں نے اپنی زبان پھر کھولی تو نہ جانے کون کون سے راز ہوں جو ان کے علم میں ہوں۔ اور اگر وہ زبان پر آ گئے تو یہ بڑھیا میرا جینا عذاب کر دے گی، میں سوچ میں پڑ گیا۔

سیٹھ صاحب کا عزیز رشتے دار شاید کوئی تھا ہی نہیں۔ بیگم صاحبہ بھی تنہا میری طرح اکیلی تھیں۔ دونوں میں سے کسی کے رشتے دار کو نہ میں نے سیٹھ صاحب کی زندگی میں دیکھا تھا نہ مرنے کے بعد کوئی آیا۔ دوست احباب دو چار دن آتے جاتے رہے پھر سناٹا، پھر تنہائی۔

بیگم صاحبہ کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی، سیٹھ صاحب کی موت نے ان کی صحت پر برا اثر ڈالا تھا۔ وہ پھر سے پاگل پن کے بہت قریب پہنچتی جا رہی تھیں۔ نوکر چاکر ان کی دلداری میں دن رات ایک کئے ہوئے تھے۔ اگر یہ اسی طرح ان کا دل بہلاتے اور خدمت کرتے رہے، ان کی دوا دارو کا خیال کرتے رہے تو بڑھیا پاگل ہونے سے رہی۔ ہوش مندی ممکن کی موجودگی میں مجھے اپنے پلان پر عملدرآمد میں جتنی دشواری پیش آ سکتی تھی اسے میں جانتا تھا۔ میں نے نوکروں کو ٹھکانے لگانے کا ارادہ کر لیا بلکہ مجھے ہر اس آدمی کو خود سے دور کرنا تھا جو سیٹھ صاحب کا حق نمک ادا کرنے کے خبط میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنے محض ایک حکم کے ذریعے تمام نوکروں سے ان کی روزی چھین لی۔ ان میں سے بعض بہت روئے، بڑے تڑپے لیکن میں نے ان پر واضح کر دیا کہ "میرا کام بغیر نوکروں کے چل سکتا ہے، میں تمہیں محض اس لئے برداشت نہیں کر سکتا کہ تم مرحوم کی نشانیاں ہو۔"

میں نے اتنی مہربانی ضرور کی کہ انہیں ایک ایک ماہ کی تنخواہ ادا کر کے رخصت کیا۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد بہت جلد میں نے دو ملازم رکھ لئے۔ یہ ملازم نئے تھے، مجھے اپنا مالک سمجھتے تھے لہٰذا ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

سیٹھ صاحب کی فیکٹری، ہیڈ آفس اور مختلف برانچوں میں بھی میں نے چھانٹی کے اس عمل کو دہرایا۔ جہاں بھی کسی ملازم کو سیٹھ صاحب کے گن گاتے دیکھا اسے گھر کی راہ دکھائی، اس کام میں مجھے کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ ہمارے معاشرے میں ابن الوقت بہت مل جاتے ہیں۔ مجھے ایسے لوگ بہ آسانی مل گئے جو محض میری خوشنودی اور اپنے نمبر بڑھانے کے لئے جاسوسی کے فرائض مفت انجام دینے لگے۔ میں نے انہی اطلاعات کو بنیاد بنا کر اپنے راستے کے پتھروں کو ہٹا کر راستہ ہموار کر لیا۔ محض ایک مہینے کی قلیل مدت میں تمام دفاتر میں میرا سکہ چلنے لگا۔

بیگم صاحبہ ابھی تک اپنے ہوش و حواس میں تھیں بلکہ اب تو وہ میرے اقدامات پر دبی زبان میں احتجاج بھی کرنے لگی تھیں۔ اور تو اور، ان کا ایک بھانجا بھی کہیں سے برآمد ہو گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید وہ قانونی کارروائی بھی کریں۔ دنیا کو معلوم تھا کہ میں سیٹھ صاحب کا حقیقی بیٹا نہیں۔ بیگم صاحبہ بہرحال سیٹھ صاحب کی قانونی بیوی تھیں۔ سیٹھ صاحب نے لاکھ میرے نام جائیداد منتقل کر دی ہو لیکن عدالت بیگم صاحبہ کو ان کا حق دلا سکتی تھی، پھر یہ کہ میں بیگم صاحبہ کی موجودگی میں اگر اس جائیداد کو فروخت کرنا چاہتا تو کیسے کر سکتا تھا؟ ان سب باتوں کا ایک ہی حل تھا کہ بیگم صاحبہ کو کسی طرح یا تو پاگل کر دیا جائے یا پاگل قرار دے دیا جائے۔ میں نے دونوں امکانات پر کام شروع کر دیا۔

ان اسکیموں پر عمل کرنے کے لئے ڈاکٹر کو اعتماد میں لینا ضروری تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بیگم صاحبہ کا فیملی ڈاکٹر اس قسم کا آدمی ہے جو ایمانداری کو اپنا پیشہ سمجھ لیتے ہیں۔ اس کو شیشے میں اتارنا خطرے کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس لئے میں نے یہی بہتر سمجھا کہ سیٹھ صاحب کے دوسرے وفاداروں کی طرح

اسے بھی بیگم صاحبہ سے دور کردیا جائے مگر اس طرح کہ اسے شک نہ گزرے اور اس کے لئے بیگم صاحبہ کو اعتماد میں لینا ضروری تھا۔

بیگم صاحبہ مجھ سے بہت بدگمان تھیں مگر میں ایک کھلاڑی! میں نے ان کی موجودہ کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ میں نے ان کے نو وارد بھانجے سے راہ و رسم پیدا کرلی۔ پہلے تو وہ کم کم آتا تھا۔ اور عموماً اس وقت جب میں گھر پر نہ ہوتا لیکن اب میرا خوف اس کے دل سے نکل گیا بلکہ دوستانہ فضا قائم ہوگئی۔ میں نے مختلف طریقوں سے اس کے دل میں یہ بات بٹھادی کہ بیگم صاحبہ مجھ سے محض اس لئے نفرت کرتی ہیں کہ میں ان کا سگا بیٹا نہیں' ان کے بطن سے پیدا نہیں ہوا۔ اس میں کچھ ان کی ذہنی حالت کا بھی قصور ہے جبکہ میں ان کو اپنی سگی ماں سمجھتا ہوں۔ رہا جائداد و کاروبار کا مسئلہ۔ یہ سب کچھ خود سیٹھ صاحب نے میرے نام کردیا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر اسے قبول کرلیا کہ میں اپنی صلاحیتوں سے اس دولت میں اضافہ کرسکتا ہوں۔ اگر بیگم صاحبہ مجھ پر بھروسا کریں' مجھے اپنی محبت سے نوازیں تو یہ دولت ہی میرے لئے سب کچھ ہے۔ وہ حکم دیں تو آج میں یہ دولت ان کے نام کرنے کو تیار ہوں۔ اور میں ایسا ان کے کہے بغیر ہی کردیتا لیکن ان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں۔ بس ذرا ان کا علاج مکمل ہوجائے' یہ فریضہ بھی میں انجام دے لوں گا۔

میں نے اس سے کہا "اب تم ایک کام کرو' کسی طرح بیگم صاحبہ کا دل میری طرف سے صاف کرادو۔ مزید یہ کہ بیگم صاحبہ کے علاج پر ہم دونوں مل کر توجہ دیں۔ وہ اپنے علاج کی طرف سے بڑی بے پروا رہتی ہیں۔"

ان کا بھانجا جس کا نام میں آپ کو بتانا بھول گیا' راشد تھا' میری باتوں میں بڑی آسانی سے آگیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ضرور کرے گا۔

میری اس گفتگو کا اثر دو چار دن میں ظاہر ہونے لگا۔ بیگم صاحبہ' راشد پر بہت بھروسا کرنے لگی تھیں۔ جب انہوں نے راشد کی زبانی میری تعریف سنی تو ان کے رویے میں لچک آگئی۔ ان کی آنکھوں میں موجود نفرت کی چنگاریاں دم توڑنے لگیں۔ اب وہ میرے سلام کا جواب دینے لگیں۔ میں ان کی خیریت دریافت کرتے ہوئے مسکراتا تو وہ بھی جوابی تبسم سے میرا استقبال کرتیں۔ ہفتے بھر کی خاموش محبت کے بعد ہم دونوں ماں بیٹوں کی طرح گھل مل گئے' خوشی کا یہ موسم بیگم صاحبہ کو بہت راس آیا۔ ان کی صحت تیزی سے بحال ہونا شروع ہوگئی۔ ان کے ہفتہ وار چیک اپ کے لئے ڈاکٹر آیا تو ان کی سنبھلتی ہوئی حالت دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

"تم نے انہیں اتنی محبت دی ہے کہ یہ اپنا غم بھول گئی ہیں۔ تم لائق مبارک باد ہو۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ ان کے سامنے سیٹھ صاحب کا تذکرہ کم سے کم ہو ورنہ یہ دوبارہ تصوراتی دنیا میں پناہ لینے پر مجبور ہوجائیں گی" ڈاکٹر نے مجھے مشورہ دیا۔

میں جس منزل تک پہنچنے کے لئے بے تاب تھا اور اب پریشان ہونے لگا تھا' ڈاکٹر کے ایک جملے نے مجھے وہ راستہ سجھا دیا۔ سیٹھ صاحب کا زیادہ سے زیادہ تذکرہ بیگم صاحبہ کو اس حالت پر پہنچا سکتا تھا جس کا میں متمنی تھا۔

میں نے سیٹھ صاحب کا قد آدم پورٹریٹ بنوا کر بیگم صاحبہ کے کمرے میں رکھوا دیا۔ اس کے علاوہ بھی چند چھوٹی تصویروں کے فریم ان کے کمرے میں ادھر ادھر لگوا دیئے۔ سیٹھ صاحب کا بیڈ اور کپڑوں کی الماری بھی ان کے کمرے میں پہنچوا دی۔ میں جتنی دیر بیگم صاحبہ کے پاس رہتا کسی نہ کسی بہانے سے سیٹھ صاحب ہی کا ذکر کرتا رہتا۔ کبھی ان کی تعریف کرتا' کبھی دبے لفظوں میں ان مظالم کا ذکر کرتا جو انہوں نے بیگم صاحبہ کے ساتھ روا رکھے تھے۔ میں نے یہ بات نوٹ کی کہ وہ ان باتوں پر کسمسا کر رہ جاتیں۔ ان کی آنکھوں میں پرچھائیاں سی تیرنے لگتیں۔

بیگم صاحبہ میری تعمیر کردہ پُراسرار فضا کا مقابلہ زیادہ دیر تک نہ کرسکیں۔ مستقل بیماری نے ان کے اعصاب کو بہت شکستہ کردیا تھا۔ وہ ان نفسیاتی چوٹوں سے بلبلا کر رہ گئیں۔ وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگیں' اکثر تنہائی میں خود سے باتیں کرنا ان کا مشغلہ بن گیا۔ میرے لئے یہ ایک اچھی علامت تھی' میں نے اپنی مہم کو اور تیز کردیا۔

ایک رات بیگم صاحبہ کی چیخوں نے تمام کوٹھی کو سر پر اٹھالیا۔ میں دوڑ کر ان کے کمرے میں پہنچا۔ کمرا اندر سے بند تھا' ایک نوکر کو میں نے روشندان کی مدد سے کمرے کے اندر بھیجا۔ دروازہ کھلنے کے بعد میں اندر داخل ہوا۔ بیگم صاحبہ' سیٹھ صاحب کی تصویر کے سامنے دوزانو بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہذیانی چیخیں ان کے ہونٹوں سے بلند ہورہی تھیں۔ ان کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ نہ جانے کس وقت انہوں نے کسی چیز سے اپنے آپ کو زخمی کرلیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے نوکروں کی مدد سے ان پر قابو پایا اور انہیں ڈرائنگ روم میں لاکر صوفے کے ساتھ باندھ دیا۔ وہ مسلسل کبھی اپنے آپ کو' کبھی سیٹھ صاحب کو بُرا بھلا کہہ رہی تھیں۔ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے اپنے آپ کو زخمی کرلیا تھا۔ گویا یہ دورہ سابقہ دوروں کی بہ نسبت زیادہ شدید تھا۔ اب وہ نیم پاگل نہیں مکمل پاگل لگ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی کو پہچان ہی نہ رہی ہوں۔ میں نے ان کے فیملی ڈاکٹر کو بلانے سے پہلے ضروری سمجھا کہ ان کے کمرے کو پہلے والی حالت پر لے آؤں تاکہ ڈاکٹر صاحب کو کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ نوکروں کی مدد سے میں نے سیٹھ صاحب کی تصویریں اور ان کا بیڈ وغیرہ نکلوا دیا۔ اس کام سے نمٹنے کے بعد میں نے ڈاکٹر کو فون کردیا' تھوڑی دیر میں ڈاکٹر آگیا۔

بیگم صاحبہ ابھی تک بذیان بک رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے ان کے زخم پر پٹی باندھنے کے بعد تشویش کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے کہا "عبید محمد صاحب" میں پچھلے معائنے کے بعد بہت خوش تھا۔ ان کی حالت بہت تیزی سے سنبھل رہی تھی۔ مگر اس وقت تو میں ان کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے لیکن کچھ ہے ضرور۔ آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آج کل میں ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ شاید میں اس کی روشنی میں کوئی علاج تجویز کر سکوں۔"

"ڈاکٹر صاحب' مجھے یاد نہیں کہ کوئی بات ہوئی ہو' کھانا کھانے کے بعد اچھی خاصی اپنے کمرے میں گئیں' مجھے خدا حافظ کہا۔ بس ڈیڑھ دو گھنٹے بعد..."

"بہرحال۔ میں بلڈ پریشر چیک کرتا ہوں" ڈاکٹر صاحب' بیگم صاحبہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کون ہے تو' قصائی کہیں کے' آخ تھو" بیگم صاحبہ نے ڈاکٹر پر تھوک دیا۔ میری ہنسی نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ توقع نہیں تھی۔ وہ ہکا بکا رہ گئے۔

"عبید محمد صاحب! ان کی حالت تو میرے اندازے سے زیادہ خراب ہے۔ آپ ایسا کریں ان کے چہرے کو رومال سے ڈھانپ دیں تاکہ یہ دوبارہ تھوکنے والی حرکت کا اعادہ نہ کر سکیں۔ میں ان کو ایک انجکشن دیتا ہوں۔ یہ انجکشن انہیں چھ ... کے لئے سُلا دے گا۔ اگر بیدار ہونے کے بعد بھی ان کی یہی حالت رہتی ہے تو پھر معاف کیجئے گا' ان کو دماغی اسپتال میں داخل کرانا ہو گا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب! میں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ آپ کو معلوم ہے یہ صرف میری ماں ہی نہیں میری محسنہ بھی ہیں۔ میرے عظیم محسن کی واحد نشانی" میں نے ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"پلیز! حوصلہ کیجئے' شاید یہ سب کچھ نہ ہو۔ آپ یہ انجکشن تو مجھے دینے دیں" ڈاکٹر صاحب نے میرے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی" میں نے رومال لے کر پوری طاقت سے بیگم صاحبہ کے منہ کو دبوچ لیا۔ ڈاکٹر صاحب تیار ہی تھے۔ انہوں نے انجکشن لگا دیا۔ بیگم صاحبہ بہت تڑپیں لیکن نہ میں نے منہ چھوڑا نہ ڈاکٹر صاحب نے بازو۔

"جب ان پر غنودگی طاری ہو جائے تو انہیں ان کے کمرے میں پہنچا دیجئے گا اور جب تک یہ خود نہ اٹھ جائیں انہیں اٹھائیے گا نہیں۔ اگر انہیں پُرسکون نیند نہ آئی یا وقت سے پہلے انہیں اٹھا دیا گیا تو حالت مزید بگڑ سکتی ہے" ڈاکٹر صاحب یہ ہدایات دینے کے بعد رخصت ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد میں نے نوکروں کی مدد سے بیگم صاحبہ کو ان کے بستر پر پہنچا دیا۔ میں ان کے کمرے ہی میں ٹھہر گیا۔ نوکروں کے جانے کے بعد میں نے اپنی اسکیم پر عمل شروع کر دیا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ پُرسکون نیند ان کا علاج ہے لہٰذا انہیں نیند سے دور رکھنا اب میری ذمے داری بن گئی تھی۔ میں نے غیر ارادی طور پر بیگم صاحبہ کو جھنجوڑا۔ ان کا پورا جسم ڈھیلا پڑا ہوا تھا۔ میرے جھنجوڑنے کا ان پر قطعی اثر نہ ہوا۔ وہ بے خبر سو رہی تھیں۔ میں نے قریب رکھے ہوئے جگ سے پانی لے کر ان کے چہرے پر چھڑکا۔ وہ کسمسائیں اور پھر سو گئیں۔ میں نے پھر جھنجوڑا۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں' پھر سو گئیں۔ غرض کہ میں انہیں جھنجوڑتا' جگاتا رہا۔ وہ جاگتی' سوتی رہیں۔ یہاں تک کہ رات بیت گئی۔

صبح ۸ بجے کے قریب انہوں نے ایک زوردار چیخ ماری اور اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے اجنبی نگاہوں سے مجھے گھورا۔ "تمہیں ہمت کیسے ہوئی ملکۂ عالیہ کی خواب گاہ میں آنے کی" وہ دہاڑیں۔

میں سچ مچ ڈر گیا۔ میں نے گھبرا کر نوکروں کو بلانے کی گھنٹی بجائی' تھوڑی دیر میں تمام نوکر کمرے میں موجود تھے۔

بیگم صاحبہ نے کمرے میں رکھی مختلف چیزوں کو پھینکنا شروع کر دیا۔ نوکروں نے بہ دقت تمام انہیں رسیوں میں جکڑ دیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو ٹیلی فون پر اطلاع دی "آپ کا علاج ناکام ہو گیا۔ جلدی آئیے بیگم صاحبہ کی حالت بہت خراب ہے۔"

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر آ گیا۔ اسے کسی قطعی نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے بیگم صاحبہ پر نظر ڈالتے ہی مجھ سے کہا۔ "انہیں گدو بندر لے جانا پڑے گا۔ آپ گاڑی نکلوائیے' جلدی کیجئے۔"

ڈرائیور نے گاڑی نکالی۔ اس وقت تک راشد بھی آ چکا تھا۔ میں نے سوچا' یہ بھی اچھا ہوا۔ اب وہ اسے میری سازش نہیں' ڈاکٹر صاحب کی تجویز سمجھ کر مجھ پر شک نہیں کرے گا۔ اس نے اپنی خالہ کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

بیگم صاحبہ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انہیں گاڑی میں بٹھایا گیا' ان کے ساتھ ڈاکٹر اور راشد بیٹھ گئے' اگلی سیٹ میں نے سنبھالی۔ اب ہماری گاڑی ڈیفنس سوسائٹی سے گدو بندر کے لئے روانہ ہوئی۔ بیگم صاحبہ راستے بھر قہقہے لگاتی رہیں یا پھر وقفے وقفے سے مجھے اور سیٹھ صاحب کو گالیاں بکتی رہیں۔ گاڑی میں ان کے علاوہ کوئی نہیں بول رہا تھا۔ ڈرائیور پوری رفتار سے گاڑی کو بھگا رہا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب' انہیں اندازاً کتنے دن پاگل خانے میں رہنا پڑے گا؟" میں نے خاموشی کو توڑا۔

"اس وقت کیا کہا جا سکتا ہے۔ شاید ماحول کی تبدیلی ان کے لئے خوش گوار ثابت ہو۔ ویسے مدت کے بارے میں اس وقت

کچھ کہنا لاحاصل ہے" ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر چپ سادھ لی۔
میں نے بھی وقت گزاری کے لئے باہر سڑک پر نظریں جمادیں اور آئندہ پیش آنے والے وقت کے بارے میں منصوبہ بندی کرنے لگا۔ کون جان سکتا تھا میں اس وقت کیا سوچ رہا تھا۔

گاڑی پاگل خانے کی حدود میں داخل ہوئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ پر قابو رکھنے کی کوشش کی۔ میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔

"آپ کو تو پسینے آرہے ہیں؟ آپ اتنے نروس کیوں ہیں' سب ٹھیک ہوجائے گا" ڈاکٹر صاحب نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

میں بھی گاڑی سے باہر آگیا۔

"آپ یہاں ٹھہریں' میرا ایک واقف کار ڈاکٹر ہے اس سے مل کر میں ابھی آتا ہوں" ڈاکٹر صاحب نے کہا اور آگے بڑھ گئے۔

تھوڑی دیر میں وہ اپنے دوست ڈاکٹر کے ساتھ واپس آگئے۔

"یہ ہیں ڈاکٹر اویس" ڈاکٹر صاحب نے ان کا تعارف کرایا۔ "اور آپ ہیں مسٹر عید محمد۔"

ڈاکٹر اویس کے ساتھ انتظامیہ کے چند افراد اور اسٹریچر بھی تھا۔ ان افراد نے بیگم صاحبہ کو بڑی بے دردی سے باہر کھینچا۔ اسٹریچر پر لٹاکر باندھا اور تیزی سے ایک کمرے میں داخل ہوگئے' ...ہم تمام افراد برآمدے ہی میں ٹھہر گئے۔

دوسرے تک مختلف مشینوں کے ذریعے بیگم صاحبہ کا چیک اپ ہوتا رہا۔ نہایت غور و خوض کے بعد ڈاکٹروں کے پورے پینل نے متفقہ طور پر بیگم صاحبہ کو خطرناک پاگل قرار دے دیا۔ ڈاکٹر اویس نے نہایت تاسف سے مجھے یہ خبر سنائی اور ساتھ ہی یہ ہدایات بھی دیں۔

"مکمل علاج تک بیگم صاحبہ کا پاگل خانے میں رہنا نہایت ضروری ہے۔ ان کے علاج میں کم سے کم چھ مہینے یا زیادہ سے زیادہ ایک سال کا عرصہ لگ سکتا ہے لیکن اس عرصے میں آپ کو ایک قربانی دینی ہوگی" ڈاکٹر اویس نے میری طرف التجا آمیز نگاہوں سے دیکھا۔

"قربانی! کیسی قربانی؟" میں نے پوچھا۔

"جتنے عرصے بیگم صاحبہ یہاں داخل رہیں گی' آپ سمیت ان کا کوئی رشتے دار ان سے ملنے کی کوشش نہیں کرے گا" ڈاکٹر اویس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ تو بہت مشکل ہے۔ کم از کم مجھے تو اجازت ہونی چاہئے۔ دنیا کیا کہے گی! شاید آپ کو معلوم نہیں' یہ میری سگی ماں نہیں ہیں۔ دنیا تو یہی کہے گی نا کہ سوتیلی ماں کو اسپتال میں ڈال کر بھول گئے' ملنے تک نہیں جاتے" میں نے کہا۔

"دنیا کچھ بھی کہے' جو میں کہتا ہوں وہی کیجئے۔ ماضی کی ہر تلخی کو ان کے ذہن سے نکلنا ہوگا۔ جب تک علاج مکمل نہیں ہوجاتا' آپ میں سے کسی کا ان کے سامنے آنا خطرناک ہوسکتا ہے" ڈاکٹر اویس نے قطعیت سے کہا۔

"ہم ان کی صحت کے لئے اپنے دل پر پتھر رکھ لیں گے" میں نے ڈاکٹر اویس کا کہنا مانتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو" ڈاکٹر نے شکریہ ادا کرکے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

راشد میرے نزدیک ہی کھڑا تھا۔ میں نے دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ظاہر ہے وہ اس فیصلے سے خوش نہیں تھا لیکن کر کیا سکتا تھا۔ میں نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے اسے مخاطب کیا "راشد! ویری سوری' تمہاری خالہ اتنے دن بعد ملیں بھی تو اب یہ افتاد آن پڑی' وہ پھر بچھڑ گئیں مگر میرے اختیار میں کیا ہے' میں کیا کرسکتا ہوں۔ دعا کرو وہ جلدی ٹھیک ہوجائیں' تو اب چلیں۔"

راشد کو بالکل چپ لگی ہوئی تھی۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا' ...خاموشی سے قدم اٹھاتا ہوا گاڑی کی طرف چل دیا۔ اسے جاتا دیکھ کر میں اور میرا فیملی ڈاکٹر بھی کار میں آکر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

اب بظاہر میرے لئے میدان صاف تھا۔ تمام کام بخیر و خوبی انجام پاچکے تھے۔ راشد کی طرف سے معمولی سا خطرہ تھا مگر وہ ایسا آدمی نہیں لگتا جو کوئی مشکل کھڑی کرسکتا۔ وہ بیگم صاحبہ کی شہ پر تو کوئی ہنگامہ کھڑا کرسکتا تھا لیکن اکیلے اس کے بس میں کچھ بھی نہ تھا۔

میں اپنے نام اور خاندان کی طرف سے بڑی احساس کمتری میں مبتلا رہتا تھا' میرے نام ہی سے فقیر ہونا ظاہر ہوتا تھا۔ عیدو نہ سہی عید محمد سہی۔ اس نام کے ساتھ اعلیٰ سوسائٹی میں زیادہ دور تک چلنا مجھے گوارا نہ تھا۔ جب بھی کوئی مجھے عید محمد کہہ کر پکارتا' میرے دل پر گھونسا سا لگتا' میں اپنی نظروں میں گر جاتا۔... مجھے وہ عیدو یاد آجاتا تھا جو اپنی ماں کی انگلی تھام کر گلی گلی صدا لگاکر ایک ایک پیسہ جمع کرتا تھا۔ میں ماضی کی ان گھٹیا یادوں کو صفحۂ ذہن سے حرفِ غلط کی طرح مٹا ڈالنا چاہتا تھا۔ اب تک کے جھمیلوں نے اس طرف سوچنے ہی نہیں دیا تھا۔ اب ذرا فرصت ملی تو خیال آیا کہ کوئی ایسا نام اختیار کیا جائے جس کے ساتھ سیٹھ کے لفظ کا سابقہ بھی اچھا لگے اور اس نام کے ذریعے کسی اچھی نسل کا اظہار بھی ہوتا ہو۔ یہ نہایت بچکانہ اور بھونڈی خواہش تھی لیکن تھی تو خواہش ہی نا۔ اور خواہشات کی تکمیل کا ہنر مجھے خوب آتا تھا۔ ذرا سے غور کے بعد میں نے اپنا نام شکیب علی خاں تجویز کرلیا۔ اس نام سے میرا پٹھان ہونا بھی ظاہر ہوتا تھا جو میرے نزدیک سید کے بعد دوسری اعلیٰ ذات ہے'

بھی کہ سیٹھ صاحب کا نام برکت علی خان تھا اور میرے تعلیمی کاغذات وغیرہ میں ولدیت انہی کی لکھی ہوئی تھی۔ اب صرف نام کو تبدیل کرانے کا مسئلہ تھا۔ ظاہر ہے ولدیت تو تبدیل کرانے سے رہا۔ میں نے اخبارات کے ذریعے مشتہر کردیا کہ آئندہ سے مجھے شکیب علی خان ولد برکت علی خان لکھا اور پکارا جائے۔ دروازے پر لگی سیٹھ برکت علی کی تختی بھی اتروا کر اپنے نام کی تختی لگوا دی۔

ان چند ضروری کاموں سے نمٹنے کے بعد میں کاروبار کی طرف متوجہ ہوا۔ میرا عقیدہ ہے کہ کاروبار وہ کرو جس کا تجربہ ہو' کارندے ایسے تلاش کرو جن پر بھروسا نہ ہو' اکثر بھروسے کے ہی لوگ دھوکا دیتے ہیں۔ سیٹھ صاحب چمڑے کے بہت بڑے بیوپاری تھے۔ کھالوں سے چمڑہ بنانے کی کئی فیکٹریاں تھیں۔ اس کے علاوہ چمڑے کی جیکٹیں' پرس وغیرہ بنا کر باہر بھی بھیجتے تھے۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ یہ بہت منافع بخش کاروبار ہے۔ اس کاروبار کا تجربہ مجھے قطعی نہیں تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ یہ روایتی سا کاروبار مجھے پسند بھی نہیں تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس کاروبار کو یکدم ختم کیسے کیا جائے۔ اتنے بڑے اسٹاف کو بے روزگار کرکے میں کسی انجانی مصیبت میں گرفتار ہو سکتا تھا لہٰذا یہی سوچا کہ اس کاروبار کو آہستہ آہستہ ختم کیا جائے اور اپنے ذوق کی تکمیل کے لئے زیادہ توجہ دوسرے کسی کاروبار پر دی جائے۔

میں نے ان فیکٹریوں کے کارکنوں کو نکال باہر کرنے کے بجائے اہم عہدوں پر اپنے مطلب کے آدمی بٹھا کر پابندیاں اتنی سخت کردیں کہ کارکن خود نوکری چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں اور یوں یہ کاروبار سمٹتے سمٹتے نقطۂ اختتام تک پہنچ جائے۔ اور پھر مجھے ایسی کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ دو پیسے مل ہی رہے تھے۔

میں نے بچپن میں کچھ دن حاجی صاحب کے گیراج پر گزارے تھے' مجھے کاروں کی پہچان اور تجربہ تھا۔ اب میں دوبارہ تو مکینک بن نہیں سکتا تھا۔ میں نے گیراج کھولنے کے بجائے شہر کے تین فیشن ایبل علاقوں میں کاروں کے شوروم کھول لئے' اس کے ساتھ ہی اسپیئر پارٹس کے کاروبار کی بھی داغ بیل ڈال دی۔ کراچی جیسے بڑے شہر میں کاروں کے شوقین بہت۔ تھوڑے ہی دن میں میرا کاروبار چل نکلا۔ میرا اندازہ ایک مرتبہ پھر درست نکلا۔ میں نے چند مہینوں ہی میں ہزاروں [illegible] لاکھوں کما لئے۔ اب میں سیٹھ شکیب علی خان کہلانے لگا۔
تمام کاروبار ملازموں نے سنبھال رکھا تھا۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے مختلف شوروم پر محض نگرانی اور وقت گزاری کے لئے چلا جاتا تھا۔ اس کام میں مزید تجربے کے بعد میں نے مختلف ماڈل کی کاروں کی ایجنسی بھی حاصل کرلی اور دفتر قائم کرکے ٹھاٹ سے منیجنگ ڈائریکٹری کی کرسی سنبھال لی۔ یہ صاف ستھرا کاروبار میرے لئے آئیڈیل ثابت ہوا۔

میں اپنی الجھنوں میں پڑ کر بیگم صاحبہ کی جانب سے بے فکر ہو گیا تھا۔ ان کو اسپتال میں داخل ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ تھوڑے دن تک ان کی حالت کے بارے میں ڈاکٹر [illegible] آتے رہے۔ پھر شاید میری "سرد مہری" کی وجہ سے ان [illegible] آنا بھی بند ہو گیا تھا۔ اب سال بھر گزر جانے کے بعد میرے ذہن میں اندیشوں نے کروٹ لی۔ میں نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ بیگم صاحبہ کی دماغی حالت درست ہو گئی ہو اور وہ کسی دن گھر چلی آئیں۔ ویسے تو ایک کمزور بوڑھی عورت سے مجھے کیا خطرہ ہو سکتا تھا لیکن خواہ مخواہ میں کسی الجھن میں کیوں پڑتا۔ میں نے سوچا۔ اب اس کا بھی انتظام کرلیا جائے۔

بیگم صاحبہ کی خیریت دریافت کرنے میں ایک روز گدو بندر جا پہنچا۔ ڈاکٹر ادریس کا تبادلہ ہو چکا تھا' ان کی جگہ اب کوئی ڈاکٹر نسیم تعینات تھے۔ پہلی نظر میں وہ مجھے کام کے آدمی لگے۔ انہوں نے مجھے عام سا آدمی سمجھ کر بے اعتنائی برتی لیکن جیسے ہی ان کو میری حیثیت کا علم ہوا وہ خوشامد پر اتر آئے۔ ان کی یہ ذہنیت مجھے اچھی لگی۔ دولت کے لالچی لوگ بہت کام کے ہوتے ہیں۔ یہ صاحب بھی آئندہ میرے بہت کام آئے۔ ان کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ کی حالت بالکل ٹھیک تو نہیں کہی جا سکتی لیکن اب وہ خطرناک پاگلوں کی فہرست میں شامل نہیں۔ کبھی کبھی وہ چڑچڑے پن کا شکار ہو جاتی ہیں ورنہ عموماً ان کا موڈ خوش گوار رہتا ہے۔ ممکن ہے وہ چند مہینوں میں بالکل ٹھیک ہو جائیں۔

ڈاکٹر نسیم نے مجھے یہ معلومات خوش خبری کے طور پر فراہم کیں لیکن میں تو تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔
"کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں جناب! اب ایسی خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اس بہانے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اپنے عزیزوں کو دیکھ کر اب ان کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔"

میں ڈاکٹر نسیم کے ساتھ بیگم صاحبہ کی بیرک کی طرف روانہ ہوا۔ ہم مختلف کمروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے زنانہ وارڈ میں داخل ہوئے۔ ایک کوٹھری میں سلاخوں کے پیچھے بیٹھی ہوئی کسی عورت کو دیکھ کر مجھے پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی' یہ بیگم صاحبہ تھیں۔ ان کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک ٹکڑا تھا جسے وہ الٹ پلٹ کر دیکھنے میں محو تھیں۔

"کہیں سے ان کے ہاتھ یہ چمڑے کا ٹکڑا لگ گیا ہے۔ نہ جانے اس سے ان کی کون سی یادیں وابستہ ہیں۔ اسے ہاتھ سے رکھتی ہی نہیں' تقریباً مہینہ بھر سے یہ ہیں اور چمڑے کا یہ ٹکڑا" ڈاکٹر نے مجھے بتایا۔

جیسے ہی بیگم صاحبہ کی نگاہ مجھ پر پڑی' ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ کچھ دیر وہ مجھے خاموش آنکھوں سے دیکھتی رہیں پھر جیسے انہیں سب کچھ یاد آگیا ہو۔ وہ پھٹ پڑیں "تو

آگیا' میرے شوہر کے قاتل تو سمجھ رہا تھا کہ میں مرگئی۔ دیکھ! میں زندہ ہوں" میں گھبرا کر فوراً سلاخوں سے پیچھے ہٹ گیا۔ پاگل کا کیا بھروسا معلوم کیا کر دے۔

"ویسے تو میرا بیٹا بھی تو ہے۔ آ میں تیری بلائیں تو لے لوں' کتنے دن بعد آیا ہے تو۔"

میں اتنا کچا نہیں تھا کہ ان کے اس دام میں آجاتا۔ میں اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔

"آیئے ڈاکٹر صاحب چلیں۔ ان کی حالت توجوں کی توں ہے۔"

میں ڈاکٹر کا انتظار کئے بغیر پلٹ آیا۔ مجھے جاتا دیکھ کر ڈاکٹر بھی میرے ساتھ ہولیا۔ بیگم صاحبہ کی چیخیں بہت دیر تک میرا تعاقب کرتی رہیں۔

"یہ قاتل والا کیا معاملہ ہے؟" ڈاکٹر نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ تو معاملہ ہے صاحب! شوہر کی وفات کے صدمے نے ان کا یہ حال کیا ہے۔ سمجھتی یہ ہیں کہ شاید میں نے علاج میں کوتاہی برتی اور وہ مر گئے۔ لہٰذا ان کی نظر میں میں قاتل ہوں۔"

"اور یہ چمڑے کے ٹکڑے کا معمّا بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اسے ہر وقت ہاتھ میں کیوں رکھتی ہیں۔"

"ان کے شوہر یعنی میرے والد چمڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ شاید انہی یادوں کو کریدتی رہتی ہیں اس چمڑے کے ٹکڑے کے ذریعے۔"

"ہوں!" ڈاکٹر نے گہری سانس لی۔

"ویسے ڈاکٹر صاحب' مجھے ان سے ہمدردی ہے اور مجھے ہی کیا' ان سے تو غیروں کو بھی ہمدردی ہوگی۔ لاکھوں میں کھیلنے والی عورت کا آج کیا حال ہے لیکن اس ہمدردی کی علامت کا اپنے گھر میں رکھنا خطرے سے خالی نہیں۔ معاشرے میں میرا ایک مقام ہے' ایک حیثیت ہے۔ میں انہیں لئے لئے کہاں پھروں گا۔ میں صاحب ثروت ہوں۔ ان پر پیسہ خرچ کرسکتا ہوں' وقت اور توانائی نہیں۔ آپ ان کو یہاں مستقل رکھنے کی صورت نکالئے' میں ماہانہ ایک مناسب رقم آپ کو بھیجتا رہوں گا۔ پہلی قسط حاضر ہے۔"

میں نے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ ڈاکٹر کی میز پر سجا دیئے۔

"اس کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کا حکم میرے لئے بہت تھا" ڈاکٹر نے نوٹوں کو میز سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا خدا حافظ۔ ہر مہینے میرا آدمی آپ کے پاس آئے گا" ڈاکٹر مجھے چھوڑنے میری گاڑی تک آیا۔

☆☆☆

میں نے سخت محنت سے اپنا مستقبل آباد کیا تھا۔ اب میں صاحب ثروت' معزز گھرانے کا دولت مند کنوارا تھا۔ میں کاروباری مصروفیات میں گھرا ہوا پرندہ ضرور تھا لیکن پنجرے کا قیدی پرندہ بھی آزادی کے لئے اپنے پروں کو تیلیوں سے ٹکراتا ضرور ہے۔ مرد کی آزادی عورت کی قید میں مضمر ہے۔ میری زندگی اس قید سے اب تک آزاد تھی۔ میں اپنی تنہا شاموں سے اکتانے لگا تھا۔ میں نے شہر کے مختلف کلبوں کی رکنیت حاصل کرلی۔ ان کلبوں میں ہر طبقۂ خیال کے رئیس زادوں اور رئیس زادیوں سے میری ملاقاتیں رہنے لگیں۔ کچھ وقت کٹ جاتا' دنیا کو دیکھنے کا موقع بھی ملتا۔ بہت سے کاروباری مسائل بھی یہیں طے ہوتے۔

ان کلبوں کا رخ کرنے کے بعد میری شخصیت کا ایک اور رخ میرے سامنے آیا اور وہ یہ کہ خواتین کے لئے میری شخصیت میں ایک خاص کشش ہے۔ ہر عمر اور ہر قماش کی عورت مجھے اس نگاہ سے دیکھتی جس کا مطلب سمجھنا کسی مرد کے لئے بھی دشوار نہیں ہوتا۔ اپنی اس مقبولیت نے مجھے ایک اور ہی ہوا سے آشنا کیا۔ مشہور ہے کہ عشق کرنے کے لئے بڑے دل ہی کی نہیں بڑے دماغ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ دل کا تو مجھے معلوم نہیں البتہ میں بڑے دماغ کا مالک ضرور ہوں جس کا ثبوت میری زندگی کی وہ گتھیاں ہیں جنہیں میں نے چٹکی بجاتے حل کرلیا۔

اس دور کے کئی شاندار معاشقے میری زندگی کا حاصل ہیں۔ میں اس رنگ و بو کے سیلاب میں ڈوب کر عزت نہیں تو دولت ضرور گنوا بیٹھتا' اگر زبیدہ میری زندگی میں نہ آئی ہوتی۔

زبیدہ کو میں نے پہلی بار اپنے شوروم میں دیکھا تھا۔ میں کسی کام سے صبح ہی صبح شوروم پہنچ گیا۔ اپنے دفتر میں بیٹھا حساب کتاب میں مصروف تھا کہ نیلے رنگ کی مزدا میں ایک لڑکی وہاں پہنچی۔ میرے آفس کے سامنے کی دیوار شیشے کی تھی۔ وہاں سے وہ لڑکی مجھے صاف دکھائی دے رہی تھی' وہ میرے سیل مین سے کسی بات پر بحث کررہی تھی۔ کبھی کسی گاڑی کا دروازہ کھول کر دیکھتی' کبھی کسی کی باڈی ٹھونک بجا کر دیکھتی۔ دور سے اس کا دراز قد اور چمپئی چہرے پر غصے میں بھی مسکراہٹ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ایک ملازم سے پوچھا "کون ہے یہ لڑکی؟"

"معلوم نہیں سر! تین دن ہوگئے ہیں اسے آتے ہوئے۔ تمام گاڑیوں کی قیمت پوچھ چکی ہے' لینا دینا کچھ ہے نہیں۔ یا تو کوئی کھسکی ہے یا بس یونہی....."

"شٹ اپ! جاؤ' اس سے کہنا آپ کو سیٹھ صاحب بلا رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر میں وہ میرے کمرے میں تھی "فرمایئے' کہاں ہیں آپ کے سیٹھ صاحب؟"

"تشریف رکھئے۔ میں نے ہی زحمت دی ہے آپ کو۔"

"مگر وہ آپ کا ملازم تو کہہ رہا تھا کہ سیٹھ صاحب بلا رہے ہیں۔"

"سیٹھوں کے کیا سینگ ہوتے ہیں؟ کیا میں سیٹھ نہیں ہو سکتا؟"

"اچھا! چلئے آپ ہی ہوں گے۔ اب فرمایئے کیا بات ہے؟"

"ہاں یہ ہوئی نہ بات۔ میں نے سنا ہے کہ تین دن سے آپ ملازموں کی جان کھا رہی ہیں۔"

"جان کھا رہی ہیں سے کیا مطلب ہے آپ کا؟ یہ دکان ہے۔ دکان پر بھاؤ تاؤ تو ہوتا ہی ہے۔"

"بھاؤ تاؤ ضرور کیجئے لیکن کچھ خریدئے بھی تو۔"

"واہ صاحب واہ! پسند آئے نہ آئے کچھ خریدئے بھی تو"... اس نے تقریباً میری نقل اتارتے ہوئے کہا۔

مجھے خواتین کی عمریں جاننے کا شوق ہے نہ تجربہ۔ لیکن اس کی شوخی بتا رہی تھی کہ اس نے نیا نیا کالج چھوڑا ہے۔ کار خریدنے آئی ہے اور اکیلی۔ یقیناً کسی بڑے گھر کی ہو گی لیکن سادہ لباس اور سلیقے سے دوپٹا اوڑھنے کا انداز بتاتا ہے کہ اس کا تعلق کسی شریف گھرانے سے ہے' میں نے سوچا۔

"کس سوچ میں پڑ گئے آپ؟ کوئی اور تفتیش کرنی ہے یا مجھے اجازت ہے؟" اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے ارے کہاں۔ میں نے کولڈ ڈرنک منگائی ہے۔"

"دکانداری کا یہ حربہ بہت پرانا ہو گیا ہے مسٹر! کوئی اور طریقہ اپنایئے' خدا حافظ۔"

وہ اٹھ کر جانے ہی والی تھی کہ ملازم کولڈ ڈرنک لے کر آ گیا۔

"پلیز! اب یہ آ ہی گئی ہے تو اسے پی کر جایئے گا" میں نے بوتل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

یقین جانئے یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی لڑکی میں دلچسپی لے رہا تھا ورنہ میرے ساتھ پہل ہمیشہ ادھر سے ہوئی ہے۔ اس لئے بات آگے بڑھاتے ہوئے کچھ گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ وہ آدھی بوتل ختم کر چکی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کے بعد تو کوئی بہانہ بھی نہیں رہے گا اور یہ اٹھ کر چلی جائے گی۔ مجھے کچھ بات کرنی چاہئے۔

"مجھے شکیب علی خاں کہتے ہیں۔ آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔"

"پوچھنے پر تو کوئی پابندی نہیں البتہ میں بتاؤں نہ بتاؤں یہ میری مرضی۔"

"مجھے یقین ہے آپ اتنی بد اخلاق نہیں ہوں گی۔"

"انسان سوچ پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ آپ کوئی بھی رائے قائم کر سکتے ہیں" اس نے بڑے منطقی انداز میں کہا۔

واللہ! بڑا شوخ بدمعاش ہے۔ شکیب علی خاں اسے پچھاڑنا تمہارے بس سے باہر ہے' میں نے دل ہی دل میں کہا۔

پھر میں نے بات کا رخ بدلا "خیر آپ کی مرضی' ویسے گاڑی کس قسم کی چاہئے آپ کو؟"

"جو چلتی بھی ہو اور سستی بھی ہو!" اس نے شانوں کو جھٹکا دیا۔

"تمام گاڑیاں آپ ہی کی ہیں' کوئی سی بھی پسند کر لیں۔"

"جی!"

"میرا مطلب ہے۔ یہ گاڑیاں گاہکوں ہی کے لئے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ سب کی سب میرے بجٹ سے باہر ہیں۔"

"کتنی رقم خرچ کر سکتی ہیں آپ؟"

"پچاس ہزار تک۔"

"آپ ایسا کیجئے' کل صبح دس بجے تشریف لایئے۔ میرے پاس ایک گاڑی ہے۔ کل دیکھ لیجئے گا' آپ کو پسند آئے گی۔"

"ٹھیک ہے جناب! کل سہی۔"

"کس نام سے یاد رکھوں میں آپ کو؟" میں نے پھر وہی سوال کیا۔

"زبیدہ' زبیدہ خان" وہ مسکرا دی۔

مجھے یاد نہیں' کوئی دن میں نے اتنی بے چینی سے گزارا ہو جیسا اس کے جانے کے بعد۔ میں بہت مضبوط اعصاب کا آدمی ہوں۔ بڑی سے بڑی پریشانی مجھ سے ٹکرا کر واپس پلٹ جاتی ہے لیکن زبیدہ نے مجھے توڑ پھوڑ دیا تھا۔ ہر شخص کا کوئی نہ کوئی آئیڈیل ہوتا ہے' شاید میرا آئیڈیل زبیدہ تھی جو بہار کے جھونکے کی طرح میرے ویرانۂ حیات میں آ گئی تھی۔ میں فطرتاً لڑکیوں میں دلچسپی لینے والا آدمی نہیں ہوں۔ ذوقِ جمال کے اعتبار سے گرا ہوا ہوں لیکن حسب نسب کا بھوکا ہوں اور زبیدہ کے ماتھے پر کوئی لکیر تھی جو اس کے اعلیٰ نسب ہونے کی پہچان تھی۔ وہ بھی میری طرح خان تھی مگر میری اصلیت اس پر کھل ہی نہیں سکتی تھی۔ میں اپنے ماضی کو دفن کر چکا تھا اور وہ میری خالہ زاد شہزادی' فقیر کی اولاد' کشکول بدست' اس کا میرا کیا جوڑ' میں نے نہایت دکھ سے سوچا اور آنکھوں میں رات بتا دی۔

دوسرے دن ٹھیک دس بجے میں شو روم پہنچ گیا۔ میں بے چینی کے عالم میں تھا۔ کبھی سوچتا وہ آ جائے گی۔ کبھی خیال گزرتا نہیں آئے گی۔ اسی کشمکش میں تھا کہ نیلے رنگ کی مزدا شو روم کی پارکنگ میں داخل ہوئی۔

وہ عجب شانِ بے نیازی سے میرے آفس کی طرف آ رہی تھی۔ شہابی رنگ پر گلابی پیرہن۔ دھوپ میں شفق کی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ آنکھوں پر لگا گوگو چشمہ اس نے ایک جھٹکے سے غلافی آنکھوں سے الگ کیا۔ فضا میں آواز کا رس گھولتی ہوئی میرے کمرے میں داخل ہوئی۔

"السلام علیکم سیٹھ صاحب!"

"وعلیکم۔ ویسے میرا خیال ہے کہ میں آپ کو اپنا نام بتا چکا ہوں۔"

"سیٹھ کوئی نام رکھ لے سیٹھ ہی رہتا ہے۔ بزرجمہر سہی جولن سہی۔ آپ کل کسی گاڑی کا ذکر کر رہے تھے۔ آگئی؟"

"ابھی ابھی پہنچی ہے۔ ابھی تو میں نے خود بھی جی بھر کر نہیں دیکھا۔ ذرا توقف کیجئے" میں نے ہمت کرکے اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملائیں۔

"آج کولڈ ڈرنک نہیں منگایئے گا؟"

"نہیں' آج کہیں باہر چل کر پئیں گے۔"

"میں کسی اجنبی کے ساتھ تنہا کہیں بیٹھنے کی قائل نہیں۔"

"مس زبیدہ! ہر کوئی پہلے پہل اجنبی ہوتا ہے۔ اجنبیت کی یہ دیواریں ہم جیسے انسان ہی گراتے ہیں۔ رہی تنہائی کی بات تو میں وہ تنہا کوئی ہوں کہ آپ میرے ساتھ جہاں کہیں ہوں گی تنہا ہی ہوں گی تاوقتیکہ آپ مجھے ایک فرد' ایک انسان' ایک آشنا' ایک دوست نہ سمجھ لیں۔ آخر یہاں بھی تو آپ میرے ساتھ بیٹھی ہیں نا۔"

"یہاں کی بات اور ہے' یہ آپ کا آفس ہے۔"

"پھر بھی' ملازموں کے سامنے کچھ اچھا نہیں لگتا یوں بیٹھے رہنا۔"

"اور ساتھ جائیں گے تو اچھا لگے گا؟"

"نہ جایئے ساتھ۔ آپ لبرٹی کی طرف چلئے' میں آ رہا ہوں۔"

"آخر کیوں؟"

"مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ آپ مجھ پر بھروسا کریں۔ پلیز انکار نہ کیجئے گا' شاید میں آپ کو اپنے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتا سکوں کہ آپ مجھے آئندہ تنہا نہ سمجھیں۔" اس کے گال گلابی جاڑا بن گئے۔ اس کی آنکھیں یوں جھک گئیں جیسے بیلے کی نیم بند کلیاں۔ اس کی خاموشی رضامندی کا اذن دے رہی تھی۔

"میں یہ پیسے لائی تھی گاڑی کے لئے" اس نے شانے پر جھولتے ہوئے پرس کو میری میز پر رکھ دیا۔

"فی الحال اسے رکھ لیجئے۔ واپس آکر شاید ضرورت پڑے۔ اب آپ لبرٹی کی طرف چلئے' میں پہنچتا ہوں۔"

وہ جیسی بیٹھی تھی ویسی ہی اٹھ گئی۔ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ میری تجویز پر عمل کرے گی یا نہیں۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف جا رہی تھی۔ گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو مجھے ہوش آیا۔ اس کی گاڑی شوروم سے باہر نکل رہی تھی۔

"میں لبرٹی پہنچا تو وہ گاڑی پارک کرکے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے میرا انتظار کر رہی تھی۔

"ہیلو!"

"ہیلو' آ گئے آپ۔"

"آیئے" میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

اب اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نہیں تھے۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ اس کی شوخی پھر لوٹ آئی تھی۔ اس نے اسی بے نیازی سے کار سے قدم نیچے رکھا جس انداز دلربائی سے وہ آفس پہنچی تھی۔

"ایک بات کہوں۔ آپ گھبرائی ہوئی اچھی نہیں لگتیں۔ اسی طرح مطمئن' شوخ اور شگفتہ رہا کریں" میں نے ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کی کمر کے گرد ہلکا سا حلقہ بنایا۔ وہ لڑکھڑائی اور پھر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

فیملی روم میں اس وقت قطعی رش نہیں تھا۔ اکا دکا جوڑا خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ ایک آدھ نے ہماری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا اور بس!

"کیا پئیں گی؟" میں نے نسبتاً ایک الگ تھلگ کیبن میں بیٹھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"جو آپ منگا لیں۔"

"نہیں' آج آپ بتائیں۔"

"کولڈ ڈرنک" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"اچھا تو آپ میری چھیڑ بنا رہی ہیں۔"

وہ چپ رہی' میں نے ملک شیک کا آرڈر دے دیا۔ ملک شیک آنے تک مسلسل خاموشی ہم دونوں پر طاری رہی۔ آخر میں نے اس خاموشی کو توڑا۔

"دیکھو زبیدہ' نہ تو یہ ہوٹل تمہارے شایانِ شان ہے اور نہ ہی یہ ملک شیک جو تم پی رہی ہو۔ یہاں تو میں تمہیں اس وقت اس لئے لایا ہوں کہ تکلف کے اس بھنور سے تم اپنے آپ کو آزاد کر سکو جو ہم دونوں کے درمیان حلقہ در حلقہ موجود ہے۔ اجنبیت کی اس دیوار کو گرا سکو جس کے مسمار ہونے کے بعد دو انسان ایک دوسرے کو سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ وہ احوال مجھ سے کہہ سکو جو دوستی اور اپنائیت کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ تمہارے بارے میں میں اب تک کچھ بھی نہیں جانتا' بس تم اچھی لگتی ہو۔ کچھ اپنے بارے میں بتاؤ تاکہ اور اچھی لگنے لگو۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بری لگنے لگوں۔"

"نہیں' ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ تم یقین کرو یا نہ کرو مگر یہ حقیقت ہے کہ میرے پاس دولت بھی ہے' جوانی بھی۔ لیکن میں نے کسی لڑکی کو اس قدر ٹوٹ کر نہیں چاہا جیسے تمہیں۔ کوئی بات تم میں ضرور ہے جو میری روح نے محسوس کی ہے۔ کیا اب بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی؟"

"کیا بتاؤں؟"

"کچھ بھی۔ وقت گزاری ہی کے لئے سہی۔"

"شکیب صاحب! آپ نہ جانے مجھے کیا سمجھ رہے ہوں گے۔ میں ایک اوسط درجے کے گھرانے کی دکھی سی لڑکی ہوں۔ کسی

طرح بھی آپ کے سائے کے برابر بھی نہیں۔ میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ بھائی کے ساتھ رہتی ہوں۔ ان کا نام یوسف علی خان ہے۔ وہ کسٹم آفیسر ہیں۔ کماتے بہت ہیں لیکن سب کچھ بھابی کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ بھابی مجھے بوجھ سمجھتی ہیں۔ میرے بھائی مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ یہ گاڑی بھی انہی کی ہے جو میں استعمال کرتی ہوں۔ وہ جیب خرچ کے لئے جو کچھ مجھے دیتے ہیں' وہی سب کچھ جمع کر کے میں گاڑی خریدنے آپ کے شوروم میں آئی تھی۔ میں نے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کیا ہے۔ اب سوچتی ہوں' کہیں نوکری کرلوں۔ بس۔ یا اور کچھ باقی ہے مجھے سمجھنے کے لئے۔"

"تم نے اپنے خاندان' میرا مطلب ہے حسب نسب کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"کیوں' کیا کسی تعلق کے لئے صرف انسان ہونا کافی نہیں؟"

"شاید ہو لیکن مجھ میں ایک ہی کمزوری ہے' میں انسانوں کو ذات پات کے ترازو میں تولتا ہوں۔ اسے میری خامی سمجھ کر معاف کر دینا۔ انسان تو فقیر بھی ہوتے ہیں لیکن ان میں اور تم میں بہت فرق ہے۔"

"تم بھی بھائی جان کی طرح ہو۔ وہ بھی اسی طرح باتیں کرتے ہیں۔ مجھے تو اس سلسلے میں کوئی دلچسپی نہیں البتہ بھائی جان کی زبانی میں نے سنا ہے کہ ہم لوگ یوسف زئی پٹھان ہیں۔ ہمارے اجداد کبھی افغانستان سے آئے تھے۔"

"اچھا! پھر تو دوستی پکی' میں بھی یوسف زئی پٹھان ہوں" میں نے بے خیالی میں اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ اس نے گرمجوشی سے اس کا جواب دیا۔

"کیا خیال ہے' کھانا یہیں کھا لیا جائے؟"

"نہیں' کھانا نہیں۔ بھائی جان لنچ کرنے گھر آتے ہیں' اگر میں نہ پہنچی تو انہیں فکر ہو جائے گی۔"

"اور گاڑی؟" میں نے یاد دلایا۔

"ہاں۔ سنجیدگی سے بتایئے۔ کوئی گاڑی آئی ہے؟"

"میں نے ایسے ہی تھوڑی بلایا تھا۔ کل آیئے اور گاڑی اٹھا لیجئے۔"

"یعنی کل پھر آنا ہوگا؟"

"اب تو شاید روز آنا پڑے گا۔"

ہم دونوں ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے اسے اپنی ایجنسی کا پتا دیا کہ وہ کل شوروم پر نہیں بلکہ یہاں مجھ سے ملے' گاڑی وہیں پہنچ جائے گی۔ ایجنسی کا پتا میں نے اسے لئے دیا کہ وہاں نسبتاً زیادہ تنہائی تھی۔ میرا الگ کمرا تھا جہاں آرام سے بیٹھ کر باتیں ہو سکتی تھیں۔

○☆○

میں ابھی دفتر پہنچا ہی تھا کہ پی۔ اے نے اطلاع دی۔ "سر! کوئی مس زبیدہ ہیں آپ سے ملنے...

"فوراً بھیجو۔"

"ہیلو زبیدہ' کیسی ہو؟"

"ٹھیک۔ آپ سنایئے"

"ارے کھڑی کیوں ہو' بیٹھو۔"

وہ مہمانوں کے لئے بچھائے گئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں بھی اخلاقاً اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے برابر جا بیٹھا۔

"زبیدہ! کل تمہارے جانے کے بعد میں نے تمہارے بارے میں بہت سوچا۔ کچھ معاملات اپنے ذہن میں' میں نے طے کئے ہیں۔ اگر تمہیں بھی ان میں شریک کر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں بلکہ تمہاری شرکت کے بغیر تو یہ معاملات طے ہو ہی نہیں سکتے۔"

"کیسے معاملات' کیسی شرکت؟ بڑے معمے حل کراتے ہیں آپ۔"

"تمہیں نوکری چاہئے نا' میرا مطلب ہے' اگر نوکری مل جائے تو کر لو گی؟"

"فی الحال تو کار چاہئے۔"

"اگر نوکری کار والی ہو تو؟"

"کیا ڈرائیوری دلوا رہے ہیں کہیں؟"

"میرے دفتر میں سیلز منیجر کی جگہ خالی ہے۔ اس پوسٹ کے لئے تجربے کی ضرورت ہے لیکن میں یہاں موجود ہوں' دوسرے لوگ ہیں جو تمہاری مدد کریں گے۔ تھوڑے دن میں تمہیں تجربہ ہو جائے گا۔ فی الحال ہم تمہیں سات ہزار روپے اور آنے جانے کے لئے گاڑی کی سہولت دے سکتے ہیں۔"

اس پیش کش کو سن کر اس کا خوش ہونا لازمی تھا۔ کچھ دیر اس نے اسے میرا احسان قرار دیا۔ اس پیش کش کو قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ بالآخر وہ رضامند ہو گئی۔

"کل سے اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو سکتی ہو؟"

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں نے ملازمت کی یہ پیشکش اس لئے کی تھی کہ اس طرح اس سے روز ملاقات کی خواہش بھی پوری ہو سکتی تھی اور مسلسل ملاقاتوں سے اسے سمجھنے میں بھی مدد مل سکتی تھی۔ میں نے اسے شریک حیات بنانے کا قصد کر لیا تھا۔ اس لئے اچھی طرح چھان پھٹک کر لینا چاہتا تھا۔ ابھی میں صرف اس سے ملا تھا' اس کے بھائی سے مل کر مزید اندازے لگانے تھے۔ زبیدہ کے دل میں گھر بنائے بغیر ان میں سے کوئی بھی خواہش پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ دل میں جگہ پیدا کرنے کے لئے قربت کی ضرورت ہوتی ہے۔ قربت کے بہانے میں نے ڈھونڈ لئے تھے۔

وہ بڑی باقاعدگی سے دفتر آتی۔ جب تک دفتر میں رہتی کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی۔ بہت جلد اس نے اپنے کام میں

مہارت حاصل کرلی تھی۔ شروع شروع میں وہ ہر بات اور کام کے لئے مجھ سے رجوع کرتی تھی' پریشان ہو جاتی تھی لیکن اب اسے اعتماد حاصل ہو گیا تھا حالانکہ ابھی صرف ایک مہینہ گزرا تھا۔

ہم دونوں لنچ کے لئے ساتھ ہی باہر جاتے تھے۔ اب ہمارے درمیان تکلف کی کوئی دیوار نہیں تھی۔ البتہ ان بے تکلفانہ ملاقاتوں سے دفتر والوں میں چہ میگوئیاں پیدا ہونے لگی تھیں۔ عورتوں کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بھی دیکھ لیتی ہیں۔ میں نے اپنے سامنے ہونے والے کسی مظاہرے پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا لیکن زبیدہ نے عورت ہونے کے ناتے ان چہ میگوئیوں کو محسوس کر لیا تھا۔ ایک روز لنچ سے واپس آتے ہوئے' راستے میں اس نے تشویش کا اظہار کیا۔

"شکیب! اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"کیا برداشت نہیں ہوتا' کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"تم تو ایم ڈی صاحب ہو' دروازہ بند کر کے آنکھیں اور کان بند کر لیتے ہو' دفتر والوں کی نگاہوں کا سامنا تو مجھے کرنا پڑتا ہے۔"

اس نے یہ الفاظ کہتے ہوئے میرے شانے پر اپنا سر ٹکا دیا۔ اس کی آواز میں بہت درد تھا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ کوئی تشویش ناک بات ہے۔

"میں سمجھا نہیں زبیدہ! کھل کر بات کرو' کیا کہا ہے تم سے دفتر والوں نے؟"

"مجھ سے کیا کہنا ہے۔ دن بھر میرے اور تمہارے بارے میں طرح طرح سے اشارے کنایوں میں باتیں ہوتی ہیں۔ میری روح دن بھر زخمی ہوتی ہے۔ کیا مجھے اسی تماشے کے لئے تم اس دفتر میں لائے تھے؟ کل سے میں تمہارے ساتھ لنچ کے لئے نہیں آؤں گی۔ اگر پھر بھی لوگ کہانیاں گھڑتے اور سناتے رہے تو میں یہ نوکری چھوڑ دوں گی۔"

"کیا بد تمیزی ہے۔ حالات کا مقابلہ اس طرح نہیں کیا جاتا۔" میں نے اسے پیار سے ڈانٹا۔

"نہیں شکیب میری تمہاری محبت صرف محبت نہیں کہلاتی۔ ہم دونوں میں اتنا فرق ہے کہ لوگ اسے لالچ کہتے ہیں۔ اور مجھے ایسی ویسی لڑکی سمجھتے ہیں۔ تم ان سب کا منہ کیوں بند نہیں کر دیتے؟"

"میں لوگوں کے منہ کیسے بند کر سکتا ہوں؟"

"تم بھائی جان سے کیوں نہیں ملتے؟" اس نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

میرے پاؤں گاڑی کے بریک پر چلے گئے۔ گاڑی آہستہ ہوئی اور پھر رک گئی۔

"کیوں' گاڑی کیوں روک لی؟" وہ گھبرا گئی۔

"اس لئے کہ آج وہ بات تم نے کہلوائی ہے جو میں چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا' تم اپنے منہ سے یہ بات کہو۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میں کتنے دن میں تمہارے دل میں آباد ہوتا ہوں۔ میری سوچ تمہاری سوچ کب بنتی ہے۔ تم میری آنکھوں سے خواب کب دیکھتی ہو' آج ایک ہی موسم ہم دونوں پر طاری ہے۔ اب سب کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔ میں تمہارے بھائی سے تمہیں مانگ لوں گا۔"

اس نے دوبارہ میرے شانوں پر سر رکھ دیا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

دفتر پہنچنے کے بعد میں نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا۔

"زبیدہ! آج شام تم اپنے بھائی اور بھابی کے ساتھ میرے گھر تو' میرے ساتھ چائے پیو۔"

"ہم لوگ آئیں! اتنا تو آپ کو چاہئے" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن ایسا میں ایک مصلحت کے تحت کر رہا ہوں۔ ابھی کوئی بات نہیں چھیڑنی ہے۔ ابھی تو محض یونہی تعلق خاطر کے لئے۔ دراصل میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے مل لیں۔ میں بالکل تنہا رہتا ہوں' اس سے انہیں واقفیت ہو جائے' ... مطلب یہ کہ کسی وقت میں ان سے اپنی خواہش کا اظہار کروں تو وہ میرے بارے میں پہلے سے کوئی اچھی بری رائے رکھتے ہوں۔"

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ میں گھر میں آپ کا اتنا ذکر کرتی ہوں کہ وہ کوئی نہ کوئی رائے قائم کر چکے ہوں گے۔"

"پھر بھی' جو میں نے سوچا ہے' وہی مجھے کرنے دو" میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا کرنا ہو گا؟" اس نے سوال کیا۔

"تم ابھی گھر چلی جاؤ اور بھائی جان کو میری دعوت پہنچا دو۔"

"نا بابا نا۔ یہ کام تم ہی کرو' مجھ سے یہ سب کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

"پاگل مت بنو۔ اچھا ایسا کرو' تم گھر جا کر ذکر تو کرو۔ شام کو میں بھی ٹیلی فون کر لوں گا۔"

میں اور زبیدہ ایک ساتھ دفتر سے نکلے۔ وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی' میں اپنے گھر کی سمت مڑ گیا۔

شام کو' نوکروں کو انتظامات کی ضروری ہدایات دینے کے بعد میں نے زبیدہ کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو" ایک نسوانی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"یوسف علی خاں صاحب سے بات ہو سکتی ہے؟" میں نے ہیلو کے جواب میں کہا۔

"آپ کون صاحب بات کر رہے ہیں؟"

"شکیب علی خاں۔"

میرے جواب پر ایک قہقہے کی آواز سنائی دی۔ قہقہے سے میں پہچانا۔ ٹیلیفون زبیدہ نے اٹھایا تھا۔

"آپ میری آواز بھی نہیں پہچانے؟"

"کبھی ٹیلیفون پر تمہاری آواز سننے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لئے۔ اچھا بتاؤ بھائی جان سے بات ہوئی؟"

"ہاں، میں نے کہہ تو دیا تھا۔ آپ بھی بات کر لیں۔ میں انہیں بلاتی ہوں" دوسری طرف سے بھاری مردانہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"یوسف علی خاں اسپیکنگ۔"

"میں شکیب بول رہا ہوں۔ کیسے مزاج ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"زبیدہ نے میری درخواست آپ تک پہنچا دی ہوگی۔"

"ہاں ذکر تو کر رہی تھی۔"

"تو آپ آ رہے ہیں؟"

"یس۔ ہم ایک گھنٹے میں پہنچ رہے ہیں۔ ویسے اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

"تکلف کیسا یوسف صاحب۔ میں تو کاروباری بکھیڑوں میں پھنسا رہا ورنہ آپ سے بہت پہلے ملاقات کرتا۔ چلئے اب سہی" بھائی جان وقت کے بہت پابند نکلے۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد نیلی مزدا کوٹھی میں داخل ہوئی۔

یوسف علی خاں چھریرے بدن، معمولی نقش اور پکی رنگت کے مالک زبیدہ سے قطعی مختلف تھے البتہ ان کی بیگم روپ رنگ کا مجسمہ تھیں۔ ایسا مجسمہ کہ زبیدہ بھی پھیکی معلوم ہوتی تھی۔ یوسف صاحب نہایت تپاک سے ملے۔ بہت بولنے والے آدمی ثابت ہوئے، بیٹھتے ہی شروع ہو گئے۔ ادھر ادھر کی باتوں اور بے ہنگم قہقہوں سے پورے لان کو سر پہ اٹھا لیا۔ وہ قیامت تک نہ رکتے، اگر ان کی بیگم انہیں ڈانٹ نہ دیتیں۔ ان کی بیگم کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ زبیدہ میرا ذکر کئے بغیر نوالہ نہیں توڑتی۔ اس گھر میں میرا غائبانہ تعارف اتنا زیادہ ہوا تھا کہ میں ان کے لئے اجنبی نہیں رہا تھا لیکن شاید انہیں میری دولت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ میرے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر یوسف صاحب کی بیگم خاصی متاثر نظر آئی تھیں۔ بات بات پر زبیدہ کی خوشامدانہ تعریفیں کر کے مجھے خوش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ابھی گفتگو جاری تھی کہ ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ چائے تیار ہے۔ ہم سب چائے کی میز کی طرف روانہ ہو گئے۔ چائے نوشی کے درمیان یوسف علی خاں نے ایک ایسا سوال کر ڈالا کہ مجھے چپ آ گئے۔

"کیوں شکیب صاحب! اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو یہ کوٹھی سیٹھ ... علی خاں کی نہیں؟"

"جی ہاں، یہ انہی کی ہے۔ آپ قطعی غلطی پر نہیں ہیں" میں نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ سے ان کا کیا رشتہ ہے؟"

"میں۔ میں ان کا بیٹا ہوں" میں نے جواب دیا۔

"لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ لاولد تھے۔"

"میں ان کا حقیقی بیٹا نہیں، ان کے دوست کا بیٹا ہوں۔ والد کے انتقال کے بعد میں تنہا رہ گیا تھا۔ میری والدہ کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس لئے سیٹھ صاحب نے مجھے اپنا بیٹا بنا لیا۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ میرے والد یوسف زئی پٹھان تھے جبکہ سیٹھ صاحب کمال زئی تھے۔ باپ کی نسبت سے میں اپنے آپ کو یوسف زئی ہی کہتا ہوں" میں نے اپنے نسب کا ذکر جان بوجھ کر کر دیا۔ مجھے زبیدہ کی نصیحت یاد تھی کہ "بھائی جان انسانوں کو ذات برادری پر تولتے ہیں۔" مجھے اس وقت اپنی غلطی کا بے تحاشا احساس ہوا کہ میں نے یہ کوٹھی اب تک فروخت کیوں نہ کر دی۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ اس شہر میں سیٹھ صاحب کے شناسا یقیناً ہوں گے جو کبھی نہ کبھی اس کوٹھی پر آ بھی چکے ہوں گے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے زبیدہ کی طرف دیکھا، وہ خاموشی سے چائے پی رہی تھی۔ یوسف صاحب بھی بظاہر خاموش ہو گئے تھے لیکن لگتا تھا، وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔ البتہ ان کی بیگم پر اس گفتگو کا زیادہ اثر نہیں ہوا۔ وہ تھوڑی دیر بعد اسی طرح چہکنے لگیں۔

محفل بے لطف ہو گئی تھی لیکن زبیدہ کی بھابی کے دم سے کچھ نہ کچھ رونق بحال ہو گئی۔ میں بھی زبردستی ہنستا مسکراتا رہا حالانکہ میرا دماغ اس وقت کہیں اور تھا۔ کچھ دیر کی خوش گپیوں کے بعد یوسف صاحب نے مجھ سے اجازت چاہی۔ ان کی بیگم کی تنہائی کہ انہوں نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر میرا دل بڑھایا۔

وہ رات میں نے اپنی قیمتی خواب گاہ میں جہازی پلنگ پر اکڑوں بیٹھ کر احساس جرم کے بوجھ تلے دب کر گزاری۔ اس رات مجھے اپنے کئی گناہ یاد آئے مگر انسان بڑا بہانہ ساز ہے۔ میری مصلحتوں نے پھر بہانے تراش لئے۔ زبیدہ کی جادوگری کے بہانے، مستقبل کی خوش اندازی کے بہانے۔ صبح تک میں ہر احساس سے آزاد ہو چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آج دفتر میں سب سے پہلا سوال زبیدہ کی زبان پر کل کی پردہ داری سے متعلق ہوگا۔ میں ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کر کے دفتر کے لئے روانہ ہو گیا۔

وہی ہوا جو سوچا تھا۔ دفتر میں داخل ہوتے ہی میرے خیال نے عملی جامہ پہن لیا۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو سامنے زبیدہ وہاں بیٹھی تھی۔

"ارے زبیدہ تم! یہاں"

"سر کل آپ کا پہلا فریب مجھ پر کھلا۔ بتائیے آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

"دیکھو زبیدہ! پہلے تو تم اپنا لہجہ درست کرو اس کے بعد مجھ

سے کسی جواب کی توقع رکھو۔"

"مجھے جواب چاہئے"

"زبیدہ! بعض فریب ایسے ہوتے ہیں جو اگر انسان دوسروں کو نہ دے تو کوئی کا دم نکل جائے' بیچاری زندگی کانٹی دو بھر ہو جائے" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں دوسری کب سے ہو گئی۔ تم میں ہوں' میں تم ہو۔ پھر یہ پردہ فریب کیا؟ تم نے آج تک مجھ سے یہ سب کچھ کیوں چھپایا؟ میرے اعتماد کو قتل کیوں کیا؟"

"بے اعتمادی کی بات نہیں ہے میری جان! میرے خیال میں یہ کوئی قابل ذکر واقعہ تھا ہی نہیں جو میں تم سے کہتا اور کہتا تو کیا ہو جاتا۔ وقت کا پہیہ الٹا چلنے لگتا' حال ماضی میں بدل جاتا۔ کیا ہو جاتا۔"

"مجھے معلوم ہوتا تو میں بات کو سنبھال لیتی۔ تمہیں ہوشیار کر دیتی۔ کچھ نہ کچھ کر لیتی۔"

"اب بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

"نہیں' اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ بھائی جان کو نہیں جانتے۔ وہ کسی ایسے آدمی کے حوالے مجھے نہیں کریں گے جو کسی کا لے پالک ہو۔"

"مگر میرا باپ ایک اعلیٰ نسب کا آدمی تھا' تمہاری طرح پٹھان تھا۔ یوسف زئی تھا۔"

"بھائی جان کو یہ بات کون سمجھائے گا۔"

"زبیدہ! اگر اس واقعے کے بعد میں تمہاری نظروں میں بے سے گر بن گیا ہوں تو ٹھیک ہے۔ اور اگر اب بھی ہیرا ہوں تو ہر مخالفت کے باوجود میں تمہیں مانگوں گا۔ تمہارے یوسف زئی بھائی سے مانگوں گا۔ بولو' تم تو مجھے برا نہیں سمجھتیں؟"

"نہیں" وہ بغیر سنے کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد میرا ذہن تیزی سے حرکت کرنے لگا۔ 'مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا اور آج ہی' اسی وقت بلکہ ابھی۔ لیکن شام تک تو انتظار کرنا ہی ہو گا۔ یوسف علی خاں اس وقت گھر پہ کہاں ہوں گے۔' میں نے سوچا۔

اتنے بوجھ لے کر میں دفتر میں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ ضروری کام نمٹانے کے بعد میں نے سوچا' زبیدہ کو لے کر کہیں چلا جاؤں' کچھ راز اور بتادوں یا یونہی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا پھروں۔ میں نے بی۔ اے سے کہا "مس زبیدہ کو بھیجئے۔"

"سر! وہ تو گھر چلی گئیں' ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی"

"اچھا!" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ بریف کیس اٹھایا اور شام کے انتظار میں دفتر چھوڑ دیا۔

شام کو زبیدہ کے گھر جانے سے پہلے میں نے سوچا تھا فون کر لوں' پھر ایسا کرنا خلاف مصلحت سمجھا۔ نہ معلوم یوسف صاحب نے میرے بارے میں کیسی رائے قائم کی ہو' گھنے سے انکاری کر دیں لیکن اگر پہنچ ہی جاؤں گا تو گھر آئے مہمان کو کوئی نہیں بھگاتا۔ میں نے ڈائری سے ایڈریس نکالا اور زبیدہ کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ معمولی سی تلاش کے بعد مجھے منزل مل گئی۔ یہ گلشن کے علاقے میں اوسط درجے کا اپارٹمنٹ تھا' یوسف صاحب کسٹم میں ہوتے ہوئے اس اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے رشوت سے گریز کرتے ہیں۔ ایسا آدمی بعض اوقات بہت خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ بھلا بتائیے جو آدمی اپنا بھلا نہ چاہے دوسرے کا کیا چاہے گا' میں نے سوچا۔ میں نے سوچوں کے دائرے سے باہر قدم رکھا اور کال بیل پر انگلی رکھ دی۔

دروازے پر زبیدہ کی بھابی نمودار ہوئیں۔ مجھے دیکھ کر ایسے لگا جیسے وہ میرے ہی انتظار میں تھیں۔ انہوں نے نہایت خوش اخلاقی سے مجھے اندر بلایا۔ میں پوچھتا ہی رہ گیا کہ یوسف صاحب گھر پر ہیں۔ انہوں نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ "آپ تشریف رکھئے میں یوسف کو اطلاع کرتی ہوں۔"

باہر سے یہ اپارٹمنٹ اتنا شاندار نظر نہیں آتا تھا۔ کمرے بہت کشادہ اور شاندار تھے۔ تزئین سجاوٹ بھی اہل خانہ کی خوش ذوقی کی گواہی دے رہی تھی۔ ابھی میں اس نئے ماحول سے آشنا ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ یوسف صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے میری آمد پر کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ ان کا موڈ خوشگوار تھا۔ میرے تمام اندیشے باطل ہو گئے۔ میں خواہ مخواہ ڈر رہا تھا۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

"آپ نے تو بڑی جلدی وعدہ نبھایا! اور وہ بھی اتنی خاموشی سے۔ کم از کم اطلاع ہی کر دی ہوتی" بھابی نے اپنے میاں کے برابر نشست سنبھالتے ہوئے کہا۔

"نہیں یہ بات نہیں۔ میں یہاں سے گزر رہا تھا' سوچا آپ لوگوں سے بھی مل لیا جائے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہاں آنے کا کوئی پروگرام تھا ہی نہیں" میں نے صفائی پیش کی۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس تمام گفتگو کے دوران زبیدہ نے کمرے میں آکر جھانکا تک نہیں۔ مجھے اس کی اس بے مروتی پر غصہ تو بہت آیا مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ شاید اس گھر کی تہذیب میں یہ پردہ داری شامل ہو۔

ادھر ادھر کی باتوں میں جب خاصی دیر گزر گئی تو میں اصل مطلب پر آگیا۔

"یوسف صاحب! آپ کے بارے میں میرا مشاہدہ یہ ہے کہ آپ حقیقت پسند ہیں اس لئے بغیر تمہید کے آپ کی اور بھابی کی اجازت سے کچھ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں" میں نے دھیمے لہجے میں بات کا آغاز کیا۔

"ارے ارے! تم تو اچھا خاصا تکلف کرنے لگے۔ خیریت تو ہے کیا بات ہے؟" یوسف صاحب نے میری ہمت بڑھائی۔

"بات تو یہ بزرگوں کے کرنے کی ہے لیکن آپ کو معلوم ہے'

میرا کوئی بیٹا موجود نہیں۔ بات یہ ہے کہ زبیدہ کو میں پسند کرتا ہوں اور زندگی کے سفر میں اسے ساتھ لے کر چلنے کی خواہش مجھے یہاں تک لائی ہے۔ جیسا کچھ ہوں آپ کے سامنے ہوں۔ آپ کی رضامندی میرے خوابوں کو تعبیر دے سکتی ہے۔"

یوسف صاحب نے میری اس جسارت کو حیرت سے سُنا اور مجھ سے مخاطب ہوئے "شکیب صاحب' آپ کی صاف گوئی مجھے پسند تو بہت آئی لیکن مجھے اس مسئلے پر کچھ سوچنا ہوگا۔ آپ کو کچھ انتظار کرنا پڑے گا اور ہاں' صرف اقرار کی امید نہ رکھئے' میں انکار بھی کر سکتا ہوں۔"

"وہ آپ کی مرضی۔"

"آیئے چائے پی لی جائے" انہوں نے زبیدہ کو چائے کی ٹرالی لاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

لڑکیاں کسی بات کا کتنی جلدی اثر لیتی ہیں' اس کا اندازہ مجھے اس وقت زبیدہ کو دیکھ کر ہوا۔ اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ چہرا ایسا بجھا ہوا تھا جیسے خوشی نے اس چہرے پر کبھی رنگ جمایا ہی نہ ہو۔ اس نے مجھے رسماً سلام کیا اور ٹرالی کو درمیان میں رکھ کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

چائے پینے کے بعد میں نے ان سے اجازت طلب کی۔ زبیدہ ٹرالی لے کر جا چکی تھی۔ یوسف صاحب اور بھابی نے مجھے دروازے تک آکر خیرباد کہا۔ میں ان سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ میرے سوال کا جواب کب تک ان سے بن پڑے گا۔ مجھے پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ ضروری نہیں کہ پوری دنیا دولت مندوں سے مرعوب ہوتی پھرے۔ کچھ لوگ اپنے جذبات چھپانا بھی جانتے ہیں۔

دوسرے دن زبیدہ دفتر نہیں آئی۔ میں نے کوئی اہمیت نہیں دی لیکن جب وہ مسلسل چار روز تک غیر حاضر رہی تو مجھے تشویش لاحق ہوئی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے وہ بیمار ہو گئی ہو لیکن کوئی درخواست' کوئی پیغام' کوئی خط کچھ بھی تو نہیں۔ کم از کم ٹیلیفون ہی کر لیتی۔ یہ معاملہ کچھ اور ہے۔ میری چھٹی حس نے مجھے بیدار کیا۔ اب اس کا حصول میری محبت نہیں میری ضد بنتا جا رہا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر زبیدہ کے گھر کا نمبر ملایا کہ اس وقت یقیناً یوسف صاحب گھر پر نہیں ہوں گے۔ یا تو زبیدہ خود ٹیلیفون اٹھائے گی یا بھابی لہٰذا صحیح صورتِ حال کا علم ہو سکے گا۔

ٹیلیفون بھابی نے اٹھایا۔ میں نے بیتابی سے زبیدہ کو پوچھا۔
"کون زبیدہ' زبیدہ تو یہاں نہیں ہے۔ آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟" بھابی کی آواز آئی۔

"بھابی! میں شکیب بول رہا ہوں۔ کہاں ہے زبیدہ؟"

کچھ دیر خاموشی رہی' میں ہیلو ہیلو کرتا رہا۔ ٹیلیفون رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد میں مستقل نمبر ڈائل کرتا رہا۔ بیل ہوتی رہی مگر کسی نے اٹھانے کی زحمت ہی نہ کی۔ اس ناگہانی افتاد نے مجھے چونکا دیا۔ شاید بھابی کو منع کر دیا گیا تھا ورنہ ان سے اس بے رخی کی توقع مجھے نہیں تھی۔ میں انسانی سمندر میں قطرے کی زندگی گزارنے کا قائل نہیں۔ موجوں کی طرح بپھرنا میری فطرت ہے' اب میں اس وقت ٹیلیفون کروں گا جب یوسف علی خاں گھر پر موجود ہوں اور ان سے اپنا حق' اپنی محبت مانگوں گا ورنہ میں چھیننا بھی جانتا ہوں۔ میں نے پختہ ارادہ کیا اور شام ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ آج میں دفتر کی چھٹی کے بعد بھی دفتر میں رکا رہا۔ جیسے ہی مجھے یقین ہوا کہ اب زبیدہ کے گھر میں چراغ جل چکے ہوں گے' میں نے نمبر ڈائل کیا۔ مردانہ آواز نے میرا استقبال کیا۔

"زبیدہ کہاں ہے۔ وہ کیسی ہے؟" میں نے براہ راست پوچھا۔

"تم کون ہو؟" دوسری طرف سے بھی وہی لہجہ تھا۔

"میں شکیب علی خاں ہوں۔"

"تم کون ہوتے ہو زبیدہ کا اس طرح پوچھنے والے؟"

"میں اس کا مالک ہوں' وہ میرے دفتر میں ملازم ہے۔ چار دن ہو گئے دفتر نہیں آئی ہے۔"

"اس کا استعفا پہنچ جائے گا۔"

"وہ میری محبت ہے۔"

"وہ بہت جلد تمہاری اس خوش فہمی کو توڑ دے گی۔"

"میں نے ایک سوال کیا تھا' اس کا کیا جواب ہے؟"

"ایک لے پالک میرا بہنوئی نہیں بن سکتا۔"

"میں لے پالک ضرور ہوں لیکن ایک باعزت باپ ..."

"تم ایک گیراج سے لائے گئے تھے' مجھے اس کا علم ہے" انہوں نے میری بات کاٹ دی۔

"لیکن زبیدہ ہے کہاں؟"

"میں پابند نہیں اس بات کا جواب دینے کا۔"

"ٹھیک ہے میں گھر آرہا ہوں' اس سے خود بات کرلوں گا۔"

"خبردار! یہ نادانی نہ کرنا۔ یہاں بے عزتی کے سوا تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ ابھی صرف اتنا جان لو کہ وہ گھر میں تو کیا کراچی شہر میں بھی کہیں موجود نہیں۔ لاہور گئی ہے اور اپنی خوشی سے گئی ہے۔ بہت جلد اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا وضاحت نامہ تمہیں مل جائے گا۔" یوسف علی خاں نے اس وضاحت کے بعد ریسیور رکھ دیا۔ یوسف نے تو ایسا کر بھی لیا' میں تو ریسیور ہاتھ سے رکھنا ہی بھول گیا۔ نہ جانے کتنی دیر ریسیور کو اس طرح تکتا رہا جیسے ابھی زبیدہ کی آواز آئے گی۔ وہ مجھے یقین دلائے گی' یہ سب جھوٹ ہے۔ بھائی جان کی تو عادت مذاق کی ہے۔ وہ تمہارا دل دیکھ رہے تھے۔ میں تو یہیں ہوں' تمہارے خیالوں میں' تمہارے خوابوں میں' تمہارے شہر میں لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہوا تو یہ ہوا کہ ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں کرسی پر ایک طرف جھول گیا۔

میری آنکھ کھلی تو اپنی خواب گاہ میں تھا۔ ڈاکٹر مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ میں نے کچھ دیر ماحول کا جائزہ لیا پھر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"ہاں' ہاں۔ لیٹے رہیئے۔ حرکت آپ کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے" ڈاکٹر نے مجھے پھر لٹا دیا۔ میرا ڈرائیور اور تمام نوکر کمرے میں موجود تھے۔

"مگر میں تو دفتر میں تھا" میری آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"جی ہاں۔ آپ دفتر میں ہی تھے۔ آپ پر ہلکا سا اٹیک ہوا تھا۔ وہ تو شکر کیجیے چوکیدار بروقت کمرے میں پہنچ گیا اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں' آٹھ دس روز کے آرام کے بعد آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

ایک ہفتے کے لئے میں پلنگ سے لگ کر رہ گیا۔ پی۔ اے سے میں نے کہلوا دیا کہ مس زبیدہ کا کوئی پیغام آئے تو مجھے ضرور اطلاع کرے لیکن یہ ایک ہفتہ خاموشی سے گزر گیا۔ طوفان کا زور ایک ہی طرف تھا دوسری طرف مکمل خاموشی' مسلسل سناٹا!

ایک ہفتے کے بعد میں دفتر جانے کے لئے تیار ہوا تو آئینہ مجھے اجنبی لگا۔ یہ دل لگانے کی سزا ہے کہ دل دکھانے کی' یہ عقدہ حل کرے تو کون اور کیسے؟ بہرحال ایک انجانی امید کی ہمراہی میں میں نے دفتر میں قدم رکھا۔ زبیدہ کے کمرے پر لگی تختی نے میرے قدم پکڑ لئے' میں نے لاشعوری طور پر اس کے کمرے میں جھانکا۔

"سر! وہ تو آج بھی نہیں آئیں ـــ" میرا بریف کیس تھام کر چلنے والے چپراسی نے مجھے اطلاع فراہم کی۔

میں اس کی بات کا کیا جواب دیتا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کچھ دیر تک دفتر کے لوگ میری خیریت دریافت کرنے آتے رہے اور پھر وہی تنہائی' وہی خاموشی۔ میں نے اپنے آپ کو فائلوں میں گم کرنے کی ناکام کوشش کی مگر خیالوں کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے۔ میں اسے کہاں تلاش کروں۔ کیسے ڈھونڈوں' کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا اسی ادھیڑبن میں دو دن اور گزر گئے ۔۔۔۔ اسے گئے ہوئے پندرہ دن گزر چکے تھے کہ ایک روز ڈاک میں ایک لفافے پر نظر پڑی۔ تحریر جانی پہچانی تھی۔ ۔۔۔ دل نے کہا زبیدہ' دماغ نے کہا نہیں۔ لفافہ چاک کیا تو دل جیت گیا۔ اس کا خط میرے ہاتھ میں تھا۔

ڈیئر شکیب!

مجھے بھائی جان نے لاہور اس لئے بھیجا تھا کہ میں تم سے دور رہ کر فیصلہ کروں اور تمہیں بھلانے کا اعلان بھی۔ میں بھی اس ارادے سے یہاں آئی تھی کہ دھوکے کا جو زخم تم نے میری روح پر لگایا ہے اس کے بعد تم پر بھروسا فضول ہے۔ میرا خیال تھا' میں تمہیں بھول جاؤں گی لیکن یہ میری بھول تھی۔ میں تمہیں بھلا نہیں سکتی۔ بھائی جان میری شادی کسی سی ایس پی افسر سے کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے میں بھی تیار ہو گئی تھی مگر اب میں انہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ تم نے پالک کیا' اگر فقیر بھی ہو تو مجھے قبول ہے۔ تم ہیرا ہو' فکر نہیں بنے۔ میں کراچی آ رہی ہوں۔ بھائی جان سے گڑگڑا کر تمہاری بھیک مانگوں گی۔ اگر پھر بھی وہ تیار نہیں ہوئے تو میں ان کو بے عزت کرنا نہیں چاہتی لیکن ان کا ایک ایسا راز میرے پاس ہے جس کو افشا کرنے کی دھمکی کے ساتھ ہی وہ تم سے رابطہ کریں گے۔ میری تم سے ایک ہی گزارش ہے' ان کی بے عزتی مت کرنا' یہ مجھ سے برداشت نہ ہو گا۔

نہ جانے تم پر کیا گزر رہی ہو۔ اپنی صحت کا خیال رکھو اور انتظار کرو۔

تمہاری گناہگار۔ زبیدہ

یہ تمہارا ہی ظرف ہے زبیدہ کہ تم مجھے فقیر کے روپ میں بھی قبول کرنے کو تیار ہو۔ اگر مجھے پتا چل جائے کہ تم فقیر ہو تو میں اپنی محبت کے باوجود تمہیں اپنی ٹھوکر میں رہنے کی جگہ بھی نہ دوں۔ تم کراچی لوٹ آؤ' میں انتظار کروں گا اور بھائی جان کی عزت بھی۔ خط کا جواب میں نے اپنے دل پر تحریر کر لیا۔

اس خط کی عبارت نے زبیدہ کی عزت اور محبت میری نگاہوں میں اور بھی بڑھا دی۔ اب میں بے چینی سے اس گھڑی کا انتظار کرنے لگا جب یوسف علی خاں خود مجھ سے رابطہ قائم کرے۔ اس گھڑی کے آنے میں دیر نہیں لگی۔ نہ جانے زبیدہ کے علم میں وہ کون سا راز تھا جسے سنتے ہی یوسف علی خاں صاحب کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ ابھی تین دن بھی نہیں گزرے تھے کہ یوسف نے ٹیلیفون پر مجھ سے رابطہ کیا۔

"شکیب اسپیکنگ" میں نے ٹیلیفون کی گھنٹی کے جواب میں کہا۔

"میں یوسف بول رہا ہوں" ادھر سے آواز آئی۔ میرے دل نے کروٹ لی۔ کنواں پیاسے کے پاس آیا تھا۔ سورج مغرب سے نکل آیا تھا۔ پٹھان ڈھیر ہو گیا تھا۔

"فرمائیے خانصاحب" میں نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

"تم جیت گئے ہو ـــ بس۔ شام کو میرے گھر آؤ' تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی انہوں نے ٹیلیفون بند کر دیا۔ انہیں خدشہ تھا کہ میں فاتحانہ ہنسی نہ ہنس دوں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں شام سے پہلے ہی اس کی ایک جھلک دیکھنے اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ محبت کے ملبے پر ایک فقیر' پٹھان زادی کو بیاہنے خود اس کی دعوت پر اس کے گھر جا رہا تھا۔ وہی اپارٹمنٹ' وہی مانوس سیڑھیاں۔ میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ یوسف علی خاں پہلی گھنٹی پر دروازے پر موجود تھے' جیسے دروازے سے لگے کھڑے تھے۔

"السلام علیکم" میں نے ان کی عزت کی۔

"وعلیکم السلام۔ آئیے" انہوں نے یہ "آئیے" اس طرح کہا جیسے کوئی تیر مار دے۔ ان کی چال سے شکست نمایاں تھی۔ میں ان کے اشارے پر ڈرائنگ روم کی طرف چل دیا۔ میری نگاہیں زبیدہ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ مجھے لگا جیسے کھڑکی سے دو آنکھیں مجھے سلام کر رہی ہیں۔ یہ زبیدہ ہی ہوگی اور کون ہو سکتا ہے۔ میں نے یہ بات آج پہلی مرتبہ محسوس کی کہ ان کے گھر میں بچے موجود نہیں۔ غالباً یوسف علی خان کے یہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ میں نے یہ بات اس لیے محسوس کی کہ بچے بڑے اچھے مخبر اور پیغام رساں ہوتے ہیں۔ میں زبیدہ کی خبر کس سے معلوم کروں اور میرا سلام کون پہنچائے۔ اس سناٹے میں چھناکا کون پیدا کرے؟ یوسف علی خان مجھے کمرے میں بٹھا کر چلے گئے تھے۔ دوبارہ آئے تو بھابی ان کے ساتھ تھیں۔ ان کے چہرے پر وہی روشنی تھی لیکن شوہر کا مزاج دیکھ کر ان کی کھنکتی ہنسی نے پاؤں سمیٹ لیے۔ یوسف علی خان نے ایک گہری سانس لی اور سلسلۂ کلام آغاز کیا۔

"شکیب صاحب! میں اس شادی پر تیار نہیں تھا اور نہ ہوں مگر تم جانتے ہو کہ اولاد کے لیے انسان چوری کرنے پر بھی تیار ہو جاتا ہے' زبیدہ کی ضد نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ اب اس کی خوشی میری خوشی ہے۔ میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ وہ تمہیں اچھا سمجھتی ہے تو میں بھی تمہیں اچھا سمجھوں گا۔ بس اتنا یاد رکھنا کہ وہ میری زندگی ہے' اسے دکھ نہ دینا حالانکہ مجھے یقین ہے کہ تم اسے دکھ دو گے۔ کیوں؟ اس کی وجہ تم خود جانتے ہو۔ میں بتاؤں گا تو بات وہیں آجائے گی جہاں سے شروع ہوئی تھی۔"

انہوں نے مجھے اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا۔ وہ ذرا سانس لینے کو رکے تو میں نے دخل اندازی کی "انسان کے اندیشے بعض اوقات اسے کہیں کا نہیں چھوڑتے۔ آپ ان اندیشوں کو ذہن سے کھرچ ڈالیے۔ زبیدہ میری محبت ہے' اسے خوش رکھنا میرے دل کی دھڑکن کی ضمانت ہے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ میں یہ شادی بہت سادگی سے کرنا چاہتا ہوں۔ زبیدہ بھی یہی چاہتی ہے۔ ابھی بارہ دن ہیں' اس مہینے کی پندرہ کو آپ بارات لے کر آجائیے گا۔ چائے آئی ہوئی' چائے پی کر جائیے گا۔" انہوں نے بڑی آسانی سے تمام معاملات طے کرا دیے۔

"مجھے منظور ہے۔ لیکن اس درمیان میں' میں ایک بار [illegible] چاہتا ہوں۔"

"یہ [illegible] ضروری نہیں۔ ہماری چند روایات ہیں جن کی [illegible] فرض ہے البتہ میں [illegible] کر سکتا ہوں' [illegible] آپ [illegible] لیں۔" اس کے ساتھ ہی وہ اور بھابی کمرے سے چلے گئے۔

تھوڑی [illegible] زبیدہ [illegible] مسکراہٹ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی لیکن مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ جیسے ٹھٹک سی گئی۔

"کیا ہو گیا ہے شکیب تمہیں' یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ کیا ہوا تمہیں؟"

"تم میری جدائی کا ایسا ماتم کرو گے مجھے علم نہیں تھا۔ آج مجھے اپنی جیت پر گہرے حسن پر اور تمہاری وفاداری پر بڑا فخر ہو رہا ہے۔ ہم جیت گئے ہیں شکیب۔ اب ہم ایک ہی زندگی شروع کریں گے۔ تم کیا ہو' میں تم سے کبھی کچھ نہیں پوچھوں گی لیکن تم اپنے عمل سے ثابت کر دینا کہ تم وہ نہیں ہو جو بھائی جان تمہیں کہہ رہے ہیں" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ باتیں کرنے کے لیے عمر پڑی تھی "اس وقت تو میں تمہیں جی بھر کے دیکھنا چاہتا تھا" پھر بھی کتنی ہی دیر ہم سر جوڑے سرگوشیوں میں ایک دوسرے کا بوجھ بٹا کرتے رہے۔ کبھی ہنسی' کبھی سسکیوں کے درمیان نہ جانے کتنا وقت گزر گیا اور ہم ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ جیسے قیدیوں کی ملاقات کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ بھابی کی آواز نے ہمیں چونکا دیا "ہم اندر آ سکتے ہیں؟" اور وہ اندر آگئیں۔ زبیدہ کسی کوندتی بجلی کی طرح اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ بھابی چائے کی ٹرالی کے ساتھ اندر آئی تھیں۔ تھوڑی دیر میں بھائی جان بھی آگئے۔ زبیدہ چائے پر موجود نہیں تھی مگر اس وقت چائے اچھی لگی۔ چائے کے بعد حسب سابق یوسف صاحب اور بھابی مجھے خدا حافظ کہنے دروازے تک آئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹی وی لاؤنج سے زبیدہ نے مجھے خدا کے سپرد کیا اور میں نے گھر کی دہلیز چھوڑ دی۔

ملاقاتوں پر پابندی تھی' ٹیلی فون پر نہیں۔ ان چند دنوں میں تقریباً روز زبیدہ کے ٹیلی فون آتے رہے۔ چاہتوں اور انتظامات کے جھمیلوں میں یہ چند دن چند منٹ کی طرح گزر گئے۔ کل چند دن کی قلیل مدت میں میں مکمل ہو گیا۔ شادی بیاہ کے گیت گانے والا میرے گھر میں کون تھا۔ نہ مہندی ہوئی نہ اُبٹن۔ چند دوستوں اور ملازموں کی معیت میں نکاح کے مراحل طے ہوئے۔ زبیدہ گلابی جوڑے میں' حنا کے رنگ میں بسی میرے گھر میں داخل ہوئی۔ کوٹھی کے باہر لگی میرے نام کی تختی آج روشنیوں میں نہا گئی۔ آج مجھے ایک مرتبہ پھر اپنی ماں یاد آئی' وہ عورتیں یاد آئیں جو میری ماں کو مژدہ سناتی تھیں۔ "نذیرن' تیرا منڈا بڑا بھاگوان ہے۔" میں نے آج کائنات فتح کر لی تھی۔ میں فقیر کی اولاد نہیں' پٹھان زادی بیاہ کر لایا تھا۔ میرا باپ جب کراچی بھیک مانگنے آتا تھا تو بہت سارے نوٹ لے کر جاتا تھا لیکن میں نے کراچی کی ساری دولت کھلا کر بھیک سے نہیں نجات ہے۔ اب کوئی فقیر یہاں سے کچھ نہیں لے جائے گا۔ اب کوئی نذیرن بیٹے کے لالچ میں کراچی کا رخ نہیں کرے گی۔ اب میرے بچے فقیر کی اولاد نہیں' عیدو کی اولاد نہیں' شکیب علی خان کی اولاد کہلائیں گے۔ اس کی انگلی تھام کر "اندھے کا جوں

کی مدد کو "بی سوا انہیں بنائیں گے۔ اب میرے بچوں کے گھر سے رخصت ہو چکی ہے۔ کسی شرفوی کو یہ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی "کیوں تیرے گھر رخصتی نہیں ہوئی؟" اب میرا کوئی بچہ ماں کو ڈھونڈنے گھر سے نہیں بھاگے گا" وہ دور کی ٹھوکریں نہیں کھائے گا" نے پالک نہیں کہلائے گا۔ اب کوئی یوسف علی خاں پیدا نہیں ہوگا جو انہیں طعنے دے سکے۔

خیالوں کے اس بھنور سے نکلنا آسان نہ ہوتا "اگر خواب گاہ میں موجود میری تقدیر میرا انتظار نہ کر رہی ہوتی۔ میں خوش بختی کے سایوں تلے آرام کرنے خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔

صبح نمودار ہوتے ہی بھائی جو ادروں کے ساتھ "لیجیے ہوا" میں قسمتیں بکھیرنے آموجود ہوگئی۔ میری تقدیر میرے پہلو میں تھی کہ کسی ملازم نے اکرام پر مجھے ان کے پہنچنے کی اطلاع دی۔ آج تو بھائی کا رنگ ہی اور تھا۔ ان کے شریر جملوں نے بار بار مجھے خفیف کیا۔ پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ بھائی کا وجود کسی گھر میں کتنا مہمان پرور اور کتنا ضروری ہے۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ رشتوں کی حرمت سے "اس کے حسن سے بلا شبہ میں کتنی دور چلا گیا تھا۔ بھائی مجھ سے دن بھر کے لئے میری تقدیر مانگ کر لے گئیں۔ دن چھپتے تک وہ تقدیر پھر میری جھولی میں تھی۔

زبیدہ کو پانے کے بعد میں فطری طور پر نہایت خوش تھا۔ زبیدہ نے بھی اپنی نسائیت اور خدمت گزاری سے میرے گھر کو جنت بنا دیا۔ وہ ایک ذہین لڑکی ثابت ہوئی۔ اس نے مجھے میری تمام خامیوں سمیت قبول کیا تھا جبکہ میں خود غرض تھا "میں نے اس کے اعلیٰ نسب ہونے کے ذریعے سے اپنا شجرہ نسب درست کرنا چاہا تھا۔ اس کے خلوص نے مجھے بے دام خرید لیا۔ بھائی جان کچھ دن کھنچے کھنچے سے رہے لیکن پھر آہستہ آہستہ ان کی خفگی دور ہو گئی۔ تمام معاملات درست ہو گئے تھے۔ میری کشتی حیات پر بھنور سے سلامت گزر آئی تھی اور اب ساحل مراد کی جانب سبک روی سے خراماں خراماں گامزن تھی کہ پھر بھنور اٹھنے لگے" موجیں آنکھیں دکھانے لگیں۔ باد مخالف چلنے لگی۔ چرخ کج رفتار کب کسی کو ایک حال پر رہنے دیتا ہے۔

ایک روز میں دفتر سے گھر وقت سے پہلے آگیا۔ زبیدہ گھر میں موجود نہیں تھی۔ میں نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ ہو سکتا ہے "اپنے بھائی کی طرف چلی گئی ہو" کسی سہیلی سے ملنے کی طلب ہوئی ہو یا کوئی شاپنگ وغیرہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ ٹھیک اس وقت واپس آئی جو میرے دفتر سے گھر لوٹنے کا وقت تھا۔ آتے ہی اس نے معذرت کرلی کہ وہ ایک سہیلی کی طرف گئی تھی۔ بات آئی گئی ہو گئی لیکن ایک مرتبہ پھر ایسا ہی ہوا۔ میں نے بھائی جان کی طرف ٹیلی فون کیا۔ معلوم ہوا وہ وہاں نہیں پہنچی۔ تب میرے دل میں اندیشوں نے سر اٹھایا۔ ڈرائیور سے معلوم کیا تو اس کا بیان عجیب تھا "صاحب! بیگم صاحبہ آٹھویں دسویں دن کہیں جاتی ہیں۔ کہاں؟ معلوم نہیں۔"

"تم ان کے ڈرائیور ہو" گاڑی تم کیوں نہیں چلاتے؟"

"ایک مرتبہ میں نے کہا تھا تو مجھے ڈانٹ دیا کہ ہر جگہ تمہیں لے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

میں نے نوکروں سے زیادہ پوچھ گچھ کو مناسب نہیں سمجھا لیکن اس کا اس طرح وقفے وقفے سے پُراسرار طور پر غائب ہونا اچھا شگون نہ تھا اس لئے اسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس روز وہ واپس آئی تو پھر مجھے موجود پایا۔

"ارے آپ کب آئے؟ آج کل آپ دفتر سے جلدی کیوں آجاتے ہیں؟"

"نہیں تو۔ جلدی کب آیا" بس ابھی پہنچا ہوں" کپڑے بھی تبدیل نہیں کئے۔ اور تم کہاں گئی تھیں؟" میں نے نہایت ملائمت سے پوچھا۔

"ذرا بھائی جان کی طرف گئی تھی۔"

اس کے اس جھوٹ نے میرے اندیشوں کو مہمیز دی۔ آدمی جھوٹ صرف جرم چھپانے کے لئے بولتا ہے۔ مجھے صرف جھوٹ کا علم تھا" جرم کا نہیں۔ میں نے اس جھوٹ کا پردہ چاک نہیں کیا۔ اس طرح وہ ہوشیار ہو جاتی۔ میں نے مناسب موقع کی تلاش شروع کردی لیکن زبیدہ کے اس رویے نے مجھے ایک مرتبہ پھر توڑ پھوڑ دیا اور لطف تو یہ ہے کہ میرے اس طرح ٹوٹنے کا اسے احساس بھی نہیں ہوا۔

میں نے ڈرائیور کو اعتماد میں لینے کی مجبوری قبول کی۔ میں نے اس سے کہا "اب جس روز بیگم صاحبہ باہر جائیں تو مجھے ٹیلی فون کر دینا اور انہیں کسی طرح باتوں میں لگا کر روک لینا۔ بس اتنی دیر کے لئے کہ میں یہاں پہنچ جاؤں۔ دفتر سے گھر تک بہ مشکل دس منٹ کی ڈرائیو ہے۔ میں اپنی گاڑی لے کر دس منٹ میں یہاں پہنچ جاؤں گا۔ گھر کے قریب گاڑی پارک کر کے ان کے نکلنے کا انتظار کروں گا۔ جیسے ہی وہ نکلیں گی میں ان کا تعاقب کر کے یہ دیکھنا چاہوں گا کہ وہ کہاں جاتی ہیں۔"

کئی دن گزر گئے لیکن زبیدہ کے باہر جانے کی اطلاع مجھے

"چلو وہ حصہ شاید خالی ہے۔"

نہیں ملی۔ اب تو مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ کہیں ڈرائیور بھی اس سے ملا ہوا تو نہیں ہے' دانستہ مجھے اطلاع ہی نہ کرتا ہو۔ بالآخر ایک روز مجھے یہ اطلاع مل گئی۔ میں نے اپنے منیجر کی گاڑی لی تاکہ اگر وہ عقبی آئینے سے دیکھے بھی تو اسے شک نہ گزرے۔ میں دفتر سے نکلا اور گھر سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔ کچھ دیر کے انتظار کے بعد اس کی گاڑی کوٹھی کے مرکزی دروازے سے نمودار ہوئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وہ خود موجود تھی۔ میں نے ایک مناسب فاصلے پر رہتے ہوئے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ میں نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا لیا تھا تاکہ وہ اچٹتی سی جھلک پر مجھے پہچان نہ لے۔ وہ تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہی تھی' جیسے اسے کہیں پہنچنے کی یا واپس آنے کی جلدی ہو۔ کئی مرتبہ وہ میری نگاہوں سے غائب ہوئی لیکن میں نے کمال ہوشیاری سے اسے جا لیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ کوئی اس کا تعاقب بھی کر سکتا ہے۔ اس کی گاڑی شہر کی حدود سے نکل کر مضافات کی طرف رواں دواں تھی۔ میں نے دیکھا' اس کی گاڑی نے بائیں طرف مڑنے کا سگنل دیا' رفتار دھیمی ہوئی اور بالآخر رک گئی۔ میں نے بھی کچھ فاصلے پر گاڑی کو روک لیا۔

سامنے چند جھگیاں تھیں۔ ان جھگیوں میں زیادہ تر فقیر پیشہ اور نشے باز لوگوں کا پڑاؤ تھا۔ میں نے اس بستی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا' دیکھ آج رہا تھا۔

زبیدہ نے گاڑی کو سڑک کے ایک کنارے پارک کیا۔ گاڑی لاک کر کے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی جھگیوں میں کہیں غائب ہو گئی۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ یہاں وہ کس سے ملنے آئی ہے؟ وہ نشے کی عادی تو نہیں کہ نشہ اسے یہاں کھینچ لاتا ہو۔ میں اس قسم کی جھگیوں کے اسرار سے خوب واقف تھا کہ میری تعمیر اسی خمیر سے ہوئی تھی۔ میں جتنا سوچتا جاتا تھا الجھن بڑھتی جاتی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ ایک تنگ سی گلی سے برآمد ہوئی۔ ا[illegible] تعاقب تو کیا رہ گیا تھا۔ میں ہارے ہوئے جواری کی طرح واپس آگیا۔ اب میں کسی کا تعاقب نہیں کر رہا تھا بلکہ ہر گاڑی میرا [illegible]قب کر رہی تھی۔ ہر گاڑی مجھ پر تھوکتی ہوئی گزر رہی تھی۔ میں سیدھا دفتر پہنچا اور وقتِ مقررہ پر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گھر پہنچنے پر اس نے میرا اس طرح استقبال کیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ [illegible] گھبرائی ہوئی تھی' نہ نشے میں لگتی تھی اور نہ غیر معمولی خوش۔ بس عام دنوں کی عام سی زبیدہ تھی وہ!

"کہاں گئی تھیں تم؟"

اس اچانک سوال سے وہ بوکھلا گئی "کہیں بھی نہیں' یہیں ہوں میں۔ کہاں جاتی۔"

"مجھے فریب نہ دو' بس اتنا بتا دو کہ آج اب سے کچھ دیر پہلے تم کہاں تھیں۔"

"میں نے کہا نا' کہیں نہیں گئی تھی۔"

"مجھ سے جھوٹ نہ بولو' مجھے فریب مت دو۔"

"کیسے جھوٹ نہ بولوں' کیسے فریب نہ دوں۔ یاد ہے تم نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا "زبیدہ! بعض فریب ایسے ہوتے ہیں جو اگر انسان دوسروں کو نہ دے تو آدمی کا دم نکل جائے۔"

"مگر میں دوسرا نہیں ہوں۔"

"یہی اس وقت میں نے کہا تھا۔"

"اس [illegible] تم میری بیوی نہیں تھیں۔"

"بس [illegible] میں سننا چاہتی تھی کہ اب میں تمہاری محبوبہ نہیں صرف بیوی ہوں بیوی!"

"مجھے بیکار باتوں میں نہ الجھاؤ۔ مجھے سچ چاہیے ہے۔"

"سچ چاہیے ہے تو سنو! میں اپنے باپ سے ملنے گئی تھی۔"

میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ "باپ سے! مگر تمہارا باپ تو۔۔"

"مرا نہیں' ابھی زندہ ہے۔ بس یہی کافی ہے یا تفصیل بھی سنو گے؟ لو سنو تفصیل عقیب علی خان' سنو تفصیل۔ میرا باپ ایک جدی پشتی فقیر ہے۔ جن جھگیوں کے پاس ابھی تم نے مجھے دیکھا تھا انہی غلیظ جھگیوں میں میری پرورش ہوئی۔ یہاں ہمارے چچا کی اور گھر بھی آباد تھے۔ چاچی شبیرن' چاچی خیراتی اور ماسی رنو مجھے اب تک یاد ہیں۔ مجھے اپنی ماں بھی یاد ہے جو میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بھیک مانگا کرتی تھی۔ بھیا کو اس کام سے نفرت تھی۔ وہ گھر سے بھاگ گئے۔ پڑھ لکھ کر اچھی نوکری ڈھونڈلی۔ ابا بھیک کے ٹکڑے چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ بھیا کیا کرتے' مجھے اس جوہڑ سے نکال لائے۔ ماں کب کی مر کھپ گئی تھی۔ میں وہاں کس کے سہارے رہتی۔ جب تک بھائی کے گھر میں رہی' ابا کو صرف خواب میں دیکھتی رہی۔ اب اپنے گھر کی ہوئی تو سوچا' خود مختار ہو گئی ہوں' صاحبِ حیثیت بھی ہوں' کبھی کبھی باپ کو دیکھ بھی آیا کروں گی اور اس فقیر کی مدد بھی کر دیا کروں گی۔ بیٹیوں کے دل بیٹوں کی طرح تھوڑی ہوتے ہیں' پھر اس نے میری لالی کو کاندھا نہیں دیا' میرے سر پر ہاتھ نہیں رکھا' مجھے سینے سے لگا کر دو آنسو نہ بہا سکا مگر ہے تو میرا باپ ہی نا۔ کیا صرف گلے دو گلے والے ہی باپ ہوتے ہیں' فقیر باپ نہیں ہوتے۔"

وہ نہ جانے کیا کچھ اور کب تک کہتی رہی۔ مجھے تو اتنا یاد ہے کہ میرے خواب ٹوٹ گئے تھے۔ میرے سامنے زبیدہ نہیں ایک بھکارن بیٹھی تھی جس کی آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہوئی تھیں' جس کے جسم پر کوڑھ کے بدنما داغ تھے۔ ہونٹوں پر صدا' ہاتھ میں کشکول تھا۔

میں پھر سے فقیر ہو گیا تھا۔ شبیرن بھکارن کی انگلی تھامے صدا لگا رہا تھا "اندھے محتاجوں کی مدد کرو' اندھے محتاجوں پر رحم کھاؤ۔"

کاروبارِ اجل

آج کے مہذب دور میں ایسے بے حس اور بے ضمیر لوگوں کی کمی نہیں جو بے اندازہ دولت رکھتے ہوئے بھی مزید دولت کے لیے معصوم اور بے گناہ انسانوں کو زہر پلا رہے ہیں۔ ان پست ذہنیت، سنگ دل لوگوں کی ہوسِ زر کتنے معصوموں کو زندگی جیسی نعمت سے محروم کر دینے کا سبب بنتی ہے۔ انہیں کچھ احساس نہیں۔

میرا نام جینن ٹرنر ہے۔ میری عمر آئندہ اکتوبر کی چار تاریخ کو پورے پچیس برس کی ہو جائے گی۔ میں ہالینڈ کے دارالحکومت ایمسٹرڈم کے ایک انٹر گریڈ اسکول میں ٹیچر ہوں۔ میرے والدین جو بہت ضعیف ہیں بقید حیات ہیں۔ دونوں ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میرے والد اور والدہ کو جو پنشن ملتی ہے اس میں وہ بخوبی گزارا کر لیتے ہیں، کیونکہ ان کے اخراجات بہت محدود ہیں۔ میں ان کی واحد اولاد ہوں جس پر ان دونوں نے دل کھول کر خرچ کیا تاکہ میری پرورش، تعلیم اور تربیت میں کوئی سقم نہ رہ جائے۔ تاہم انہوں نے میری ذات میں وہ کمزوریاں پیدا نہیں ہونے دیں، جو والدین کے بے جا لاڈ کی وجہ سے اکلوتی اولاد میں اکثر پائی جاتی ہیں۔ میری گھریلو زندگی ایک خاص نظم و ضبط کی پابند رہی۔ جب میں نے اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کر لی جو ہمارے ملک میں حکومت کے خرچ پر ہر شہری کو مفت فراہم کی جاتی ہے تو میرے والد نے خود ہی یہ فیصلہ کیا کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے معلمی کا پیشہ اختیار کروں۔ میری والدہ ایک تربیت یافتہ نرس تھیں اور والد ڈاکٹر تھے، لیکن انہوں نے میرے لیے ان پیشوں کو پسند نہیں کیا۔ جب میری عمر بیس سال کی تھی اور میں یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی تو مجھے اپنے ایک نوجوان لیکچرار جم بیلیزی گرینڈوف سے محبت ہو گئی۔ جو عام طور سے جم ہی کہلاتا تھا۔ میری اکیسویں سالگرہ پر ہم دونوں نے باقاعدہ منگنی کا اعلان کر دیا۔ میری امی اور ڈیڈی نے اس اعلان پر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور ہم دونوں کو قیمتی تحائف دیے۔

ہر چند کہ میرے والدین نے بڑی بھرپور اور پُرآسائش زندگی گزاری تھی، لیکن ہمارا تعلق ہمیشہ متوسط طبقے سے رہا۔ میرے والدین کا بینک بیلنس کبھی اس حد کو عبور نہ کر سکا جس کے بعد ان کا شمار امیروں میں ہو سکتا۔ یہی بات کیا کم تھی کہ ہالینڈ جیسے مہنگے ملک میں وہ مجھے اپنے خرچ پر یونیورسٹی کی تعلیم دلا رہے تھے اور وہ بھی ریٹائرمنٹ کے بعد۔

یونیورسٹی میں جم اقتصادیات کی کلاس لیتا تھا۔ وہ ماہر اقتصادیات تو نہیں تھا تاہم اس مضمون میں اس کی استعداد بہت اچھی تھی۔ منگنی کے بعد ہم دونوں نے اپنی آئندہ زندگی کی منصوبہ بندی کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہمارے بچے ہوں جن پر میں بھرپور توجہ دوں۔ یورپ میں عام ماؤں کے برعکس مجھے بچوں کی پرورش، نگہداشت، تعلیم اور تربیت براہِ راست اپنی نگرانی میں کرنا ہوگی۔ اس مقصد کے لیے مجھے ہر وقت گھر پر رہنا ہوگا جبکہ معاش کی تمام تر ذمہ داری جم اٹھانے والا تھا۔ میں نے جم کے منصوبے سے اتفاق کیا تھا، لیکن اس میں اتنی تبدیلی کر دی تھی کہ ہم دونوں کے صاحبِ اولاد ہونے تک میں ملازمت کروں گی اور اپنی آمدنی اپنے بچوں کی خاطر جمع کروں گی۔

چنانچہ میں نے اپنے والدین اور منگیتر کی اجازت سے ایک نجی کمپنی میں شام کے وقت دو گھنٹوں کے لیے کلرک کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ کمپنی نے مجھے بڑا اچھا معاوضہ دینا منظور کیا تھا۔ یہ کمپنی جس کا نام ٹریڈ انٹرنیشنل تھا درآمد اور برآمد کا کاروبار کرتی تھی۔ اس کے پانچ ڈائریکٹر تھے جن میں تین ڈچ اور دو بھارتی تھے۔ ان دونوں بھارتیوں کی قومیت انگلش تھی۔ یعنی یہ دونوں پیدا تو ہندوستان میں ہوئے تھے لیکن پچیس برس پہلے ترکِ وطن کر کے انگلستان آ گئے تھے اور وہیں کی قومیت اختیار کر لی تھی۔ اب وہ یورپ کے مختلف ممالک میں درآمدی و برآمدی کاروبار کر رہے تھے۔ فرانس میں بھی انہوں نے اسی نام سے ایک فرم قائم کی ہوئی تھی جس میں ان دونوں کے علاوہ تین فرانسیسی ڈائریکٹر بھی تھے۔

اس فرم کا ایک منیجر تھا جو میرا ہم وطن تھا اور مجھ پر بہت مہربان تھا۔ اس دفتر میں میرے علاوہ متعدد لڑکے اور لڑکیاں پارٹ ٹائم ملازمت کرتے تھے۔ مستقل ملازموں کی تعداد بارہ تھی جن میں چار لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ میرے ذمے غیر ملکی فرموں اور افراد سے خط و کتابت کی فائلوں کی دیکھ بھال اور

انہیں جلنے والے خطوط کی نقلوں کو صحیح فائلوں میں ترتیبی نمبروں کے ساتھ لگانے کا کام تھا۔ اس دفتر سے ہر روز تقریباً دو درجن خطوط جاتے تھے اور لگ بھگ اتنے ہی موصول ہوتے تھے۔

یہ فرم دنیا کی ہر شے درآمد کرتی تھی۔ اسی طرح ہالینڈ سے برآمد ہوسکنے والی ہر چیز دوسرے ضرورت مند ملکوں کو برآمد بھی کیا کرتی تھی۔ اس میں کسی خاص جنس کی تخصیص نہیں تھی۔ البتہ مختلف چیزوں کے لیے علیحدہ علیحدہ شعبے ضرور قائم تھے۔ ان میں ایک شعبہ ادویات کا بھی تھا۔ اس شعبے کے ذمے ہالینڈ میں..... تیار ہونے والی ادویات کی برآمد اور دوسرے ملکوں میں تیار ہونے والی دواؤں کی درآمد دونوں ہی کام تھے۔ ایک دن اتفاق سے شعبۂ ادویات کا اطالوی نژاد سربراہ مائیکل مہ یتو ایک فائل لے کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ افغانستان کی ایک فرم ایک خاص قسم کا سیال جو کھانسی کے شربت میں بہتر اثر انگیزی کے لیے شامل کیا جاتا ہے برآمد کرنا چاہتی ہے۔ چونکہ یہ ایک تجارتی راز ہے اور کھانسی کا شربت تیار کرنے والے فارماسیوٹیکل ادارے اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے لہٰذا میں اس فائل اور اس میں موجود تمام خط و کتابت کو انتہائی احتیاط اور رازداری کے ساتھ اپنی تحویل میں رکھوں۔ اس فائل کو کبھی کسی غیر متعلق شخص کو نہ دکھایا جائے خواہ وہ اس کمپنی کا ملازم ہی کیوں نہ ہو۔ مائیکل یہ ہدایات اور فائل دے کر چلا گیا اور میں اپنے فطری تجسس سے مجبور ہو کر فائل میں موجود خطوط کو غور سے پڑھنے لگی۔

فائل کے مطالعے سے مجھے پتہ چلا کہ پاکستان کے شمال میں افغانستان کی سرحد پر سنگلاخ پہاڑی مقدوں میں جدید ترین آلات سے مزین ایک فیکٹری قائم ہے جو اس علاقے میں پیدا ہونے والی ایک مخصوص بوٹی کا عرق کشید کر کے ایک ایک پونڈ کی بوتلوں میں پیک کرتی ہے۔ اس ایک پونڈ سیال کی قیمت پانچ ہزار امریکی ڈالر ہوتی ہے۔ اسی فائل میں منسلک ایک خط سے مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ امریکہ میں اس سیال کی زبردست مانگ ہے اور وہاں کے تجارتی ادارے دس ہزار ڈالر میں ایک پونڈ سیال خریدنے کی پیشکش کر چکے ہیں۔

فطری طور پر مجھے بڑا تعجب ہوا کہ مشرقی ممالک میں ایسی عجیب و غریب بوٹی پیدا ہوتی ہے جس کے خواص اس قدر حیران کن ہیں اور اس کی قیمت جواہرات سے بھی زیادہ ہے۔ پھر یہ کہ اس سیال کی بلد بندی اور نقل و حمل بھی بے حد آسان اور سستی ہوگی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہماری فرم پانچ ہزار ڈالر میں یہ سیال خرید کر دس ہزار ڈالر میں امریکہ برآمد کرنا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے اتنے کثیر منافع والا کاروبار ایک ایسا تجارتی راز ہے جو اعلیٰ درجے کے حفاظتی انتظامات کا تقاضہ کرتا ہے۔ فائل پڑھ کر میں نے ایک محفوظ الماری میں مقفل کر دی اور دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

میں ہر سہ پہر تین بجے دفتر جاتی اور پانچ بجے تک کام کرتی۔ میری پڑھائی بھی جاری تھی اور جم سے ملاقاتیں بھی۔ یونیورسٹی کی تعلیم مکمل ہونے میں ابھی ایک سال باقی تھا جس کے بعد مجھے فرصت ہی فرصت تھی۔ میں نے اپنی جزوقتی ملازمت سے حاصل ہونے والی آمدنی کو ایک مخصوص بنک اکاؤنٹ میں جمع کرانا شروع کر دیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ بنک میں اکاؤنٹ کھلوانے کے لیے جم خود میرے ساتھ گیا تھا۔ اس نے ہی بنک کے فارم بھرے تھے۔ اس دن میں بے حد خوش تھی۔ مجھے اپنا مستقبل بہت تابناک نظر آ رہا تھا۔

ہر ہفتے جم مجھ سے پوچھا رہتا تھا کہ بنک میں پیسے جمع کرائے یا نہیں۔ میں اپنے اکاؤنٹ کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی فکر میں مبتلا رہتی تھی۔ اگرچہ جم کو بھی کچھ کم فکر نہ تھی۔ میں ہر ہفتے اپنی تنخواہ کا چیک سب سے پہلے بنک جاتی پھر گھر آتی تھی۔ ایک سال اسی انداز سے گزر گیا، اور میں امتحان دے کر فارغ ہو گئی۔ نتیجہ آنے میں کئی ہفتے تھے۔ میں چاہتی تھی کہ جب تک نتیجہ آئے اور میں کسی اسکول میں بطور ٹیچر کام شروع کروں فرصت کے ان دنوں میں بھی کام کر کے مزید پیسے کما لوں۔ چنانچہ میں نے اپنی فرم کے منیجر سے بات کی۔ وہ مجھے کل وقتی ملازمت دینے پر رضامند ہو گیا اور میں چار سو گلڈر فی ہفتہ پر ملازم ہو گئی، لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔ نتیجہ آنے کے بعد مجھے لازمی طور پر سرکاری اسکول میں ملازمت کرنا پڑی۔ بطور ٹیچر میری تنخواہ خاصی اچھی تھی اور کام بھی زیادہ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ البتہ اب میں جزوقتی ملازمت نہیں کر سکتی تھی۔ ہالینڈ میں سرکاری ملازمین پر اس قسم کی پابندی ہوتی ہے۔ مجبوراً مجھے پرائیویٹ فرم سے مستعفی ہونا پڑا۔ اسکول کی ملازمت کے دوران میں متواتر یہ سوچا کرتی تھی کہ میں اپنے فالتو وقت کو کیش نہیں کر سکتی۔ مجھے صرف اپنی تنخواہ پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے جو میرے اپنے اخراجات کے لیے تو بہت کافی تھی لیکن مستقبل کے لیے زیادہ سے زیادہ سرمایہ جمع کرنے والا منصوبہ معطل ہو کر رہ گیا تھا۔ اب تک میں پانچ ہزار گلڈر کے لگ بھگ

ہی جمع کر پائی تھی کہ حالات بدل گئے۔ میں نے جم سے
مشورہ کیا تو اس نے سختی کے ساتھ میری اس تجویز کو
مسترد کر دیا کہ میں اسکول کی نوکری چھوڑ کر اپنی پہلی ملازمت
پر واپس چلی جاؤں جہاں میری آمدنی میں اضافے کے بہت
امکانات تھے۔ جم نے مجھے متنبہ کیا کہ درس و تدریس کا معزز
پیشہ چھوڑ کر میں عام نوکریوں کا خیال بھی دل میں نہ لاؤں
خواہ اس میں کتنا ہی فائدہ نظر آئے۔ جم کا مشورہ اصولی طور پر صحیح
تھا۔ ڈچ معاشرے میں جو توقیر استاد کی ہوتی ہے وہ کسی
کمپنی کے بڑے سے بڑے افسر کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔
جم چونکہ خود بھی اسی پیشے سے وابستہ تھا اس لیے وہ بھی یہ
چاہتا تھا کہ اس کی ہونے والی شریک حیات بھی اس کی ہم پیشہ
ہو اور یوں سوسائٹی میں شامل ہونے والے اس نئے خاندان
کی قدر و منزلت مثالی ہو۔

جم کی مخالفت سے میں مجبور ہو گئی اور خاموشی کے ساتھ
اسکول کی ملازمت کرتی رہی۔ ملازمت کے ایک سال بعد
جم نے شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اب ہمارے پاس کوئی وجہ
نہیں تھی کہ اپنی شادی کو مزید ملتوی کرتے۔ میرے ضعیف والدین
بھی یہی چاہتے تھے کہ میں اب رشتۂ ازدواج میں منسلک
ہو کر باقاعدہ ذمے دار زندگی میں داخل ہو جاؤں۔ میں خود
بھی اب شادی کر لینا چاہتی تھی۔ دو ڈھائی سال کے عرصے
میں جم نے میرے ساتھ جس محبت اور خلوص کا اظہار کیا تھا
اس نے میرے دل میں اس کے لیے اچھے نقش ابھار دیے تھے۔
لیکن ابھی میں اتنی رقم جمع نہیں کر سکی تھی کہ شادی کے اخراجات
کے بعد آئندہ کے لیے کچھ بچ سکے۔ ایک دن جم کے تقاضے
کے جواب میں میں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو اس نے
مجھے حیران کر دیا۔ جم نے بتایا کہ اس تمام عرصے میں وہ بھی کچھ
نہ کچھ پس انداز کرتا رہا ہے اور اب اس کے پاس پندرہ ہزار
گلڈر سے بھی زیادہ رقم جمع ہو چکی ہے۔ جم نے کہا کہ شادی
کے بعد آخر اس رقم کا کیا مصرف ہو گا۔ ظاہر ہے ہمارے
ہی کام آئے گی۔

مارچ ۱۹۷۷ء کا ذکر ہے اسی سال بہار کے موسم میں ہم
شادی کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے کہ ایک دن مائیکل ہورنو نے
مجھے فون کیا۔

"بے بی! تم مجھے بھول تو نہیں گئی ہو؟"

میں اسے پہچان تو گئی تھی لیکن کئی برس بعد اس کی آواز
سنی تھی اس لیے تصدیق یقین کے لیے پوچھا۔

"تم ٹریڈا انٹرنیشنل کے شعبہ ادویات کے انچارج
مائیکل ہورنو؟"

"بالکل ٹھیک سمجھیں مس گلمر! اب یہ بتاؤ کہ تم کمانے
کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"نا ممکن مسٹر مائیکل! اب میں سرکاری ملازم ہوں۔ نجی
ملازمت نہیں کر سکتی۔"

"تم سمجھی نہیں۔ میرا مطلب ہے تمہیں مشرق کا سفر
کرنا ہو گا۔ کمپنی ایک عارضی کام کے لیے اپنا نمائندہ بھیجنا چاہتی
ہے۔ ہمارے پاس ایسا کوئی آدمی نہیں جسے عارضی طور پر فارغ
کر کے بھیجا جا سکے۔ تم ہمارے لیے اجنبی نہیں ہو۔ پھر دیانتدار
ہو۔ ایک ہفتے کی چھٹی تو تم لے سکتی ہو۔ بڑا معقول معاوضہ
ملے گا اور سفر خرچ الگ۔"

مائیکل کی پیشکش مجھے خاصی پرکشش معلوم ہوئی۔
میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

"بالکل بالکل مسٹر مائیکل! ایک ہفتہ کیا ایک ماہ کی چھٹی
بھی مل سکتی ہے، مگر مجھے کرنا کیا ہو گا؟"

"تھوڑا صبر سے کام لو بے بی! اگر تم تیار ہو تو کل صبح
دفتر آ جاؤ۔ آمنے سامنے بیٹھ کر بات طے ہو جائے گی۔"

"میں ضرور آ جاؤں گی۔ بائی بائی مسٹر مائیکل!"

فون بند کرتے ہی میں سیدھی جم کے فلیٹ پہنچی۔ وہ
گھر میں بیٹھا کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کر رہا تھا۔ مجھے جوش
میں بھرا ہوا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ "خیریت تو ہے جینی! تمہارا
سانس کیوں پھول رہا ہے؟"

"جم! مزہ آ گیا۔ مجھے صرف ایک ہفتے کے لیے کسی مشرقی
ملک جانے اور وہاں ٹریڈا انٹرنیشنل کی نمائندگی کرنے کی پیشکش
کی گئی ہے۔ بہترین معاوضہ اور سفر خرچ علیحدہ۔ مزہ آ گیا نا؟"

جم آنکھیں جھپکانے لگا، جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ
آیا ہو۔ "وضاحت سے بات کرو جینی! معاملہ کیا ہے۔ کہیں
کوئی چکر بازی تو نہیں ہے اس میں؟"

"کوئی چکر وکر نہیں ہے۔ یہ وہی کمپنی ہے جہاں میں پہلے
پارٹ ٹائم کرتی تھی۔ وہ لوگ مجھ پر بہت بھروسہ کرتے ہیں۔
ان کے پاس فوری طور پر کوئی کارکن فارغ نہیں ہے جسے وہ
بھیج سکیں لہٰذا انہوں نے ابھی ابھی فون کر کے مجھے آفر کی ہے۔"

"اور تمہیں کرنا کیا ہو گا؟ میرا خیال ہے تم تجارتی مذاکرات
وغیرہ کی تکنیک سے تو واقف نہیں ہو۔"

"کل صبح مجھے کمپنی بلایا گیا ہے۔ وہیں بتایا جائے گا کہ
مجھے کیا کرنا ہے۔ آخر وہ لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ انہوں
نے ضرور یہ جان لیا ہو گا کہ میں ان کا کام کر سکوں گی۔ اسی لیے

مجھے آتی ہی ہے انہوں نے۔

"یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ خیر تم کل جاؤ اور معلوم کرو وہ کیا چاہتے ہیں۔ مگر جیسن خیال رکھنا کہ تم مجھ سے مشورہ کیے بغیر ان سے کوئی بھی وعدہ کر آنا۔"

میں ایک چھوٹی سی بچی کی مانند اس چھٹی کی خوشی سے اچھلنے کودنے لگی۔ اپنی ممی اور ڈیڈی کو بتایا۔ ممی تو خوش ہو گئیں۔ ڈیڈی البتہ ممی کی طرح جوش کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ انہوں نے بھی سوالات کر کر کے میرا ناک میں دم کر دیا۔ ڈیڈی بار بار یہی کہتے تھے کہ اتنی دور کا سفر میں تنہا کیسے کروں گی۔ تو میں نے ان سے کہا کہ وہ مجھے ہمیشہ چھوٹی سی بچی ہی سمجھتے رہیں گے۔

اگلے دن میں نے اسکول سے چھٹی کی اور مقررہ وقت پر ٹریڈا انٹرنیشنل کے دفتر پہنچ گئی۔ مائیکل میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی خوشدلی سے مسکرایا اور سامنے کی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے میز کی دراز سے وہی فائل نکالی جو کبھی اس نے مجھے محفوظ اور مقفل کر کے رکھنے کے لیے دی تھی۔

"مس کترا تمہیں یہ فائل یاد ہے؟" اس نے فائل میز سے ایک فٹ بلند کر کے مجھے دکھاتے ہوئے پوچھا۔

میں قصداً انجان بن گئی۔ "میں کچھ نہیں سمجھی مسٹر مائیکل! میری تحویل میں تو درجنوں فائلیں رہتی تھیں۔"

"میرا مطلب ہے یہ وہ خصوصی فائل ہے جس کے لیے میں نے تمہیں کچھ ہدایات دی تھیں۔ مثلاً میری اجازت کے بغیر کسی کو یہ فائل نہ دکھائی جائے خواہ وہ دفتر کا آدمی ہی کیوں نہ ہو اور یہ کہ اسے دوسری فائلوں سے الگ مقفل کر کے رکھا جائے۔"

"ہاں مسٹر مائیکل یاد آ گیا۔ یہ شاید کسی جڑی بوٹی کے عرق کے بارے میں ہے۔"

مائیکل نے مجھے تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو گویا تم نے اس کا مطالعہ کیا ہے؟"

میں گھبرا گئی، لیکن فوراً خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی۔ "جی ہاں کچھ سرسری طور پر دیکھا تھا۔ اسے مطالعہ تو نہیں کہہ سکتے۔ چونکہ یہ ایک عجیب و غریب چیز کے بارے میں تھی اس لیے اتنی بات مجھے یاد رہ گئی۔ تفصیل کا مجھے کوئی علم نہیں۔"

"چلو خیر، تفصیل کا علم اب ہو جائے گا۔" مائیکل کچھ توقف کر کے دفتر میں موجود اسٹاف کا جائزہ لینے لگا۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں منہمک تھا۔ ہماری طرف توجہ دینے کی کسی کو بھی فرصت نہیں تھی۔

مائیکل نے فائل میری طرف بڑھائی۔ "یہ لو اب اس کا مطالعہ ذرا غور سے کرو۔ میں باس سے مل کر آتا ہوں۔"

باس سے مراد فرم کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین سے تھی جو برطانوی قومیت کا بھارتی نژاد شخص کرشن سنگھ تھا۔ یہ شخص زیادہ تر غیر ملکی دوروں پر رہتا تھا۔ میری ملازمت کے دوران وہ صرف دو بار ہالینڈ آیا تھا۔ میں اسے پہچانتی تھی۔ وہ طویل قامت تقریباً پینتالیس سالہ صحت مند شخص تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت بے پناہ سنجیدگی طاری رہتی تھی، جس میں تمکنت سی بھی تھی۔ وہ بہت کم گو تھا اور اپنی فرم کے مختلف شعبوں کے سربراہوں سے بھی صرف مطلب کی بات کرتا تھا۔ بقیہ کارکنوں سے براہ راست اسے بات کرتے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔

وہ جب بھی ہالینڈ میں ہوتا بڑی پابندی سے صبح نو بجے دفتر آتا اور اپنے مخصوص کمرے میں بیٹھتا۔ کوئی شخص اپائنٹمنٹ کے بغیر اس سے مل نہیں سکتا تھا۔ اس کی سیکرٹری جو اس کے ساتھ سفر میں بھی رہتی تھی۔ اس کے تمام پروگرام ترتیب کرنے کی ذمے دار تھی۔ اس کا ایک ایک منٹ گنا ہوا ہوتا تھا۔ ملاقاتوں اور ملاقاتیوں کے بارے میں وہ بہت محتاط تھا۔ کسی بھی ملنے والے کو پہلے اس کی سیکرٹری سے ملنا پڑتا تھا جو اسے بیشتر یہ مشورہ دیتی کہ دفتر کے متعلقہ انچارج سے مل کر اپنا مسئلہ حل کرے۔ جب وہ محسوس کرتی کہ باس سے ملاقات ضروری ہے تو وہ پہلے کرشن سنگھ کو تمام معاملہ سمجھاتی۔ وہ قائل ہو جاتا کہ واقعی یہ ایک ضروری ملاقات ہے تب کہیں جا کر وقت مقرر ہوتا۔ کرشن سنگھ کے اس سخت رویے کی وجہ سے فرم کے تمام ملازمین پر اس کا رعب طاری رہتا تھا۔ لوگوں کو رکھنے یا نکالنے میں وہ کبھی دخل نہ دیتا۔ یہ کام اس کی فرم کا منیجر خود اپنی صوابدید پر کرتا تھا۔ اس کا پارٹنر منوہر شاکر بھی کرشن سنگھ کی طرح برطانوی قومیت رکھتا تھا اور زیادہ تر لندن میں رہتا تھا۔ کبھی کبھار وہ کرشن سنگھ کے ساتھ ہالینڈ آ جاتا۔ لیکن کاروبار کے سلسلے میں کسی سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ اس کے لیے کوئی کمرہ یا کیبن مخصوص نہیں تھا۔ وہ آتا تو کرشن سنگھ کے کمرے میں ہی بیٹھتا تھا۔ جب میں اس کمپنی میں ملازم تھی تو مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ فرم کے لندن آفس کا کرتا دھرتا ہے اور برانچوں کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ یہ کام صرف چیئرمین کرشن سنگھ کے ذمے تھا۔ ہالینڈ میں اس فرم کا رجسٹریشن ایک آزاد تجارتی ادارے کی حیثیت میں ہوا تھا جس میں ان دو بھارتیوں کے علاوہ تین مقامی ڈائریکٹرز بھی تھے۔ یہ تینوں

تینوں ڈائریکٹر جنہوں نے فرم کے کاروبار میں کافی سرمایہ لگا رکھا تھا کبھی کبھار نظر آتے تھے۔ کشن سنگھ ان تینوں کو ان کے حصص کے مطابق منافع ادا کرتا تھا لیکن عملی طور پر ان سے کوئی کام نہیں لیتا تھا۔

تفتیشی افسر کا نوٹ:۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مس ثمرا اپنے تین ہم وطن ڈائریکٹروں کو اس کیس میں ملوث ہونے سے بچانا چاہتی ہے۔ یہ بات کچھ عجیب معلوم ہوتی ہے کہ بحیثیت ڈائریکٹر انہیں فرم کی کاروباری سرگرمیوں سے بالکل ہی لاتعلق رکھا گیا ہو اور انہیں یہ علم ہی نہ ہو کہ جس فرم میں ان کا سرمایہ لگا ہوا ہے، اس کی آمدنی کے ذرائع کیا ہیں ..... (انسپکٹر)

مائیکل مجھے فائل دے کر چلا گیا تھا۔ میں اس کی میز پر فائل کھولے مطالعے میں محو ہو گئی۔ اب اس فائل میں متعدد خطوط کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ان خطوط میں ایک خط کابل کے کسی خیال خان کا بھی تھا جس نے لکھا تھا کہ اس فرم کا نمائندہ اس سے ذاتی طور پر ملا تھا اور اس کی فیکٹری کا معائنہ بھی کیا تھا جہاں اس مخصوص ہربل (بوٹی) کا عرق کشید ہوتا ہے جو ایلوپیتھی سسٹم آف میڈیسن میں بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال ہو رہا ہے۔ اس خط کے مطابق لندن اور نیویارک کے کئی لوگوں نے اس عرق کا استعمال کیا ہے اور اسے بہت مفید پایا ہے۔
خیال خان نے پیش کش کی تھی کہ وہ ایک ہزار امریکی ڈالر میں ایک پونڈ عرق فراہم کر سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ خریدار کا نمائندہ خود کابل آکر ڈیلیوری حاصل کرے۔ وہ کابل سے باہر کسی بھی جگہ بذریعہ ڈاک یا ہوائی جہاز یہ قیمتی عرق نہیں بھیج سکتا۔

یہ خط انگریزی میں تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نیم خواندہ شخص نے اسے لکھا تھا۔ ہجوں اور گرامر کی متعدد غلطیوں کے علاوہ اس کی تحریر بھی بہت بھونڈی تھی۔ اس کا لیٹر پیڈ چھپا ہوا تھا جس پر "خیال خان اینڈ کمپنی۔ ایکسپورٹرز اینڈ امپورٹرز" تحریر تھا۔ اس کمپنی کا پتہ چھپا ہوا نہیں تھا، بلکہ ختائیہ اسٹریٹ، کابل کے پتے کی مہر لگی ہوئی تھی۔

میں اس خط کے مندرجات اور اسے بھیجنے والے کے متعلق سوچنے لگی۔ پہلا خیال جو میرے ذہن میں اس پارٹی کے بارے میں آیا وہ یہ تھا کہ یہ کوئی اچھا کاروباری ادارہ نہیں ہے کیونکہ اس کے لیٹر پیڈ سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا کوئی مستقل پتہ نہیں ہے۔ پتے کی مہر لگانے کا واضح مطلب یہ تھا کہ اس فرم کا پتہ بدلتا رہتا ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ عرق کشید کرنے والی فیکٹری کا مالک ہونے کے باوجود یہ شخص یا ادارہ اتنا گیا گزرا کیوں ہے کہ غیر ممالک کی کمپنیوں سے خط و کتابت کے لیے معقول اسٹیشنری کا بندوبست بھی نہیں کر سکتا۔

مائیکل کی واپسی سے پہلے میں یہ اندازہ کر چکی تھی کہ مجھے کمپنی کا نمائندہ بنا کر کابل بھیجا جائے گا تاکہ میں ذاتی طور پر مال کی ڈیلیوری لوں اور طیارے کے ذریعے اسے یہاں لے آؤں۔ بظاہر بہت آسان کام نظر آتا تھا۔ میں نے خود کو ذہنی طور پر اس کام کے لیے آمادہ کر لیا۔ مائیکل باس سے بات چیت کر کے جب واپس آیا تو بہت خوش تھا۔ میں نے فائل بند کر کے اس کی طرف بڑھا دی جسے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا اور ایک ملحقہ کیبن میں لے گیا جہاں کوئی نہیں تھا۔

"مس ثمرا! میں نے تمہارے کام کا مطالعہ کیا ہے۔ تم ایک ذہین اور حوصلہ مند لڑکی ہو۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو اور ہر قسم کے حالات کا بہادری سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ میرا مطلب ہے غیر ممالک کے سفر میں اکثر غیر متوقع حالات سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تمہاری ان صلاحیتوں کے پیش نظر میں نے باس سے تمہاری سفارش کی تھی کہ تمہیں فرم کا نمائندہ بنا کر کابل بھیج دیا جائے۔ تم زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں یہ کام انجام دے سکتی ہو۔ کیا خیال ہے؟"
میں نے اپنا اندرونی جوش دبا کر مائیکل سے پوچھا۔
"مجھے تنہا جانا ہوگا؟"
"یقیناً۔ یہ کوئی پیرس یا جنیوا کا سفر نہیں ہے۔ یہ مشرق کا سفر ہے جس پر بہت خرچ آتا ہے۔ ایک ہی کام کے لیے دو افراد کو بھیجنے کا مطلب دوگنا خرچ ہے۔ پھر مسئلہ تمہارے معاوضے کا بھی ہے۔ ہم یہی زائد خرچ بچا کر تمہارے معاوضے میں اضافہ کر سکتے ہیں۔"
"مجھے کیا معاوضہ ملے گا؟" آخر میں نے تھوڑا سا ہچکچا کر پوچھ ہی لیا۔
"میں نے باس سے سفارش کی ہے کہ تمہیں دو ہزار ڈالر علاوہ اخراجات کے دیے جائیں۔ میرا خیال ہے باس اس تجویز کو منظور کرے گا۔"
"دو ہزار ڈالر!" میں نے دل میں دہرایا۔ خدا نے میری سن لی تھی۔ اس رقم سے میرے بہت سے کام نکل سکتے تھے

پھر میں پورے اطمینان کے ساتھ جم سے شادی کر سکتی تھی۔ میں اپنے سفر خرچ میں بھی کفایت کر کے مزید رقم پس انداز کر سکتی تھی۔۔۔ مجھے سوچتے دیکھ کر مائیکل نے فکرمندی سے پوچھا "کیوں۔ کیا معاوضہ کم ہے؟"

جواب میں میں ہنس دی "مسٹر مائیکل! میں معاوضے کے بارے میں نہیں سوچ رہی ہوں۔ وہ تو آپ نے جو تجویز کیا ہے مناسب ہی ہے۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ صرف ایک ہفتے میں میں مشرقی ملکوں کی کیا سیر کر سکوں گی؟"

مائیکل نے قہقہہ لگا کر کہا "نادان لڑکی! اس سفر میں سیر سپاٹے کی بات نہ کرنا۔ اس مقصد کے لیے ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ اس مرتبہ تو تمہیں مال لے کر فوراً واپس آنا ہے۔ ہمیں امریکی فرموں سے مقابلہ درپیش ہے۔ اگر انہوں نے ہم سے پہلے سودا طے کر لیا تو ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ اس سودے میں کمپنی کو لاکھوں ڈالر کے منافع کی توقع ہے۔ اگر تم نے کامیابی سے اس کام کو انجام تک پہنچا دیا تو۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں پورے ایک ماہ کے لیے مشرق کی سیر کا موقع فراہم کراؤں گا۔"

"اوہ تو یہ بات ہے مسٹر مائیکل! میں معذرت چاہتی ہوں۔ اب آپ اطمینان رکھیں میں مال لے کر ایک لمحے بھی بلاضرورت نہیں ٹھہروں گی اور فوراً واپس آ جاؤں گی۔"

مائیکل خوش ہو گیا "ہاں بے بی! ہم یہی چاہتے ہیں کہ تم ایک فلائٹ سے جاؤ اور دوسری سے واپس آ جاؤ۔"

"اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟" میں نے سوال کیا۔

"تمہیں روانگی کی تیاری شروع کر دینا چاہیے۔ تم سے بات کرنے کے بعد اب یہاں سے کابل ٹیلی گرام جائے گا جس کا جواب آئندہ اڑتالیس گھنٹوں میں آ جانا چاہیے۔ اس کے فوراً بعد تمہاری روانگی ہے۔ سمجھ گئیں؟"

میں مسکراتی ہوئی کھڑی ہو گئی "میں چلتی ہوں۔ جب ضرورت ہو آپ مجھے فون کر کے طلب کر سکتے ہیں۔"

٭

ٹریڈ انٹرنیشنل کے دفتر سے پہلے میں جم کے پاس گئی اور اسے مائیکل سے ہونے والی تمام گفتگو سنائی۔ میں نے محسوس کیا کہ جم فکرمند ہو گیا ہے۔ اسے خاموش دیکھ کر مجھے غصہ سا آ گیا "کیا بات ہے جم! کیا تم مجھے ملنے والے اس چانس سے خوش نہیں ہو؟ کیا اتنے تھوڑے عرصے میں اتنی آسانی کے ساتھ اتنی رقم کسی اور ذریعے سے کمانا ممکن ہے؟ تم جانتے ہو ہم دونوں کے لیے اس وقت رقم کی کیا اہمیت ہے۔ پھر بھی تم اس چانس پر خوش نہیں ہوتے۔"

جم مجھے بدستور سوچتی ہوئی آنکھوں سے گھورتا رہا۔ پھر بولا "ڈیئر جین! میری فکرمندی کی وجہ صرف یہ ہے کہ آخر ایسی کیا خاص بات ہے کہ اتنے سے کام کا اتنا بھاری معاوضہ دیا جا رہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ امپورٹ کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ مال بیچنے والا خریدنے والے کے نمائندے کو ذاتی طور پر ڈلیوری دے گا۔ دنیا بھر میں درآمدی اور برآمدی تجارت ٹھوس اصولوں کے تحت ہوتی ہے۔ بنکوں کے ذریعے رقم کی ترسیل عمل میں آتی ہے اور مال ہوائی ایئر یا بحری جہازوں کے ذریعے روانہ کیا جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں ایسی ہیں جو میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ میری خوشی یا ناخوشی کا سوال نہیں ہے میں تو معاملات کے اس غیر منطقی پہلو سے پریشان ہوں۔"

"ارے جم! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ مال بیچنے والی پارٹی قطعی جاہل ہے۔ انگریزی کے دو جملے تو صحیح لکھ نہیں سکتی۔ تم جانتے ہو مشرقی ممالک میں لوگ ہمارے جیسے نہیں ہوتے وہاں تو بے شمار لوگ لکھ پتی ہونے کے باوجود بنکوں میں روپیہ نہیں رکھتے۔ بس یہی سمجھ لو کہ یہ پارٹی بھی ایسی ہی ہے۔ لہٰذا ہماری فرم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کی شرائط پر ہی معاملہ طے کیا جائے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ منافع کی شرح اتنی زیادہ ہے کہ کمپنی آسانی کے ساتھ اپنا نمائندہ کابل بھیج سکتی ہے۔ اس طرح وقت بھی بچے گا اور امریکی فرموں سے مقابلہ بھی آسانی سے ہو سکے گا۔"

"تم نے اچھی طرح اطمینان کر لیا ہے کہ جو مال تم لے کر آؤ گی اس کی نوعیت غیر قانونی نہیں ہے؟"

"ارے جبھی ظاہر ہے کہ باقاعدہ خط و کتابت ہو رہی ہے۔ صاف صاف لکھا جا رہا ہے کہ افغانستان کے پہاڑوں میں وافر مقدار میں پائی جانے والی بوٹی کا عرق ہے جس کی کشید کے لیے وہاں ایک کارخانہ بھی نصب ہے۔ اس کارخانے کا معائنہ بہت سے مغربی ممالک اور امریکی فرموں کے نمائندوں نے بھی کیا ہے۔ اگر یہ کوئی غیر قانونی کام ہوتا تو اتنے کھلے بندوں یہ فیکٹری کام کر سکتی تھی؟"

"بظاہر تو تمہاری دلیل وزنی معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال اللہ کا نام لے کر جاؤ۔ کب روانگی ہے؟"

"ابھی پتہ چلے گا۔"

جم سے فارغ ہو کر میں گھر پہنچی جہاں میرے ڈیڈی نے بھی جرح کر کے میرا ناک میں دم کر دیا۔ وہ اس پہلو پر زیادہ زور دے رہے تھے کہ ایک نوجوان تنہا لڑکی مشرق کے وحشیوں میں کس طرح محفوظ رہے گی۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح میں اپنے

ڈیڈی اور ممی کو بھی رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ میں اس قدر خوش تھی کہ مجھے اپنی روح ہواؤں میں اڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں ایک ایک لمحہ گن رہی تھی۔ جب بھی فون کی گھنٹی بجتی میں لپک کر اٹھاتی مبادا مائیکل نے طلب کیا ہو۔

میں نے اسکول سے پندرہ دن کی چھٹی کے لیے درخواست بھی تیار کر لی تاکہ اگلے دن اسے منظور کرا لوں۔

میری توقع کے عین مطابق تیسرے دن ہی مائیکل کا فون آ گیا۔ اس نے ہدایت کی کہ میں اگلے دن کے ایل ایم کی فلائٹ سے کابل روانگی کے لیے تیار رہوں۔ اس نے بتایا کہ میرے لیے ویزا اور زرمبادلہ وغیرہ کا انتظام ایئر لائن کے اسٹاف نے کر دیا ہے۔ مائیکل کی ہدایت کے مطابق مجھے فوری طور پر اپنا پاسپورٹ کے ایل ایم کے دفتر میں سیلز منیجر کو پہنچانا تھا۔

فون پر ضروری ہدایات لے کر میں بڑے جوش و خروش میں گھر سے نکلی اور سب سے پہلے کے ایل ایم کے مقامی دفتر جا کر انہیں اپنا پاسپورٹ دیا اور سیلز منیجر کے کاغذات پر دستخط کیے۔ وہاں سے فارغ ہو کر اپنے اسکول پہنچی اور ہیڈ مسٹریس کو دو ہفتوں کی چھٹی کے لیے درخواست دی۔ اسے بڑا تعجب ہوا کہ آخر مجھے اتنی طویل چھٹی کی کیا ضرورت پیش آ گئی لیکن میں نے ہیڈ مسٹریس اور اسکول میں اپنی دوسری ساتھی ٹیچروں کو اپنے سفر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں پھر جم کے پاس گئی۔ وہ میری اتنی جلد روانگی کا پروگرام سن کر حیران رہ گیا۔ "مارگ! میرا خیال تھا تمہاری روانگی ہفتہ دس دن میں ہو گی۔ اتنی جلدی تمہارے سفر کے سارے انتظامات مکمل ہو گئے؟ افغانستان کے ویزے اور ہالینڈ کی وزارت داخلہ سے اجازت، پھر زرمبادلہ کی منظوری... آخر اتنے اہم کام اتنی جلدی کیسے ہو گئے؟ یا پھر...؟"

"یا پھر کیا جم؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے جم کے لہجے کے اشتباہ کو محسوس کر کے سوال کیا۔

"یا پھر یہ کہ تم کافی دنوں سے سفر کی تیاریوں میں خاموشی سے مصروف تھیں۔"

"خدا کے لیے جم! ایسی کسی غلط فہمی کو دل میں جگہ نہ دو۔ دراصل ایئر لائن والے میرے سفر کے تمام انتظامات خود کر رہے ہیں۔ میں ابھی ابھی اپنا پاسپورٹ دے کر آئی ہوں۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ دوپہر تک ویزا مل جائے گا اور شام تک یہاں سے روانگی کی اجازت اور کل جہاز کی روانگی سے پہلے پہلے زرمبادلہ کی منظوری بھی حاصل ہو جانے کی۔ ڈارلنگ! کیا تم مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ اتنی اہم بات میں تم سے چھپا رہی ہوں۔ مجھے تو جوں ہی مسٹر مائیکل نے یہ آفر دی تھی میں گھر جانے سے پہلے تمہارے پاس آ گئی تھی۔ دنیا میں تم وہ سب سے پہلے شخص ہو جسے میں نے اپنے سفر کے بارے میں بتایا تھا۔ ممی اور ڈیڈی کو بھی بعد میں بتایا۔" میں نے قدرے روہانسی ہو کر جذباتی انداز میں جم سے کہا۔

"ارے ارے میری گڑیا ناراض ہو گئی۔" جم نے مجھے مناتے ہوئے کہا اور پھر وہ بھی میرے سفر کی خوشی میں برابر کا شریک ہو گیا۔

اگلے دن اسی ترتیب سے پروگرام مکمل ہو گیا۔ مجھے ایئرپورٹ پر رخصت کرنے صرف مائیکل آیا تھا۔ جس نے ایئرپورٹ پر ہی بینک سے مقامی کرنسی کو امریکی ڈالروں میں تبدیل کرایا۔ اس نے مجھے پندرہ سو امریکی ڈالر دیئے تھے اور کابل میں اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں کمرہ بھی ریزرو کرا کے مجھے کارڈ دے دیا تھا۔ اس کے علاوہ سب سے اہم بات یہ بتائی گئی تھی کہ مجھے کابل پہنچنے کے چند گھنٹوں کے اندر اندر مجھے پچیس ہزار امریکی ڈالر نقد مل جائیں گے۔ یہ رقم میں خیال خان اینڈ کمپنی کو پانچ پونڈ ہیروئن کی قیمت کے بطور ادا کروں گی اور ان سے پانچ کلو لے کر کے ایل ایم کی اگلی فلائٹ سے جو تیسرے دن مجھے ملے گی، واپس پہنچ جاؤں۔ مائیکل نے مجھے بطور خاص یہ ہدایت بھی دی کہ میں مال کی ڈیلیوری ممکن اس دن لوں جس دن واپس روانگی کے لیے میری سیٹ کنفرم ہو جائے۔ پہلے سے مال لے کر اپنے کمرے میں نہ رکھوں۔

"آخر کیوں؟" میں نے کچھ الجھتے ہوئے مائیکل سے پوچھا۔

"اوہ بے بی! تم نہیں جانتیں۔ وہ مشرق ہے۔ وہاں اچھے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ تمہارے پاس بہت قیمتی مال ہو گا۔ اس کی حفاظت کا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لیے بہتر طریقہ یہی ہو گا کہ تم عین روانگی کے وقت مال کی ڈیلیوری لو۔"

بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میرے ذہن میں مشرقی ممالک کی بہت خراب تصویر نقش کر دی گئی تھی۔ جہاز کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے میرے ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ مال سے زیادہ خطرناک تو پچیس ہزار ڈالر کا کیش ہو گا جو مجھے کابل جاتے ہی مل جائے گا اور جسے تین دن تک مجھے حفاظت سے رکھنا ہو گا۔ جہاز میں اپنی نشست پر بیٹھ کر بھی میں یہی سوچتی رہی کہ اتنی بڑی رقم کی حفاظت میں کس طرح کروں گی۔ تمام

جہاں تک، ہوائی کے بعد مشرق دیکھنے کا جوش و خروش میرے
تصورات پر غالب آ گیا۔

*

کابل ایئرپورٹ پر کے ایل ایم کے دفتر سے مجھے انٹر کان
میں ایک کمرے کا ریزرویشن کارڈ دے دیا گیا اور ایئرلائن کی
ویگن کے ذریعے ہی مجھے ہوٹل پہنچا دیا گیا۔ میں جب اپنے
کمرے میں پہنچی تو رات کے نو بجے تھے۔ موسم خاصا گرم تھا چنانچہ
میں نے شاور سے پہلے غسل کیا اور پھر اطمینان کے ساتھ چار
کورس کا ڈنر کیا۔ زندگی میں اتنا طویل سفر اور وہ بھی تنہا پہلی
مرتبہ کیا تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے میں نے باہر کا نظارہ کیا تو مجھے
لمبے لمبے لباسوں اور بھاری بھاری پگڑیوں میں ملبوس افغان
نظر آئے جو ہم یورپی باشندوں کے معیار کے لحاظ سے خاصے
مضحکہ خیز تھے۔ مجھے افغان عورتیں بھی نظر آئیں جو سیاہ برقعوں
میں تھیں۔ کچھ نے اپنے سرخ و سپید چہرے نقابوں سے چھپا
رکھے تھے اور بعض کے منہ کھلے ہوئے تھے جو سیاہ برقعوں
کے پس منظر میں بہت خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ سڑکوں
پر مختلف جانوروں کے ذریعے چلنے والی گاڑیاں اور موٹریں
بھی تھیں۔ ہر طرف تیز روشنی میں جگمگاتی دکانیں تھیں جو ہر
قسم کے سامان سے بھری ہوئی تھیں۔ میں گیارہ بجے تک
کھڑکی میں بیٹھی باہر کا نظارہ کرتی رہی پھر یہ سوچ کر بستر پر
دراز ہو گئی کہ رقم پہنچانے والا جو بھی ہوگا اب صبح ہی آئے گا۔
میں عجیب و غریب خیالات میں ڈوبی لیٹ گئی۔ غسل کر
لینے سے طبیعت میں کافی شگفتگی پیدا ہو گئی تھی۔ اگر کوئی
بات کرنے والا ہوتا تو یقیناً اس وقت میں بہت محظوظ ہوتی۔
ہر چند کہ مجھے کوئی پریشانی لاحق نہیں تھی پھر بھی مجھے نیند نہیں
آ رہی تھی اور میں آنکھیں بند کیے کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس
عالم میں دو بج گئے۔ میں نے بتی روشن کی اور سوٹ کیس سے
پڑھنے کے لیے ایک ناول نکالا جو میں نے چلتے وقت ساتھ
رکھ لیا تھا۔ ابھی میں نے ناول کے ابتدائی چند صفحات ہی
پڑھے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

"مادام! مسٹر نوری آپ سے ملاقات کے خواہشمند ہیں۔
کیا انہیں آپ کے پاس بھیج دیا جائے؟"

میں سمجھ گئی کہ یہ شخص رقم لے کر آیا ہوگا۔ پھر بھی میں
نے پوچھنا مناسب سمجھا۔ "یہ صاحب کیا کہتے ہیں؟ کیا یہ میرا
نام لے رہے ہیں؟"

"جی ہاں! یہ مس جین ملر سے ملنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں
انتہائی ضروری کام ہے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ آپ کے استقبال
کے لیے ایئرپورٹ نہیں جا سکے...."

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے مگر کیا یہ صبح نہیں آ سکتے؟"

بولنے والے نے چند ثانیوں کے بعد جواب دیا۔ "وہ
کہتے ہیں کہ زیادہ مناسب یہی ہے کہ وہ آپ سے اسی وقت
ملاقات کر لیں۔ یہ بہت اہم ہے۔"

میں نے قدرے تامل کے بعد اجازت دے دی۔

ہوٹل کے ایک اٹینڈنٹ کی معیت میں ایک جاپانی
جو میری طرح اٹک اٹک کر انگریزی بولتا تھا میرے کمرے میں
داخل ہوا۔ اسے پہنچا کر ہوٹل کا آدمی سلام کر کے واپس چلا
گیا تو میں نے مسٹر نوری کو مخاطب کیا۔ "یس مسٹر نوری! لائیے۔"
میں نے ہاتھ بڑھا دیا۔

اس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیبوں سے ڈالروں کی
موٹی موٹی گڈیاں برآمد کیں اور انہیں میز پر رکھ کر کہنے لگا۔
"یہ پورے پچیس ہزار ہیں۔ ایک ایک سو ڈالر کے ڈھائی سو
نوٹ ہیں گن لیجیے۔"

میں نے اس کی موجودگی میں رقم گنی اور اسے رخصت
کر دیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اتنی بڑی رقم
کمرے میں رکھنے کے بجائے اسے ہوٹل کی انتظامیہ کے پاس
بطور امانت رکھ دینا زیادہ مناسب اور بہتر ہے۔ چنانچہ میں
نے فون کر کے نائٹ ڈیوٹی مین کو کمرے میں طلب کیا اور
اسے پچیس ہزار ڈالر دے کر امانت کی رسید حاصل کر لی۔

میں دوبارہ بستر پر گئی تو تین بجنے میں بیس منٹ باقی
تھے۔ کتاب میرے سرہانے پڑی تھی لیکن اب اس طرف
طبیعت راغب نہیں ہو رہی تھی۔ میں بستر پر ٹیک لگا کر
بیٹھ گئی اور اگلے دن کا پروگرام ذہن میں ترتیب دیتی رہی۔
اب مجھے خیال خان اینڈ کمپنی کے دفتر جانا تھا اور معاملات
طے کرنا تھے۔

میں ۱۶ مارچ ۱۹۷۷ء کو کابل پہنچی تھی اور ۲۰ مارچ
کی فلائٹ سے واپسی تھی۔ اس سے پہلے صرف بی او اے
سی کی فلائٹ تھی جو ۱۸ مارچ کو صبح ۸ بجے روانہ ہوتی۔
نامعلوم کیوں میں نے فیصلہ کیا کہ کے ایل ایم والوں سے کہہ
کر میں اپنی بکنگ بی او اے سی کی فلائٹ میں ٹرانسفر کرا لوں
اور ایمسٹرڈم میں مائیکل کو دو دن پہلے پہنچ کر سرپرائز دوں۔
ویسے بھی کابل ایئرپورٹ سے ہوٹل تک اور پھر کمرے کی
کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر کے میں نے محسوس کیا کہ یہ بہت
خشک جگہ ہے۔ یہاں کی سیر کے لیے دو دن بہت ہیں۔ میرے

دل پر عجیب قسم کی گھبراہٹ بھی طاری تھی جس کی میں کوئی وضاحت نہیں کر سکتی تھی۔

اگلے دن میں نے باہر جانے کا پروگرام بنا کر ایک خوبصورت لباس کا انتخاب کیا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ معلوم ہوا کہ خیال خان خود ہوٹل پہنچ چکا ہے اور نیچے ڈائننگ ہال میں میرا منتظر ہے۔ میں نے اسے اوپر آنے کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ وہ مجھ سے نیچے ہی ملنا چاہتا تھا۔

میں دس منٹ کے اندر تیار ہو کر نیچے اتری اور ہال میں پہنچ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ میرے ذہن میں خیال خان کا تصور وہی تھا جیسا کہ میں گزشتہ شب سے اب تک افغانوں کو دیکھ چکی تھی، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ——— نہایت جدید وضع کے تھری پیس سوٹ میں ملبوس ایک خوبصورت پینتیس سالہ شخص مجھے پہچان کر میرے قریب آیا اور اپنا تعارف کرانے کے بعد مجھے اپنی میز پر لے گیا۔ وہ انگریزی میں گفتگو کر رہا تھا۔

"مس ٹکرا! آپ کو یہاں کوئی تکلیف کوئی پریشانی تو نہیں؟"

"شکریہ مسٹر خان! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اب آپ یہ بتلایئے مال کی ڈلیوری کب دے رہے ہیں؟"

میرا سوال سن کر وہ کچھ حیرت زدہ سا ہو گیا۔ پھر تھوڑے تامل کے بعد بولا: "ابھی لے لیجیے۔ میری طرف سے کوئی دیر نہیں ہے۔ رقم تیار ہے؟" اس نے تقریباً سرگوشی میں جواب دیا۔

"جی ہاں پوری رقم تیار ہے۔ میرا خیال ہے آپ پرسوں صبح چھ بجے مجھے پانچ بوتلیں دے دیں۔"

"صبح چھ بجے؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"نو بجے میری فلائٹ ہوگی اس لیے آپ چھ نہ سہی سات بجے تک دے دیں۔ میں آٹھ بجے ہوٹل سے رخصت ہو جاؤں گی۔"

"مگر مس ٹکرا! کے ایل ایم کی فلائٹ تو ۲۰ تاریخ کو شام پانچ بجے ہے۔" اس کی معلومات پر حیران ہونے کی اب میری باری تھی۔ میں نے اسے بتا دیا: "دراصل میں نے جلد سے جلد واپسی کا فیصلہ کیا ہے۔ اب میں اپنی نشست بی او اے سی میں ٹرانسفر کرا رہی ہوں۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ پھر ٹھیک ہے مس ٹکرا! آپ مجھے کل کسی وقت ادائیگی کر دیں۔ دراصل ہم مال کی ڈلیوری سے ایک دن پہلے رقم وصول کر لیتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ آپ چاہیں تو آج بھی آپ کو ادائیگی کی جا سکتی ہے۔"

"آپ کی مرضی، آج دے دیں۔"

میں نے پرس سے امانت کی رسید نکالی اور اس خیال سے ادھر ادھر دیکھنے لگی کہ ہوٹل کے کسی ملازم سے متعلقہ شخص کے بارے میں معلوم کر کے رقم واپس لے لوں۔

خیال خان نے میرے ہاتھ سے رسید لے لی اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا: "رات کو ہی آپ نے یہ رقم ہوٹل کے حوالے کی ہے۔ مگر آپ نے ایسا کیوں کیا مس ٹکرا! کیا آپ اتنی سی رقم اپنے پاس نہیں رکھ سکتی تھیں؟"

"مسٹر خان! میں مسافر ہوں اور بالکل ہی نئی جگہ ہوں اس لیے حفاظت کے خیال سے ایسا کیا۔ دراصل یہ تو آپ کی امانت تھی جس کی اچھی طرح حفاظت کرنا میرا فرض تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مس ٹکرا! مگر یہ بات کچھ احتیاط کے خلاف ہے۔"

"احتیاط کے خلاف ہے؟" میں نے چونک کر اس کا جملہ دہرایا۔ خیال خان نے مجھے چونکتا دیکھ کر بڑی تشویش سے کہا: "معلوم ہوتا ہے آپ کو نامکمل معلومات کے ساتھ یہاں بھیجا گیا ہے۔"

"وضاحت سے بات کرو مسٹر خان! میں سمجھی نہیں۔ تمہاری گفتگو سے میں کچھ پریشان ہو رہی ہوں۔"

"مس ٹکرا! میں آپ سے زیادہ فکرمند ہو رہا ہوں۔ مسٹر مائیکل کا فرض تھا کہ وہ آپ کو ساری اونچ نیچ سمجھا کر یہاں بھیجتے۔"

"چلیے اب آپ سمجھا دیجیے۔"

خیال خان خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا اور میں بے چینی کے ساتھ اس کی شکل دیکھتی رہی۔ جب کافی دیر تک وہ کچھ نہیں بولا تو میں نے تقاضہ کیا: "مسٹر خان! آپ کی خاموشی سے مجھے اور زیادہ پریشانی ہو رہی ہے۔"

خیال خان پھر بھی خاموش رہا۔ پھر جیسے کوئی فیصلہ کر کے ایک گہری سانس لے کر کہنے لگا: "بات یہ ہے مس ٹکرا! اس کام میں مسابقت بہت ہے۔ دنیا بھر کے ممالک ہماری اس ایجاد کے حصول کے لیے کوشاں رہتے ہیں، لیکن ہم صرف اس پارٹی کو اپنا مال دیتے ہیں جس کے ساتھ ہمارا اطمینان بخش معاہدہ ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کے برآمدی قوانین اتنے پیچیدہ ہیں کہ باقاعدہ ایکسپورٹ لائسنس حاصل کرنے کے لیے ہمیں چھ مہینے کا عرصہ درکار ہوگا۔ پھر ہر کنسائنمنٹ کے لیے علیحدہ لائسنس کی ضرورت ہوگی۔ ہم اب تک یوں کرتے رہے ہیں کہ اس عرق کو جلال آباد کی پہاڑیوں میں واقع ایک چشمے کا پانی ظاہر کرتے ہیں۔ اس پانی میں

قدرتی کیمیائی اجزاء شامل ہوتے ہیں جو بہت سے جلدی امراض اور معدے کی تکالیف میں کام آتے ہیں۔ اس قدرتی چشمے کے پانی کو بہت سی جگہوں کے لوگ مقدس پانی سمجھ کر بھی منگواتے ہیں۔ دراصل یہ چشمہ ہم مسلمانوں کے ایک بزرگ کے مزار کے قریب واقع ہے۔ ہماری ایجاد (عرق) کا کوئی رنگ بو اور مزہ نہیں ہوتا۔ بالکل قدرتی پانی کی طرح ہوتا ہے اس لیے جب تک متعلقہ حکام کو کوئی مخبری نہ کرے اور اس کو لیبارٹری میں چیک نہ کیا جائے، یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ کیا چیز ہے۔ احتیاط اور خاموشی کی یہ وجہ ہے۔"

میں نے خیال خاں کی طویل تقریر سن کر پریشانی سے پوچھا "اگر ایئرپورٹ پر حکام نے مجھ سے سوال کیا کہ ان بوتلوں میں کیا ہے اور میرے جواب پر وہ مطمئن نہیں ہوئے تو کیا مجھے گرفتار کر کے مقدمہ چلایا جائے گا؟"

خیال خاں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ اسی وقت ممکن ہو گا جب کوئی شخص حکام کو باقاعدہ اس کی اطلاع دے۔ بصورت دیگر ایسا کوئی امکان نہیں ہے۔"

"مسٹر خاں! اب تم مجھے سچ سچ یہ بات بتاؤ کہ تمہارے اس عرق کے حصول کے لیے اور کون کون سے ملکوں کے لوگ یہاں کابل آئے ہوئے ہیں جن کی طرف سے یہ خطرہ ہو سکتا ہے؟"

"مس مفرا! حوصلے سے کام لو۔ کابل میں اکثر پارٹیاں اس مقصد کے لیے آتی رہتی ہیں، لیکن ایک پارٹی دوسری سے واقف نہیں ہوتی۔ میں جب تک خود نہ بتاؤں کسی کو پتہ نہیں چل سکتا۔ میری فیکٹری یہاں سے بہت دور ہے اور بڑے دشوار گزار اور سنگلاخ علاقے میں واقع ہے۔ اس فیکٹری میں کام کرنے والے صرف چھ آدمی ہیں جو سب کے سب میرے اپنے خاندان کے لوگ ہیں۔ ان سے مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ یہاں مجھے تو تیار کر کے کابل لایا جاتا ہے پھر میں اسے فروخت کرتا ہوں جس کا علم سوائے میرے کسی کو نہیں ہوتا لہٰذا تم مطمئن رہو۔ احتیاط سے میری مراد یہ تھی کہ اتنی بڑی رقم تم نے ہوٹل کی انتظامیہ کے پاس بطور امانت رکھوائی۔ تو لوٹا بھی جا سکتا ہے کیونکہ تم نے یہ رقم کہاں خرچ کی؟ ہوٹل والے بھی سوچ سکتے ہیں کہ اتنی بڑی رقم تم بنک کے ذریعے کیوں نہیں لائیں کیش کیوں لائی ہو؟"

خیال خاں کو یہ علم نہیں تھا کہ یہ رقم رات کو ہی مجھے کسی نے پہنچائی تھی میں اسے ایمسٹرڈم سے اپنے ساتھ نہیں لائی ہوں۔ میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اسے یہ بات نہ بتاؤں چنانچہ میں خاموش رہی۔ تھوڑی دیر تک ہم دونوں پچھلے بیٹھے کافی پیتے رہے۔ پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ "مس مفرا آپ ابھی یہ رقم واپس نہ لیں۔ اسے کل شام وصول کریں۔ اسی دوران میں کسی وقت مجھے دے دیں۔ اگلی صبح میں پانچ بوتلیں اچھی طرح پیک کر کے ہوٹل سے باہر ایئرپورٹ کے راستے میں آپ کو دے دوں گا۔ آپ اپنے سوٹ کیس میں اتنی گنجائش رکھیں کہ پانچوں بوتلیں اس میں آجائیں۔"

تھوڑی دیر بیٹھ کر خیال خاں چلا گیا اور میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ آرام کرسی پر بیٹھ کر میں سوچنے لگی کیا میں واقعی کسی غیر قانونی کام میں ملوث ہو چکی ہوں۔ مائیکل نے مجھے یہ ساری باتیں نہیں بتائی تھیں۔ اس کا خیال ہو گا کہ اگر وہ مجھے اس کام کی حقیقی نوعیت سے آگاہ کر دے گا تو شاید میں رضامند نہ ہوں گی۔ میری بے خبری میں وہ یہ کام مجھ سے کرا لینا چاہتا تھا۔ اب میں بالکل پھنس چکی تھی۔ میں چاہتی تو مال کی ڈیلیوری لیے بغیر بھی واپس جا سکتی تھی اور مائیکل سے کہہ سکتی تھی کہ چونکہ اس نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تھی اس لیے میں نے اپنی عزت اور آزادی کے بچاؤ کی خاطر مال کی ڈیلیوری ہی نہیں لی۔ میں اس کے پچیس ہزار ڈالر اس کے منہ پر مارتی اور سکون کے ساتھ اپنی ملازمت پر واپس چلی جاتی۔ جم سے شادی کر کے یہ تمام واقعہ ایک بھیانک خواب کی مانند فراموش کر دیتی۔

لیکن میں ایسا نہ کر سکی۔ خیال خاں نے جو پروگرام ترتیب دیا تھا میں اسی کے مطابق میں پانچ بوتلیں اپنے سوٹ کیس میں رکھے کابل ایئرپورٹ پہنچی اور پی آئی اے کے طیارے سے ۱۰ مارچ کو صبح ۹ بجے واپس ایمسٹرڈم کے لیے روانہ ہو گئی۔ یہ شاید میری خوش بختی تھی کہ کابل ایئرپورٹ پر کوئی خاص چیکنگ نہیں ہوئی اور پھر ایمسٹرڈم کے ایئرپورٹ سے بھی میں بحفاظت نکل آئی۔ ایئرپورٹ سے باہر آ کر ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے میں نے مائیکل کو فون کیا میری آواز سن کر وہ پریشان ہو گیا۔

"یہ تم ہو جین! کہاں سے بول رہی ہو؟ کیا واقعی ایمسٹرڈم واپس پہنچ چکی ہو؟ کیا تم ناکام واپس آئی ہو؟" اس نے ایک ہی سانس میں پے در پے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"تھوڑا صبر سے کام لو مائیکل! میں سب کچھ بتا دوں گی۔ میں تمہارے پاس کچھ ہی منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔"

"سنو بے بی! تم سیدھی دفتر نہ آؤ، اپنے گھر جاؤ، میں وہیں پہنچ رہا ہوں۔" اتنا کہہ کر مائیکل نے فون بند کر دیا اور

میں فریڈا انٹرنیشنل کے دفتر کے بجائے اپنے گھر آ گئی۔
فریڈی اور ممی میری خلاف توقع واپسی پر حیران رہ گئے۔ جم کو میں نے دانستہ اطلاع نہیں دی۔ سوچا تھا کہ مائیکل سے فارغ ہو کر اسے بتاؤں گی کہ میرے اوپر کیا گزری۔
مائیکل میرے گھر پہنچا تو میں نے پانچوں بوتلیں میز پر سجائی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر وہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔
"جینی! تم نہیں جانتیں تم نے کتنا بڑا معرکہ سر کیا ہے بے بی! تم نے میری زندگی بنا دی ہے۔ تم کمال کی لڑکی ہو۔ میں تمہیں تمہاری توقعات سے بڑھ کر اس کام کا معاوضہ دوں گا۔ کرشن سنگھ ابھی یہیں ہے۔ وہ بھی بہت خوش ہو گا اور ہاں تم شیڈول سے دو دن پہلے ہی آ گئیں۔"
میں نے بڑی سنجیدگی سے مائیکل کو وہ سب کچھ بتا دیا جو خیال خان کے ذریعے مجھے معلوم ہوا تھا۔ میری بات وہ بڑے غور اور کسی قدر اطمینان سے سنتا رہا پھر کہنے لگا "مجھے افسوس ہے جینی اگر میں نے تم سے یہ باتیں چھپائی تھیں۔ دراصل مجھے یقین تھا کہ تم اپنی ذہانت اور صلاحیت کے بل بوتے پر یہ معرکہ ضرور سر کر لو گی لیکن میں پہلے سے تمہیں یہ تمام باتیں بتا دیتا تو تمہارا اعتماد بالکل ختم ہو جاتا۔ پھر شاید تم یہ کام نہ کر سکتیں۔"
"لیکن مسٹر مائیکل! تم نے یہ کتنا بڑا غضب کیا کہ اس کام میں پیش آنے والے متوقع خطرات سے مجھے آگاہ نہیں کیا اور نہ ہی اس کاروبار کی قانونی حیثیت پر کوئی روشنی ڈالی۔ تم خود دیکھو انجانے میں میں نے کیسی کیسی بے احتیاطیاں کیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں ایسا نہیں کرتی۔"
"اوہ، تم نہیں سمجھیں۔ دراصل تمہاری بے احتیاطیاں اور فطری انداز میں کام کرنا ہی ہمارے لیے فائدہ مند ثابت ہوا۔ اور کسی کو کوئی شک نہیں ہوا۔"
"یہ لی کون تھا مائیکل؟" میں نے سوال کیا۔
"یہ شخص کرشن سنگھ کا جاپانی دوست ہے جو محض تمہیں رقم پہنچانے کے لیے ہانگ کانگ سے کابل پہنچا تھا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر ہانگ کانگ ہے اور وہ اسمگلنگ کے ایک بہت بڑے گروہ کا چیف ہے۔"
"اچھا اب تم مجھے صاف صاف بتاؤ آخر یہ عرق ہے کیا بلا؟"
"کیا تم اب تک نہیں سمجھیں؟"
"ہاں مائیکل! مجھے اعتراف ہے۔ مجھے خیال خان کی یہ بات بھی جھوٹ معلوم ہوتی ہے کہ یہ ایک مقامی بوٹی کا عرق ہے جو دوائیں بنانے کے کام آتا ہے۔ میرے سامنے تم لوگوں کی اس بات پر اب بالکل یقین نہیں رہا۔"
"نہیں بے بی! کسی حد تک یہ بات بالکل درست ہے کہ یہ عرق افغانستان میں پیدا ہونے والی ایک بوٹی کا عرق ہے اور یہ بوٹی ہے حشیش۔"
"حشیش!" میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ "تو کیا میں یہ چرس کا عرق لے کر آئی ہوں؟"
"بالکل درست مس جینی ڈئیر۔"
میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ "میرے خدا!" انجانے میں میں کیا کر بیٹھی۔ اتنی خوفناک اسمگلنگ جس کی سزا بعض ملکوں میں موت ہے۔ میں سن ہو کر مائیکل کی شکل دیکھنے لگی جو فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔
میرا دل چاہا کہ سامنے میز پر رکھی ہوئی پانچوں بوتلیں ایک ایک کر کے دیوار پر مار کر توڑ دوں اور مائیکل اور کرشن سنگھ کو ان کی چالاکی کا صحیح جواب دوں لیکن میں نے اپنے جذبات پر قابو پایا اور شکست خوردہ لہجے میں مائیکل سے کہا "مسٹر ورڈ! بہتر ہے آپ اس مصیبت کو جلد سے جلد یہاں سے لے جائیں اور اب مجھے تنہا چھوڑ دیں تاکہ اپنی حماقت پر ماتم کر سکوں۔"
"ارے کمال ہے جینی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو بے بی! تم نے اتنا بڑا کام کیا ہے اس پر ماتم کیسا۔ تم اپنے منہ سے جو معاوضہ طلب کرو گی، وہی دیا جائے گا۔ میں نے ابتدا میں اس کی اصل قیمت تمہیں جان بوجھ کر نہیں بتائی تھی لیکن اب سب کچھ کھل کر سامنے آ چکا ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ پانچ بوتلیں کتنی بڑی دولت ہیں۔ تم یوں سمجھو کہ ان پانچ بوتلوں میں تم دس کلو چرس لے کر آئی ہو اور دس کلو چرس کی قیمت یورپ میں ایک ملین ڈالر اور امریکہ میں پندرہ لاکھ ڈالر کے لگ بھگ ہے۔ اس عرق کے دس قطرے ایک پونڈ تمباکو میں چرس کا تیز نشہ پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ امریکہ میں چرس کا ایک سگریٹ ایک ڈالر میں فروخت ہوتا ہے۔ اب تم اندازہ کر سکتی ہو کہ ان پانچ بوتلوں میں کتنی عظیم دولت بند ہے۔"
میں لاتعلق سی ہو کر مائیکل ورڈ کی گفتگو سنتی رہی۔ جب اس نے مجھے مطلع کیا کہ وہ مجھے دس ہزار ڈالر شام تک ادا کر دے گا۔ تب بھی میرے احساسات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور وہ ان بوتلوں کو میرے ہی سوٹ کیس میں بند کر کے روانہ ہو گیا۔

دوسرے کمرے میں میرے ڈیڈی اور ممی خاموش بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہماری گفتگو سن لی تھی۔ میرا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر ڈیڈی کہنے لگے: "بیٹی! ہمیں تم پر فخر ہے۔ ٹھیک ہے تم غلطی سے ان لوگوں کی آلۂ کار بن گئیں تاہم مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ تم اس غلط کام پر افسردہ ہو اور برائی پر فخر کرنے کے بجائے تم اسے برا ہی سمجھتی ہو۔ میں اور تمہاری ممی تم سے قطعی ناراض نہیں ہیں بلکہ خوش ہیں کہ جونہی تمہیں اپنی غلطی کا علم ہوا تم نے اسے درست ثابت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔"

"خدا کے لیے ڈیڈی! جم کو کچھ نہ بتائیے گا۔ اس نے مجھ سے پہلے ہی اس شبہے کا اظہار کیا تھا کہ مجھے کسی غیر قانونی کام کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے لیکن میری دل جوئی کی خاطر اس نے اپنے شبہے پر اصرار نہیں کیا اور محض میری خوشی کی خاطر وہ خاموش رہا۔"

ڈیڈی نے میری بات سے اتفاق کیا: "واقعی جم سے کچھ نہیں کہنا چاہیے بلکہ اسے یہی بتاؤ کہ تم اپنا مقصد حاصل کیے بغیر وقت سے پہلے واپس آ گئی ہو۔ اس طرح اسے اطمینان ہو جائے گا۔"

میں نے افسردگی سے اثبات میں سر ہلا دیا اور کمرے میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کی طرف بڑھ گئی تاکہ جم کو اپنی واپسی سے مطلع کر دوں۔

*

شام سے پہلے پہلے مائیکل پھر میرے پاس آیا۔ میں اس وقت جم کے پاس جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ "مس مرے! ہمارے معاہدے کے مطابق تمہارا بونس تمہیں دینے آیا ہوں۔" اس نے دس ہزار امریکی ڈالر کے بقدر ڈچ گلڈرز کا چیک مجھے دے دیا۔ میں نے یہ سوچ کر یہ چیک لے لیا کہ واپسی سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا تھا۔ بطور احتجاج واپس کر بھی دیتی تو مائیکل یا کرشن سنگھ اپنا کالا کاروبار بند تو نہیں کر دیتے الٹا میرا ہی نقصان ہوتا۔ پھر بھی میں نے بددلی کے ساتھ چیک لے کر ایک طرف ڈال دیا اور رسمی شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔ اس طرح میں اپنی ناراضگی کا اظہار کرنا چاہتی تھی — مائیکل بڑی کمینگی سے ہنس کر کھڑا ہو گیا۔ "اچھا بے بی! گڈ لک۔" اور پھر وہ چلا گیا۔

*

میں نے اسکول سے پندرہ دن کی چھٹی لی تھی جو میں نے منسوخ نہیں کرائی۔ میں بقیہ دنوں میں آرام کر کے اپنی نفسیاتی کیفیت نارمل کرنا چاہتی تھی۔ مجھے جب یہ خیال آتا کہ میں کتنے بڑے خطرے سے نکل کر آئی ہوں تو میرا دل تک کانپ جاتا۔ میں سوچتی اگر افغانستان میں پکڑی جاتی تو وہاں اجنبی لوگوں کے درمیان بالکل تنہا ہوتی۔ کوئی مجھے امداد دینے والا نہ ہوتا۔ ڈچ سفارت خانہ ایسے ملزموں کی کوئی مدد نہیں کرتا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ میں مکمل طور پر ان وحشیوں کے رحم و کرم پر ہوتی اور اللہ بہتر جانتا ہے میرا کیا حشر ہوتا۔

میری چھٹیاں ختم ہونے میں چند دن باقی تھے کہ ایک دن شام کو مائیکل کا فون پھر آیا: "ہیلو بے بی! امید ہے اب تم نارمل ہو گئی ہو گی؟" اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

"مجھے کیا فرق پڑتا ہے مسٹر مائیکل۔ مجھے افسوس ہے اب میں آپ کے کسی کام نہ آ سکوں گی۔"

"دس بیس ہزار ڈالر مزید کمانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" یہ سنتے ہی میں نے کوئی جواب دیے بغیر فون بند کر دیا۔

بس اس مقام سے میری زندگی ایک خطرناک موڑ پر مڑ گئی۔ لیکن میں مجبور تھی یا مجبور بنا دی گئی تھی۔

تفتیشی افسر کا نوٹ۔ گرفتاری کے بعد ملزمان کی نفسیات ایک ہی طرح پر کام کرتی ہے۔ ہر مجرم واقعات مقدمہ میں کچھ ایسی کہانیاں بھی شامل کر دیتا ہے جن کے ذریعے وہ قانون کو نافذ کرنے والوں، جیوری، اخبار نویس اور عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تیس فیصد معاملات میں ملزمان ایسی کہانیاں اپنے طور سے گھڑ کر سناتے ہیں جبکہ بقیہ ستر فیصد سچے واقعات میں تھوڑی تھوڑی جھوٹ کی آمیزش کر کے اپنے لیے ہمدردیاں جیتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زیرِ تفتیش ملزمہ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ متعلقہ اخبارات مجھے فراہم کر کے اپنی مظلومیت کا ثبوت دے گی لیکن وہ مجھے اخبارات فراہم نہ کر سکی۔ اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا دعویٰ سچا ہے یا نہیں۔ — بیکر

---

۲۷ مارچ ۱۹۷۷ء کے ان تمام اخبارات میں جو ڈچ زبان میں ایمسٹرڈم سے شائع ہوتے ہیں ایک خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی جس کا متن یہ تھا۔

"مقامی پولیس نے ایک بھارتی نوجوان مہندر کو عین اس وقت گرفتار کیا جب وہ ایک تاجر کے ہاتھ دو اونس سیال چرس فروخت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنی گرفتاری کے بعد مہندر نے پولیس کو بتایا ہے کہ ایک مقامی اسکول کی لیڈی ٹیچر نے جس کا نام وہ نہیں جانتا، یہ سیال چرس بطور نمونہ دیا تھا تاکہ وہ انڈر گراؤنڈ مارکیٹ میں اس کا نرخ معلوم کرے اور بڑی مقدار میں اس کی سپلائی کا آرڈر بک کرے۔ ملزم پولیس کی طویل پوچھ گچھ کے باوجود مذکورہ لیڈی ٹیچر کی شناخت اور اس کے بارے میں مزید معلومات فراہم کرنے سے قاصر رہا۔ ملزم مہندر ضمانت پر رہائی کے بعد روپوش ہو گیا ہے جس کی وجہ سے پولیس اس مقدمے کی مزید تفتیش میں ناکام ہو گئی ہے۔ مہندر کی تلاش جاری ہے۔"

جس دن اخبارات میں یہ خبریں شائع ہوئیں اسی دن دوپہر کو مائیکل نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔

"مس کلیرا! تم نے آج کے اخبارات دیکھے ہیں؟"

"ہاں مسٹر مائیکل! یہ کیا قصہ ہے؟"

"قصہ تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ یہ مہندر کون تھا جسے تم نے نمونہ دیا تھا؟"

"میں نے نمونہ دیا تھا؟ تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟"

"بے بی! ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔ کرشن سنگھ کو … ہے کہ تم کابل سے زیادہ مال لے کر آئی ہو اور اب … چاہتی ہو۔ کیوں ہے نا یہی بات؟"

میں … کر رہ گئی۔ میں روہانسی ہو کر قسمیں کھانے لگی کہ کسی طرح مائیکل اور کرشن سنگھ کو میری بے گناہی کا یقین دلا دے۔ لیکن مائیکل ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مجھے بلیک میل کرنے پر تل گیا۔

"اب … صورت یہی ہے مس کلیرا! کہ تم وہی کچھ کرو جیسا کرشن سنگھ کہتے ہیں۔"

"وہ تو یہی کہے گا کہ میں پھر کابل جاؤں اور اس کے لیے کام کروں۔ ہے نا یہی بات؟"

"تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ تھوڑی سی تکلیف اٹھا کر تم ہزاروں ڈالر کما سکتی ہو اور ہمارا بزنس بھی چل سکتا ہے۔"

"مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔"

"یہ معقول بات ہے۔ یوں بھی ہم تمہیں فوراً ہی فیصلہ نہیں سمجھیں گے۔ البتہ سوچنے اور فیصلہ کرنے کی مدت چار سے آٹھ بجے تک ہونا چاہیے۔ اس سے زیادہ نہیں۔"

اسی شام جم گھبرایا ہوا میرے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں اخبارات کا پلندہ تھا۔

"کلیرا! تم نے آج کے اخبارات دیکھے ہیں؟"

"ہاں، مگر میرا اس خبر سے کوئی تعلق نہیں۔"

"واقعی؟ سچ کہہ رہی ہو؟" جم نے مشتبہ لہجے میں پوچھا۔

"جم! کیا میں تم سے جھوٹ بول سکتی ہوں؟" میں نے جذباتی ہو کر کہا۔

"یقین تو نہیں، لیکن سوچ رہا تھا کہیں لالچ میں نہ آگئی ہو۔"

"نان سنس! کیسی ہلکی بات سوچی ہے تم نے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" جم ابھی تک مشتبہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد جم چلا گیا اور میں اپنے کمرے میں دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ تنہائی ہوتے ہی طرح طرح کے خیالات نے ذہن پر یلغار کر دی۔ میں سوچ رہی تھی کہ کس انجانے میں کیسے بے رحم لوگوں کے شکنجے میں پھنس گئی ہوں۔ کتنی خوبصورتی سے مجھے بلیک میل کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ان لوگوں نے اپنا ایک آدمی بھی پولیس کے ہاتھوں گرفتار کرا دیا اور پھر اسے غائب بھی کروا دیا۔ میں یہ سوچ سوچ کر لرز رہی تھی کہ پولیس اگر چاہے تو تھوڑی سی کوشش سے یہ پتہ چلا سکتی ہے کہ ایمسٹرڈم کی کون سی لیڈی ٹیچر گزشتہ دنوں مشرقی ممالک کے سفر سے واپس آئی ہے۔ ایئرپورٹ کے ریکارڈ سے پتہ چل سکتا ہے کہ مس جینفر سولہ مارچ کو کے ایل ایم کے طیارے سے کابل گئی اور اٹھارہ کو پی آئی اے کی پرواز سے واپس آگئی۔ صرف دو دن کے لیے کابل کا سفر جس پر تین ہزار دو سو ڈالر خرچ کیے گئے، آخر کیوں کیا گیا تھا؟

واقعات ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ میں پھندے میں بندھی ایک بار پھر مائیکل اوبرائن کے دفتر میں بیٹھی تھی۔ اس مرتبہ میرے چہرے پر شادابی کے بجائے افسردگی تھی۔ میں ایسا کام کرنے پر مجبور کر دی گئی تھی جسے کرنے میں میری روح پر بھی لرزہ طاری تھا۔ تاہم میں مجبور تھی۔

اس مرتبہ مجھے پاکستان جانے کا حکم ملا تھا۔ یہ ملک افغانستان کا ہمسایہ ہے اور سیکڑوں میل سرحد مشترک ہے۔ پاکستان کا تمام شمالی علاقہ پہاڑی ہے اور وہاں کی معاشرت، تہذیب اور ثقافت کچھ علاقوں کی زبان بھی افغانستان

سے ماثل ہے۔ مجھے تو ان دونوں ملکوں میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوا۔ البتہ پاکستان کا جنوبی علاقہ شمالی علاقے سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں کے لوگ نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں۔ غربت البتہ دونوں ہی ملکوں میں عام ہے۔

میں بیس ستمبر ۱۹۷۷ء کو ایمسٹرڈم سے کے ایل ایم کے ذریعے کراچی پہنچی۔ یہاں ہوٹل مہران میں ٹھہری۔ کراچی میں کابل جیسی خشکی اور ویرانی نہیں تھی۔ مجھے یہ شہر بہت سے یورپی شہروں سے بھی خوبصورت اور بارونق معلوم ہوا۔ اپنے کابل کے تجربے کے برعکس پاکستان، خصوصاً کراچی آکر مجھے واقعی بڑی خوشی ہوئی۔ کچھ عرصے کے لیے میری وہ افسردگی بھی جاتی رہی جو مجبوری کے حالات میں یہ سفر اختیار کرنے کی وجہ سے میری روح تک پر چھائی ہوئی تھی۔

اکیس ستمبر ۱۹۷۷ء کو صبح ۸ بجے کے قریب ابھی میں بستر میں ہی تھی کہ ہوٹل کے استقبالیہ کاؤنٹر سے مطلع کیا گیا کہ ایک صاحب مسٹر لوئی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ پھر وہی کابل کا سبق دہرایا جا رہا تھا۔ میں نے لوئی کو اپنے کمرے میں بلوالیا۔

"وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا: "تم سے دوبارہ مل کر بڑی خوشی ہوئی مس ملز!"

"شکریہ مسٹر لوئی!" میں نے پھیکی مسکراہٹ سے جواب دیا اور اپنے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھ کر خاموش ہو گئی۔

وہ چند لمحوں تک مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بڑی رواں اور شستہ ڈچ زبان میں مجھے میرے مشن کے بارے میں ہدایات دینے لگا۔

"دو دن بعد ۲۳ ستمبر کو تمہیں راولپنڈی جانا ہے۔ وہاں تم فلیشمین ہوٹل میں قیام کرو گی اور اس وقت تک وہیں رہو گی جب تک کہ میرا آدمی معہ ٹرانسپورٹ کے تم سے رابطہ قائم نہ کرے۔ اس ٹرانسپورٹ میں تم پہلے پشاور پھر وہاں سے چالیس میل دور ایک سرحدی مقام تک جاؤ گی۔ تم میرے آدمی کے پاس ہو گی اور تمہارے ذاتی تحفظ کا ذمے دار بھی ہو گا۔ اس سرحدی مقام پر پہنچ کر تمہیں اپنے ایک پرانے دوست سے ملنا ہو گا۔ پھر خود بخود تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ تمہارا یہ سفر پانچ دن میں پورا ہو گا۔ واپسی میں تم پھر پنڈی کے اسی ہوٹل میں ٹھہرو گی اور وہاں لوگوں کو بتاؤ گی کہ تم نے شمال کی سیاحت کی اور تم بہت محظوظ ہوئیں۔ تم ہر جگہ غیر متعلق افراد سے اپنا تعارف سیاح طالبہ کی حیثیت سے کراؤ گی اور اپنے موجودہ مشن کو تعلیمی اور سیاحی سفر کا نام دو گی۔ سمجھ گئیں مس ملز؟"

"کیا خیال خان مجھے اس سرحدی علاقے میں ملے گا؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ خیال خان ہی ملے گا اور اس مرتبہ وہ تمہیں دس بوتلیں دے گا۔ ان بوتلوں پر عربی زبان میں لیبل لگے ہوں گے۔ تمہارا فرض ہے کہ ان لیبلوں کی بے حرمتی نہ کرو۔ اس علاقے کے مسلمان بڑے کٹر مذہبی ہوتے ہیں اور اپنے مذہب کی ذرا سی بے حرمتی پر قتل تک کر دیتے ہیں۔ یہ باتیں جاننا تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔"

"اس جگہ کا نام کیا ہے جہاں خیال خان مجھے ملے گا؟"

"یہ جاننا تمہارے لیے بالکل ضروری نہیں۔ تمہارے ساتھ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ایک رہبر ہو گا۔ وہ تمہیں کسی دقت کے بغیر منزل تک لے جائے گا اور واپس بھی لے آئے گا۔"

میں گردن ہلا کر خاموش ہو گئی۔

لوئی نے مجھ سے کوئی غیر متعلق بات نہیں کی۔ اس نے مجھ سے کسی ضرورت کے بارے میں پوچھا اور یہ اطمینان کر کے کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، وہ کھڑا ہو گیا۔

"اچھا مس ملز! میں جا رہا ہوں۔ پنڈی جانے کے لیے ٹکٹ تمہیں بروقت مل جائے گا۔"

اگلے ہی دن مجھے ہوٹل کے کاؤنٹر سے کراچی سے پنڈی تک کے لیے پی آئی اے کا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ مل گیا۔ ٹکٹ کے ساتھ کوئی پیغام نہیں تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ اب میرے ساتھ جو کوئی بھی رابطہ قائم کرے گا، پنڈی میں ہی کرے گا۔ فلیشمین ہوٹل میں کمرے کی ریزرویشن سلپ بھی ٹکٹ کے ساتھ منسلک تھی۔

کراچی میں قیام کے دوران میں خوب گھومی پھری۔ میں نے تمام تفکرات ذہن سے جھٹک دیے تھے اور سوچ لیا تھا کہ جب ایک افتاد آ ہی پڑی ہے تو پھر دلیری سے اس کا مقابلہ کروں گی۔ اداسی اور مایوسی کی کیفیت میرے اعتماد کو مجروح کرنے کی اور میری قوتِ کار بھی ختم ہو کر رہ جائے گی۔ معاملات جس پُراسرار انداز میں چل رہے تھے انہوں نے مجھے ضرورت سے زیادہ چوکنا بنا دیا تھا۔ میں اپنے سائے سے بھی محتاط رہتی۔ بلاضرورت کسی اجنبی سے کوئی بات نہ کرتی۔ کراچی کا فیشن ایبل شاپنگ سینٹر الفنسٹن اسٹریٹ میرے ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں شام کے وقت ٹہلتی ہوئی وہاں جاتی اور بلاضرورت شاپنگ کرتی رہتی۔ رقم کی میرے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ امریکی ڈالر ہوٹل والے ہی مقامی کرنسی میں تبدیل کر دیا کرتے تھے۔ کراچی

میں متعدد تفریحی مقامات ویکھے جہاں میں کار سے گئی۔ چونکہ تنہا تھی اس لیے پوری طرح لطف اندوز نہ ہو سکی۔ میرا وقت گھومنے پھرنے اور شاپنگ کرنے میں گزرتا تھا۔ میں دن رات ہوٹل کے کمرے میں بھی تو مقید۔۔۔ نہیں رہ سکتی تھی۔

جس دن مجھے راولپنڈی روانہ ہونا تھا اس سے ایک دن پہلے میں نے ایک ٹیکسی لی اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے شہر کی ایسی بستیوں میں لے چلے جہاں غریبوں کی آبادی ہو۔ ٹیکسی ڈرائیور میری شکل دیکھنے لگا جیسے اسے میری دماغی صحت پر شبہ ہو۔ میں نے پھر اپنی بات دہرائی اور ایک ترجمان کی مدد سے اسے سمجھایا کہ میں یورپ کی ایک یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر ہوں اور مطالعے و مشاہدے کی غرض سے پاکستان آئی ہوئی ہوں چونکہ میں بالکل ناواقف ہوں اس لیے ٹیکسی ڈرائیور کی مدد سے شہر کی ایسی بستیوں کو دیکھنا چاہتی ہوں جہاں کم آمدنی والے لوگ رہتے ہیں۔

میری وضاحت سے ڈرائیور کچھ مطمئن سا ہو گیا اور میرے کندھے پر لٹکا ہوا کیمرہ غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ان بستیوں کی تصویریں بھی اتاروں گی۔ میرے اثباتی جواب کے بعد اس نے مجھے مطلع کیا کہ میں ان بستیوں میں رہنے والی عورتوں کی تصویریں ہرگز نہ اتاروں کیونکہ مقامی لوگ اسے بہت معیوب خیال کرتے ہیں اور اپنی پردہ نشین عورتوں کی تصویریں کسی غیر کے ہاتھوں اتروانے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتے۔ اگر میں نے اصرار کیا یا چوری چھپے ایسی کوئی کوشش کی تو وہ تشدد پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ اس تنبیہہ کے بعد ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور مختلف سڑکوں اور گلیوں سے گزرتا ہوا ایک ایسی بستی میں پہنچا جہاں بڑی مرادی چھوٹے چھوٹے بچے ننگ دھڑنگ تنگ تنگ گلیوں میں کھیل رہے تھے اور ان کی مائیں جو پھٹے پرانے غلیظ کپڑوں میں ملبوس تھیں اپنے تنگ و تاریک مکانوں کے دروازوں کے سامنے زمین پر بیٹھی ہوئی تیز تیز آوازوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ ان میں سے اکثر ایک دوسرے کے سر کی جوئیں دیکھ رہی تھیں۔ میں ٹیکسی سے اتر کر ان عورتوں کے قریب گئی۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے اپنی باتیں بند کر دیں اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں۔ ان کے بچوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بعض میری اسکرٹ پکڑ کر کھینچنے کی کوشش کرنے لگے لیکن جلد ہی ان کی ماؤں نے ان بچوں کو ڈانٹ کر مجھ سے دور کر دیا۔

کچھ عورتوں نے میم صاحب میم صاحب کہہ کر اپنی زبان میں مجھے مخاطب کرنے اور غالباً یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ میں وہاں کیوں آئی ہوں۔ ٹیکسی ڈرائیور جو میرے ساتھ تھا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی بول لیتا تھا ان عورتوں کو بتانے لگا کہ میں ۔۔۔ ان بستیوں کی سیر کرنے آئی ہوں اور میرا مقصد صرف ان لوگوں کو دیکھنا اور یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کس طرح اپنے گھروں میں رہتی بستی ہیں۔ ڈرائیور کی وضاحت سے وہ جوش و خروش ختم ہو گیا جو مجھے دیکھ کر ان عورتوں میں اچانک پیدا ہو گیا تھا۔ تاہم میں نے محسوس کیا کہ اب بھی بعض بڑی عمر کی عورتیں مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھیں جبکہ نوجوان عورتیں دلچسپی کے ساتھ میری ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھیں۔ غالباً ان کی خواہش تھی کہ وہ مجھ سے باتیں کریں اور یہ پوچھیں کہ کیا میرے ملک میں بھی غریب لوگ اسی طرح زندگی بسر کرتے ہیں؟

میری معلومات کے مطابق دنیا کے ترقی یافتہ اور امیر ممالک میں بھی چھوٹے شہروں اور قصبات میں کم آمدنی والے افراد اور خاندان تقریباً اسی انداز میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہاں بھی چھوٹے چھوٹے مکانات ہوتے ہیں جہاں عورتیں اپنے ہمسایوں سے حسد کرتی ہیں اور ذرا سی بات پر آپس میں لڑتی ہیں۔ ان کے بچے بھی اسی طرح ننگ دھڑنگ گلیوں کی خاک دھول پھانکتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں غریبوں کی بستیوں میں سڑکیں اور گلیاں پختہ ہوتی ہیں جس کی وجہ سے غلاظت ذرا کم نظر آتی ہے۔ وہاں ہر گھر تک بجلی کی سہولت موجود ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ بستیاں قطعی تاریک نہیں ہوتیں۔ اس کے علاوہ عام غریبوں کی جو نفسیات ہوتی ہے وہ دنیا بھر میں ایک ہی جیسی ہے۔ خود میرے ملک ہالینڈ میں بعض قصبات میں ابھی تک بجلی نہیں پہنچی ہے وہاں محنت مزدوری کرنے والے لوگ تنگ و تاریک مکانوں میں رہتے ہیں۔ ان کی عورتیں بھی ایک دوسرے سے حسد کرتی ہیں اور ذرا سی بات پر آپس میں لڑتی رہتی ہیں۔ لازمی پرائمری تعلیم کے قانون کی وجہ سے ان لوگوں کے بچے اپنے علاقے کے سرکاری اسکول ضرور جاتے ہیں لیکن اسکول سے واپس آ کر آوارہ گردی کرتے ہیں۔ بہت کم بچے ایسے ہوتے ہیں جو سرکاری اسکولوں کی مفت تعلیم مکمل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ لیں۔ دراصل ان کے والدین کے وسائل اتنے نہیں ہوتے کہ اپنے نونہالوں کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات برداشت کر سکیں۔

کراچی کی ان بستیوں میں گھوم پھر کر مجھے ایک دلچسپ تجربہ یہ بھی ہوا کہ یہاں رہنے والے قدامت پرست والدین

کے نوجوان لڑکے قدرے تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہیں۔ میں ایسی ہی ایک بستی میں ایک تنگ گلی سے گزر رہی تھی کہ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان سے ایک نوجوان برآمد ہوا۔ وہ جدید وضع کے لباس میں ملبوس تھا اور اپنے ماحول کے مقابلے میں زیادہ صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔ اس نے بڑی رواں انگریزی میں مجھے مخاطب کیا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ کس ملک سے تعلق رکھتی ہیں؟"

قدرے حیرانی کے ساتھ میں نے اس نوجوان کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں فرنچ ہوں اور تعلیمی دورے پر آپ کے ملک آئی ہوں۔"

"کیا آپ کو کسی بین الاقوامی تعلیمی ادارے نے اس مقصد کے لیے کوئی وظیفہ دیا ہے؟"

"ایسا ہی سمجھ لیں۔"

"وہ کون سا ادارہ ہے؟" نوجوان نے تجسس سے پوچھا۔

"مجھے میری یونیورسٹی کے شعبۂ علوم مشرقی نے پاکستان کے مطالعاتی دورے پر بھیجا ہے۔" میں نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

"کیا آپ کے ہاں ایسا کوئی ادارہ نہیں ہے جو مشرقی ممالک کے طالب علموں کو مغربی ممالک کے تعلیمی اور مطالعاتی دوروں پر بلائے اور ان کا خرچ برداشت کرے؟"

"ایسے ادارے تو کئی ہیں جو اقوامِ متحدہ کے تحت مختلف منصوبوں پر عمل پیرا ہیں۔ یونیسکو کے مقامی دفتر سے اس سلسلے میں آپ کو مفصل معلومات حاصل ہو جائیں گی۔" میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے جواب دیا۔

وہ نوجوان جو اب تک گلی میں کھڑے کھڑے مجھ سے گفتگو کر رہا تھا، بڑے اخلاق سے کہنے لگا "میرا گھر اس قابل تو نہیں ہے کہ آپ جیسی معزز خاتون کو بٹھا سکوں تاہم اب جبکہ آپ ہم غریبوں کی بستی میں آ ہی گئی ہیں تو ہمارے گھروں کے اندر بھی جھانک کر دیکھ لیں۔ اس سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہی ہوگا۔"

"اوہ شکریہ، مسٹر! میں تمہاری دعوت بڑی خوشی سے قبول کرتی ہوں۔ مجھے صرف تمہارے خلوص کی ضرورت ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے۔"

نوجوان جسے شاید میرے اس جواب کی توقع نہیں تھی خوش ہو گیا اور اپنے گھر کے دروازے پر لٹکتا ہوا گندہ پردہ ایک طرف ہٹاتے ہوئے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

گھر کے اندر داخل ہو کر میں نے دیکھا کہ صحن کچا ہے اور سامنے کے رخ دو چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ ان میں سے ایک کمرے میں وہ مجھے لے گیا جہاں ایک چارپائی، ایک چھوٹی سی میز اور ایک کرسی موجود تھی۔ کرسی کو ایک کپڑے سے جھاڑتے ہوئے نوجوان نے ندامت کے ساتھ مجھے بٹھایا جیسے محسوس کر رہا ہو کہ میرے قابل کرسی کہاں سے لائے۔ کرسی پر بیٹھ کر میں نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ بغیر پلاستر کی دیواریں جن پر مقامی اخبارات سے کاٹی ہوئی رنگین تصویریں چپکائی ہوئی تھیں۔ ان میں پاکستان کے سیاسی رہنماؤں کی تصویریں بھی تھیں اور مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کی بھی۔

میں نے اس سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے مسٹر! اور تمہارے ساتھ گھر میں اور کون کون رہتا ہے؟"

"میرا نام محمد شریف ہے مس! میری بیوہ ماں اور ایک مطلقہ بہن اپنے بچوں کے ساتھ اس گھر میں میرے ساتھ رہتی ہیں۔ میں نے تین سال پہلے بی۔اے کیا تھا اور دو سال تک سخت جدوجہد کی تھی جس کے بعد چار سو روپے ماہوار پر ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم ہو سکا ہوں۔ تعلیم کے دوران میں نے بڑی کوشش کی کہ مجھے غیر ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کوئی وظیفہ مل جائے مگر بہترین تعلیمی ریکارڈ کے باوجود میں اپنے مقصد میں اس لیے ناکام رہا کہ میرے پاس کوئی سفارش نہیں تھی اور نہ ہی میرا کوئی قریبی عزیز اتنا با اثر تھا کہ مجھے وظیفہ دلوا کر باہر بھجوا سکتا۔"

"اوہ، تو تم اس لیے مجھ سے ایسی معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مجھے بڑا افسوس ہے مسٹر شریف! کہ فوری طور پر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ البتہ میں واپس اپنے وطن جا کر تمہارے لیے کوشش ضرور کروں گی۔"

"کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟ آپ مجھ پر اتنی مہربانی... کر سکتی ہیں؟"

"کیوں نہیں! میں تمہارے خلوص سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔"

کمرے کے باہر محلے کی بہت سی عورتیں اور بچے جمع ہو گئے تھے جن کی آوازیں میں برابر سن رہی تھی۔ میرا ٹیکسی ڈرائیور باہر گلی میں میرا منتظر تھا۔ شریف میری پیش کش کے بعد میرے آگے بچھا جا رہا تھا۔ اس نے اصرار کر کے مجھے اپنے گھر میں بنی ہوئی چائے پلائی اور جب تک میں چائے پیتی رہی وہ متواتر شرمندگی کا اظہار کرتا رہا کہ اس کے پاس مناسب کراکری بھی نہیں جس میں وہ مجھ جیسی یورپی خاتون کو باعزت طریقے سے چائے پیش کر سکے۔ اس نے مجھے اپنا نام اور پتہ

بھی تکمیل کر دیا تاکہ ہالینڈ پہنچ کر میں اسے مطلع کر سکوں کہ اس کے وظیفے کے سلسلے میں کیا پیش رفت ہوئی ہے۔

چائے پینے کے بعد شریف نے ایک بڑی دلچسپ بات بتائی جسے سن کر مجھے حیرانی کے ساتھ تھوڑی سی پریشانی بھی ہوئی۔ وہ کہنے لگا۔

"مس مُرّا جب مجھے بچوں نے بتایا کہ ایک گوری یہاں گلیوں میں گھوم رہی ہے تو پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا، وہ کسی نشے کی عادی ہپی لڑکی کا تھا۔ دراصل ہمارے علاقے میں آپ کے یورپ سے رہنے والے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں چرس کی تلاش میں اکثر گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے کئی جوڑے تو گزشتہ کئی برسوں سے اسی غلیظ ماحول میں پڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے لیے چرس بے حد اہمیت رکھتی ہے جس کی خاطر انھوں نے اپنا وطن، گھر بار سب کچھ چھوڑ دیا ہے اور یہاں بھی انھوں نے اپنی عزت اور وقار کو داؤ پر لگا رکھا ہے۔ انھیں ہر قیمت پر نشہ چاہیے۔ کبھی کبھی تو ان بے چاروں کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہوتے کہ چرس خریدنے کے بعد پیٹ بھر کر روٹی بھی کھا سکیں۔ ایسے موقع پر ہم غریبوں میں سے کوئی انھیں اپنا مہمان بنا لیتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ آپ جو اس وقت میرے پاس میرے گھر میں بیٹھی ہیں تو میرے محلے والے یہی سوچ رہے ہوں گے کہ کسی نشہ باز ہپی لڑکی کو میں نے کھانا کھلانے کے لیے مہمان بنا لیا ہے۔"

"اوہ مسٹر شریف! یہ بات تو واقعی بڑی افسوسناک ہے کہ ہم مغربی لوگوں کے بارے میں اتنا ہتک آمیز تاثر آپ لوگوں میں پیدا ہو گیا ہے۔ دراصل اس کی ذمے داری بھی مغربی ممالک کے نام نہاد ترقی یافتہ معاشرے پر ہی عائد ہوتی ہے جس نے اتنے گمبھیر مسائل پیدا کر دیے ہیں کہ نئی نسل روحانی سکون سے بالکل محروم ہو چکی ہے۔ اس سکون کی تلاش میں یہ لوگ نشے کے عادی ہو جاتے ہیں اور اسی کی خاطر اتنے طویل سفر اختیار کرتے اور ذلتیں برداشت کرتے ہیں۔"

"مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ ایک ریسرچ اسکالر ہیں اور ہماری گندی بستیوں میں چرس کی تلاش کے بجائے ایک ٹھوس اور عملی معلومات حاصل کرنے آئی ہیں۔ آپ سوچ سکتی ہیں کہ آپ کے بارے میں ابتدائی سوچ کے برعکس جب حقیقت معلوم ہوئی تو مجھے کتنی مسرت ہوئی ہو گی۔"

"یقیناً مسٹر شریف! میں اندازہ کر سکتی ہوں۔"

اس نوجوان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہ اس غریب آبادی میں اس لیے رہتا ہے کہ اس کے والدین یہاں بستے چلے آئے ہیں۔ ویسے وہ اپنی فطرت کے لحاظ سے واقعی ایک شریف انسان تھا اور تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اس کی فطری شرافت اور نیکی کے جذبات اور بھی نکھر گئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں اس شخص سے تعلقات استوار کروں تاکہ اس اجنبی دیس میں جہاں میں اپنی مرضی کے خلاف ایک خطرناک مشن پر آئی ہوئی ہوں، ضرورت پڑنے پر اس کی مدد حاصل کر سکوں۔ اسی خیال سے میں نے شریف سے کہا۔

"مسٹر شریف! میں کل صبح کی فلائٹ سے راولپنڈی جا رہی ہوں۔ میں تقریباً پانچ دن وہاں ٹھہروں گی۔ اس کے بعد واپس کراچی آؤں گی اور ہوٹل مہران میں مقیم رہوں گی۔ تمہاری بڑی مہربانی ہو گی اگر میری پنڈی سے واپسی پر تم مجھے ہوٹل مہران میں ملو۔ میں تمہارے ملک میں بالکل تنہا ہوں۔ بعض وقت تو اپنی تنہائی سے میں بہت بور ہو جاتی ہوں۔ کوئی بات کرنے والا بھی نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں تم میرے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہو سکتے ہو۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ تم مجھ سے ضرور رابطہ رکھو گے۔ ممکن ہے مجھے کبھی تمہاری مدد کی ضرورت بھی پڑ جائے۔"

"مس مُرّا! یہ میرے لیے بڑی عزت افزائی کی بات ہو گی۔ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ تنہائی کے لمحوں میں، میں آپ کو کمپنی دوں۔ مجھے خوشی ہو گی اگر میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔"

شریف کے ساتھ اسی طرح کے دو چار رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ باہر نکل کر دیکھا تو پورا محلہ شریف کے گھر میں اور آس پاس جمع تھا۔ ہر شخص شک و شبہ کی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ شریف نے اپنی زبان میں اپنے ہمسایوں سے کچھ کہا جس کے بعد میں نے ان کی نگاہوں کے تاثر بدلتے ہوئے محسوس کیے۔ میں نے یہ بات بھی محسوس کی کہ شریف کا اپنے پڑوسیوں پر کافی اثر تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان وہ واحد اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھا اور اس لحاظ سے ان لوگوں میں ممتاز تھا اور اس کی بات مانی جاتی تھی۔

واپسی میں ٹیکسی ڈرائیور نے مجھ سے معلوم کرنا چاہا کہ میں جس شخص کے گھر میں گئی تھی وہاں اتنی دیر تک کیوں ٹھہری اور وہاں کیا کیا باتیں ہوئیں۔ ڈرائیور کے اس تجسس کو میں نے پسند نہیں کیا اور اسے مختصر جواب دے کر ٹال دیا۔ اس کے بعد ڈرائیور مجھے اور بھی کئی بستیوں میں لے گیا لیکن

جو ملی اطمینان مجھے شریف سے مل کر حاصل ہوا تھا اس میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکا۔ وہ فاصلے میں واپس اپنے ہوٹل پہنچ گئی۔ ہوٹل پر اتارتے ہوئے ڈرائیور نے مجھے آگاہ کیا کہ میں رات کے وقت باہر نکلنے میں محتاط رہوں کیونکہ بعض بدمعاش ٹیکسی ڈرائیور بھی سواریوں کو سنسان جگہ لے جا کر لوٹ لیتے ہیں اور مزاحمت کی جائے تو قتل تک سے دریغ نہیں کرتے۔

ان دنوں پاکستان میں مارشل لا نافذ تھا اور حفاظتی انتظامات بہت سخت تھے لیکن غیر ملکی سیاحوں کو کوئی پریشانی نہیں تھی۔ انہیں حسب معمول خوش آمدید کہا جاتا تھا اور جہاں تک ممکن ہوتا ان کی رہنمائی اور مدد کی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں ہوٹل کی انتظامیہ بھی سیاحوں سے بہت تعاون کرتی تھی اور ملک کے مختلف حصوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لیے ہر وقت مستعد رہتی تھی۔ یہی صورت میرے سلسلہ میں بھی تھی۔ جب مجھے کاؤنٹر سے پی آئی اے کا ٹکٹ دیا گیا تو کلرک نے بڑی خوش اخلاقی سے مجھ سے کہا:

"مس کلر! آپ ہمیں حکم دیتیں تو آپ کی بکنگ ہم بھی کرا سکتے تھے۔ آئندہ کے لیے آپ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اس قسم کی خدمات بالکل مفت ہر مہمان کو حاصل ہو سکتی ہیں۔"

دراصل مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ ملی نے کس ذریعے سے پنڈی کے لیے میری بکنگ کرائی تھی اور کس کے ہاتھ میرا ٹکٹ مجھے بھجوایا تھا۔ میں بے چارے کلرک کو کیا جواب دیتی۔ بہرحال میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور آئندہ کے لیے ایسی خدمات ہوٹل کی انتظامیہ سے لینے کا وعدہ کر لیا۔

٭

پروگرام کے مطابق میں ۲۴ ستمبر کو دوپہر کے وقت راولپنڈی پہنچ گئی۔ ایئر پورٹ سے پی آئی اے کی اسٹیشن ویگن کے ذریعے فلیشمین ہوٹل پہنچی جہاں پہلے ہی سے میرے لیے ایک کمرہ مخصوص تھا۔ کمرے میں اپنا مختصر سا سامان رکھ کر سب سے پہلے میں نے غسل خانے کا رخ کیا، جہاں سے ترو تازہ ہو کر نکلی تو روم سروس کے ذریعے لنچ طلب کیا۔

تین بجے سہ پہر میں خلاف عادت لیٹ کر سو گئی۔ مجھے دن میں سونے کی عادت نہیں ہے لیکن اس سفر میں میرے دل و دماغ اور اعصاب کچھ اتنے زیادہ متاثر تھے کہ مجھے زیادہ سے زیادہ جسمانی اور ذہنی آرام کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے وطن میں میں نے کبھی کبھار کسی خاص پارٹی یا قومی جشن کے موقع پر وسکی ضرور پی تھی لیکن شراب کی میں عادی تھی اور نہ ہی اس کے استعمال کو اچھا سمجھتی تھی لیکن مجھے کوئی خاص پرہیز بھی نہیں تھا۔ ہالینڈ میں تیار ہونے والی وسکی دنیا بھر میں مشہور ہے اور اکثر ممالک خصوصاً امریکہ میں تو ہالینڈ کی وسکی کی مانگ بہت زیادہ ہے۔ میرے ہم وطن تو وسکی کا روزانہ استعمال بہت ضروری خیال کرتے ہیں لیکن میرے والدین بھی چونکہ صرف خاص خاص موقع پر ہی اسے استعمال کرتے تھے اس لیے وہی طریقہ میں نے بھی اپنا لیا تھا۔ میں بھی شراب نوشی کو اچھا نہیں سمجھتی تھی اور کبھی کبھار ہی وسکی پیتی تھی اس لیے اور بھی میں شراب نوشی سے دور ہی رہی لیکن اس سفر کے دوران کئی مرتبہ بڑی شدت سے مجھے وسکی کی خواہش ہوئی۔ پاکستان میں میرے پہنچنے سے چند ماہ پیشتر ہی شراب پر پابندی لگا دی گئی تھی اس لیے عام طور سے بارز اور ہوٹلوں میں وسکی دستیاب نہیں تھی، البتہ میرے جیسے مستند غیر ملکیوں کے پینے پر کوئی پابندی نہیں تھی لیکن کراچی کے جس ہوٹل میں میرا قیام تھا وہاں شراب فروخت نہیں کی جاتی تھی۔ میں چاہتی تو کسی ایسے ہوٹل میں منتقل ہو سکتی تھی، جہاں غیر ملکیوں کے لیے شراب فراہم کی جاتی تھی لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ مجھے شراب کی ضرورت نہیں تھی لیکن اب پنڈی آنے کے بعد مجھے وسکی کی طلب بڑی شدت کے ساتھ ہونے لگی۔ شام کو چھ بجے میں سو کر اٹھی تو میں نے بیرے کو بلا کر برانڈی لانے کا آرڈر دیا۔ وسکی کے مقابلے میں برانڈی تھکے ہوئے اعصاب کو طاقت اور تازگی بہتر طور پر پہنچاتی ہے۔ میں نے صرف دو پیگ لیے جس کے بعد واقعی میں خود کو ایک بالکل ہی نئی شخصیت محسوس کرنے لگی۔ میری خود اعتمادی جو باوجود میری بھرپور کوششوں کے کمزور پڑتی جا رہی تھی اب نہ صرف واپس آ گئی تھی بلکہ کچھ زیادہ ہی شان کے ساتھ واپس آئی تھی۔ میں ہر مشکل کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے خود کو آمادہ محسوس کر رہی تھی۔ لاشعور میں کہیں جو ایک نامعلوم سا خوف تھا کہ آئندہ چند دنوں میں مجھے ایک بالکل ہی اجنبی شخص کے ساتھ سنگلاخ ویرانوں میں طویل سفر کرنا ہے اور پھر سیال چیزیں لے کر واپس بھی آنا ہے۔ اب بالکل مفقود ہو چکا تھا حالانکہ مجھے ذرا سا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس مشن میں کس نوعیت کی مشکلات پیش آ سکتی ہیں لیکن میں پوری خود اعتمادی کے ساتھ اپنی جگہ مطمئن ہو گئی تھی کہ جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔

٭

شام گہری ہو گئی تو ہلکے ہلکے سرور کے عالم میں میں باہر

نکلی۔ ہوٹل کے گیٹ پر ہی مجھے ٹیکسی مل گئی اور میں اس
علاقے جو دری دام کی معت کے بازاروں کی سیر کے لیے
چل دی۔ ٹیکسی ڈرائیور جیسا سیاحوں کا گائیڈ ہو، یہ معلوم ہوتا تھا
مجھے پنڈی کے فیشن ایبل بازاروں میں لے گیا جہاں میں نے
خاصی دیر شاپنگ کی۔ ایک بہت بڑے جنرل اسٹور سے
میں نے مختلف قسم کی خوشبویات خریدیں۔ ان کی کمزوری مجھ میں تھی
وہیں ایک سیلزمین نے مجھ سے کہا کہ پنڈی آنے کے ناتے
میں مختلف قسم کے امپورٹڈ سینٹ نہ خریدوں بلکہ خالص دیسی
خوشبو بھی خریدوں جنہیں وہ عطر کہتا تھا۔ اس کا بیان تھا کہ
اصل عطر والی خوشبو کے برعکس بہت دیر تک لباس کو معطر
رکھتا ہے۔ ان میں سے بعض عطر تو ایسے تھے جن میں بسے
ہوئے لباس لانڈری میں دھلنے کے بعد بھی اسی طرح معطر رہتے
تھے چنانچہ میں نے کئی طرح کے عطر بھی خریدے جو اگرچہ بیش بہا نہ
تھے لیکن اپنی خصوصیات کے لحاظ سے تحفے میں دینے کے قابل
تھے۔ میں نے ایک بے حد خوبصورت شیشی حنا کی خوشبو سے
بھری ہوئی جو میں بہم کو بطور تحفہ دینا چاہتی تھی۔ میری طرح بہم
بھی خوشبویات کا عاشق تھا۔

میں دوپہر تک پنڈی کے بازاروں کی سیر کرتی
رہی۔ پھر واپس ہوٹل پہنچ گئی۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی
تھی اور دن میں کئی گھنٹے سو لینے کے باوجود نیند کا بھی غلبہ
تھا۔ میں نے کھانا آرڈر کیا اور کھانا آتے آتے شب خوابی
کا لباس پہن لیا تاکہ کھانا کھاتے ہی سو جاؤں۔

ایک الجھن یہ تھی کہ ہوٹل کے بقول فرانسیسی شیخ کے
ساتھ جو شخص آنے والا تھا اس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔
یہ تو مجھے یقین تھا کہ میری پنڈی میں آمد کی اطلاع اسے
یا اس کے متعلقہ آدمی کو ہو چکی ہوگی اور یہ بات بھی عین
قرین قیاس تھی کہ انہوں نے مجھے اپنی نگاہ میں رکھا ہو۔
سیکڑوں ملین ڈالر کا کاروبار کرنے والے اتنے بے وقوف
ہرگز نہیں ہو سکتے کہ وہ مجھ سے اور میری سرگرمیوں سے غافل
ہو جاتے۔ میری ذرا سی لغزش ان سب کو تباہ کر سکتی تھی۔
لہٰذا میں نے یہی فیصلہ کیا کہ بے وقت انتظار میں بیٹھنے کے
بجائے مجھے باہر نکل کر گھومنا پھرنا چاہیے۔ ظاہر ہے جب
وہ مجھے یہاں سے لے جانا چاہیں گے تو ایسے ہی وقت
ہوٹل پہنچیں گے جب میں اپنے کمرے میں موجود ہوں گی لیکن
اس فیصلے پر عمل درآمد کی نوبت نہ آ سکی۔ میں کھانے سے
فارغ ہو کر غسل خانے میں ہاتھ دھو رہی تھی کہ فون کی گھنٹی
بجی۔ کوئی بہادر خان مجھ سے ملنے آیا تھا۔

میں نے کاؤنٹر کلرک کو ہدایت کی کہ اسے میرے کمرے
میں بھیج دیا جائے۔ بہادر خان بہترین سوٹ میں ملبوس تھا
اس کے ہاتھ میں پائپ دبا ہوا تھا۔ اس نے جھک کر سلام کیا
پھر کہا: "صبح آٹھ بجے ہماری روانگی ہے۔"

"اتنی جلدی۔ میں آج ہی تو پنڈی پہنچی ہوں۔"

وہ مسکرایا: "مس نگرا! پنڈی میں اتنا ہی ہے جتنا آج
آپ نے دیکھ لیا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ بس یہ
ماحول ہے۔"

میں ہنس دی: "تو گویا میری سرگرمیاں تم لوگوں کی
نظروں میں رہی ہیں؟"

"قدرتی بات ہے۔ ہم اپنے معزز مہمان سے کیسے غافل
رہ سکتے تھے؟"

"بہت بہتر جناب، جو آپ کا حکم ہو۔"

بہادر ایک خوش اخلاق اور تجربہ کار شخص معلوم
ہوتا تھا کہنے لگا: "مس نگرا! پنڈی کیا، ہم پورا پاکستان آپ
کو دکھائیں گے۔ جیسی سیر کہیں گی کرائیں گے لیکن کام سے
فارغ ہونے کے بعد۔ دراصل ہمیں بہت سی باتوں کا خیال
رکھنا پڑتا ہے۔ جب سب طرف سے اطمینان ہو جاتا ہے
اس وقت ہم کوئی اہم قدم اٹھاتے ہیں۔ اب آپ نے جیسے
مقررہ مقام پر پارٹی کو بلا لیا ہے۔ اگر بروقت وہاں
نہ پہنچے تو اسے شک ہو جائے گا اور وہ واپس ہو جائے گی۔
پھر دوبارہ اس سے رابطہ قائم کرنا اور وقت کا تعین کرنا ایک
طویل عمل ہوگا۔ آپ میری بات سمجھ گئی ہیں نا؟"

"مسٹر بہادر! آپ نے یہ کیسے اندازہ لگا لیا کہ مجھے
کچھ اعتراض ہے؟ میں خود یہ چاہتی ہوں کہ جس کام کے لیے آئی
ہوں اسے جلد سے جلد مکمل کر کے واپس چلی جاؤں۔"

"واہ واہ، مزہ آ گیا۔ آپ جیسی دلیر خاتون کے ساتھ کام
کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ بس تو پھر یہ معاملہ طے
صبح آٹھ بجے آپ چلنے کے لیے بالکل تیار رہیں گی۔"

"یقیناً میں آپ کو تیار ملوں گی۔" میں نے بڑے اعتماد
سے جواب دیا۔

وہ اطمینان کا اظہار کر کے واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے
ہی میں نے سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ میں ایئرٹرمینل سے روانہ
ہوئی تھی تو میرے پاس بہت مختصر سامان تھا لیکن کراچی
میں شاپنگ کر کے میں نے اپنے سامان کا وزن بڑھا لیا تھا۔
کراچی کے بازاروں میں ایک سے ایک خوبصورت چیز تھی
جسے نہ خریدتی تو ساری زندگی افسوس کرتی۔ پھر بھی تھوڑی سی

نہیں تھا کہ زندگی میں دوبارہ کبھی یہاں آنا ہوگا یا نہیں،
لہٰذا جو مہلت ملی اسے غنیمت جان کر میں نے ہر وہ چیز
خرید لی جو مجھے اچھی معلوم ہوئی۔ میں نے سنگ تراشی کے خوبصورت
نمونے لیے۔ سنگ مرمر کے بنے ہوئے تاج محل کے ماڈل خریدے
تاکہ اپنے دوستوں کو یادگاری تحفے دے سکوں۔ مشرقی وضع کے
بیل بوٹوں سے مزین زنانہ لباس خریدے۔ کشمیری مینا کاری
کیے ہوئے لکڑی کے سجاوٹی ظروف بھی خریدے۔ ایسے ایسے
خوبصورت ڈیزائنوں والے زیورات خریدے جن کا تصور بھی
نہیں کیا جا سکتا۔ غرضیکہ بے شمار چیزیں تھیں جو میں نے خرید لی
تھیں۔ زندگی میں اتنی ساری دولت بیک وقت میرے
ہاتھ میں کبھی نہیں آئی تھی اور نہ ہی ایسا اختیار ملا تھا کہ جو
چاہوں خریدوں، جس طرح چاہوں خرچ کروں۔ پھر بھلا میں
کیوں کسر چھوڑتی۔

وعدے کے مطابق بجّاور ٹھیک صبح آٹھ بجے
لینڈ اروور لے کر پہنچ گیا۔ گاڑی کا اندرونی حصہ بہت آرام دہ
اور کشادہ تھا اور کچھ اس انداز سے بنایا گیا تھا کہ اندر بیٹھا ہوا
آدمی باہر سے نظر نہیں آ سکتا تھا۔ صرف ڈرائیور اور اس
کے برابر والی نشست پر بیٹھا ہوا شخص ہی سڑک سے دیکھا
جا سکتا تھا۔ اس گاڑی کو خاص طور پر ایسے ہی مقاصد کے
لیے تیار کیا گیا تھا۔ اندرونی حصے میں ہلکا پھلکا کھانا اور چائے
وغیرہ تیار کرنے کا بھی انتظام تھا۔ گویا طویل سفر میں کہیں
قیام کیے بغیر کھانے پینے کی ہر ضرورت پوری کی جا سکتی تھی۔
گاڑی میں خشک راشن اور بسکٹوں کے ڈبے بھی وافر مقدار
میں موجود تھے۔ ایک جانب ٹھنڈے پانی کی ٹنکی بھی تھی۔
گاڑی میں سوار ہو کر بجّاور نے مجھے اندرونی حصے میں منتقل
کر دیا اور خود ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہمارا ڈرائیور
ادھیڑ عمر کا پٹھان تھا جس کے چہرے پر بلا کی خشونت تھی۔
اس کی سرخ سرخ آنکھیں ہر وقت چاروں طرف گھومتی معلوم
ہوتی تھیں جیسے وہ کوئی ریڈار ہوں، وہ مضبوط جسم اور طویل
قد و قامت کا مالک تھا۔ وہ شلوار قمیص میں ملبوس تھا،
اور کمر سے ایک چمڑے کی پیٹی میں ریوالور بھی لٹک رہا تھا۔
سینے پر کارتوس کی پیٹی تھی۔ بجّاور حسب معمول قیمتی سوٹ
پہنے ہوئے تھا اور مسلسل پائپ کے کش لگا رہا تھا۔

گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور تیزی سے مختلف
موڑ کاٹتی ہوئی ایک سیدھی اور طویل سڑک پر آ گئی۔ اس سڑک
پر آتے ہی رفتار میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ ایک گھنٹے تک
تیز رفتاری سے راستہ طے کرنے کے دوران ہم تینوں خاموش رہے۔
ڈرائیور جسے بجّاور نے ایک بار لالہ کہہ کر مخاطب کیا تھا پوری
توجہ سے ڈرائیونگ کر رہا تھا اور خود بجّاور کسی گہری سوچ
میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے جب یہ ماحول دیکھا تو خود بھی
کوئی بات کرنے کے بجائے شفاف پلاسٹک کے پار بیرونی
مناظر دیکھنے لگی۔ یہ مناظر اتنے خوبصورت تھے کہ مجھے بعض
وقت یہ گمان ہوتا تھا کہ میں یورپ کے ہی کسی ملک میں
گھوم رہی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایسے مقام پر پہنچ گئے
جہاں سڑک پہاڑیوں میں داخل ہو جاتی تھی اور جگہ جگہ
خطرناک موڑ مڑتی تھی لیکن لالہ پوری مہارت سے گاڑی چلا
رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے اس سرزمین کے ایک
ایک انچ سے واقفیت ہو۔ جب ہم اس پہاڑی علاقے میں
پہنچے تو پہلی بار بجّاور نے مجھے مخاطب کیا۔

"مس عذرا ہمارا ملک آپ کو پسند آیا؟"

"میں تمہارے ملک سے بہت متاثر ہوئی ہوں مسٹر
بجّاور، بلکہ ابھی ابھی میں سوچ رہی تھی کہ خوبصورتی کے
لحاظ سے آپ کا ملک یورپ کے بہت سے ممالک کو بھی
پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ خصوصاً یہ پہاڑی علاقہ، یہ ہرا بھرا ماحول
یہ حدِ نظر تک پھول ہی پھول اور جگہ جگہ پہاڑی ندیاں اور
جھرنے۔ میں نے بیٹھے بیٹھے کتنی ہی تصویریں اتاری ہیں۔"

"اچھا مس عذرا، یہ آپ چپکے چپکے کمائی کا دھندا بھی
کر رہی ہیں۔" بجّاور نے خوش دلی سے کہا اور پھر کہنے لگا۔
"مگر میرا کمیشن مجھے ضرور بھجوا دیجیے گا۔"

"ضرور ضرور، آپ کی وجہ سے ہی میں اس علاقے
تک پہنچی ہوں۔ کمیشن آپ کا حق ہے۔"

اس مختصر سی گفتگو کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ بجّاور
نے اپنا پائپ ڈیش بورڈ پر رکھ دیا اور پشتو میں لالہ سے
کچھ کہا۔ جواب میں ڈرائیور نے سڑک کے ایک جانب
گاڑی روک دی۔

گاڑی رکتے ہی بجّاور "ابھی آیا" کہہ کر ایک قریبی
پہاڑی کی اوٹ میں غائب ہو گیا اور لالہ اسٹیئرنگ پر سر
ٹکا کر انتظار کرنے لگا۔ میں سوچنے لگی، اس ویرانے میں وہ
کس سے ملنے گیا ہے۔ کیا کوئی شخص پہلے سے اس کا منتظر
تھا۔ میری ہمت نہیں ہوئی کہ لالہ سے کچھ پوچھوں لہٰذا
میں دھڑکتے دل کے ساتھ چوکنا ہو کر بجّاور کی واپسی کا
انتظار کرنے لگی۔

تقریباً دس منٹ کے بعد بجّاور واپس آتا نظر آیا۔ اس
کے قریب پہنچتے ہی لالہ نے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کی اور

اس کے بیٹھتے ہی آگے بڑھا دی۔ میں اب بھی خاموش تھی کہ بختاور نے اپنے شانے کے اوپر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
"کال آف نیچر"

"اوہ یہ بات تھی۔ میں سوچ رہی تھی اس ویرانے میں تم کس فرشتے سے ملنے گئے ہو" وہ ہنسنے لگا۔

ہم لوگ اٹک کے پل پر پہنچے تو ڈیڑھ بج رہا تھا۔ پل پر چیکنگ کرنے والے عملے نے سرسری طور پر گاڑی کے اندر نظر ڈالی اور آگے بڑھ جانے کا اشارہ کیا۔ ہم نے پل عبور کر لیا تو بختاور نے مجھے بتایا کہ اب ہم لوگ پنجاب سے نکل کر صوبہ سرحد میں داخل ہو گئے ہیں۔ پھر اس نے پاکستان کے چاروں صوبوں کے متعلق بتایا۔ آخر میں صوبہ سرحد کے بارے میں کہنے لگا کہ پاکستان کا یہ صوبہ اپنی جغرافیائی حیثیت اور محل وقوع کے لحاظ سے سب سے اہم صوبہ ہے۔ اس صوبے کی سرحدیں ایک طرف افغانستان سے ملتی ہیں تو دوسری طرف روس اور چین سے ملتی ہیں۔ تیسری سمت کشمیر ہے۔ کشمیر کے بارے میں بختاور نے بتایا کہ یورپ کا سب سے حسین ملک سوئٹزرلینڈ ہے جس کے حسن کے گیت سارے یورپ والے گاتے ہیں، لیکن کشمیر وہ خطہ ہے جو سوئٹزرلینڈ سے ہزار گنا زیادہ خوبصورت ہے اور شاعروں نے اسے زمین پر جنت کا ٹکڑا کہا ہے۔ مجھے بختاور کی بات کا یقین آگیا۔ اس لیے کہ اب تک جتنا علاقہ میں دیکھتی آ رہی تھی وہ واقعی اس قدر حسین تھا کہ اس کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ اتنے خوبصورت علاقے کا رہنے والا اگر کشمیر کے حسن کی تعریف کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ واقعی وہ کوئی چیز ہو گا۔

اٹک کے پل سے گزر کر ہم بلند و بالا پہاڑوں میں داخل ہو گئے۔ بیشتر مقامات ایسے تھے جن کے ایک جانب آسمان سے باتیں کرتا ہوا پہاڑ تھا تو دوسری جانب ہزاروں فٹ گہرے کھڈ۔ اس پر مستزاد یہ کہ جگہ جگہ اچانک موڑ جہاں ڈرائیور ذرا سا بھی چوک جائے تو سوار اور سواری سمیت... تحت الثریٰ جا پہنچے لیکن شاباش ہے لالہ کو جو پورے انہماک اور مہارت سے گاڑی چلا رہا تھا۔ مجھے اس کی خاموشی اب بھلی لگ رہی تھی۔ میں دل سے چاہتی تھی کہ وہ اپنا دھیان صرف راستے پر رکھے اور بات چیت بالکل نہ کرے جس کے دوران اس کی توجہ بٹ سکتی تھی۔

ڈھائی بجے کے لگ بھگ جب میں بھوک سے بے حال ہو گئی تو میں نے بختاور سے کہا: "مسٹر بختاور! آپ لوگوں نے لنچ کا کیا پروگرام رکھا ہے۔ کیا ہم اس سفر کے دوران بھوکے ہی رہیں گے؟"

"صرف تیس منٹ اور صبر کریں مس طرا۔ تین بجے تک ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ جائیں گے جہاں گرما گرم لنچ ہمارا منتظر ہو گا۔"

"اوہ۔ تو یہ بات ہے۔ آپ نے راستے کے لیے میزبانوں کا بھی اہتمام کر رکھا ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جی ہاں آپ ٹھیک سمجھیں اور یہ جو آپ گاڑی میں بیگن اور راشن دیکھ رہی ہیں، یہ صرف ہنگامی مواقع کے لیے ہے جب ہمیں سیکڑوں میل تک کسی میزبان کی توقع نہیں ہو گی۔ اس وقت ہم اپنی دعوت خود کریں گے لیکن جب تک ہمیں باہر سے رسد ملتی رہے گی ہم اپنا راشن استعمال نہیں کریں گے۔"

"اگر تم کچھ خیال نہ کرو تو یہ پوچھوں کہ کیا اس سفر میں ایسے کسی ہنگامی موقع کی توقع ہے؟"

"قطعی نہیں۔ اس لیے کہ ہم آج رات ایسے مقام پر بسر کریں گے جو آبادی سے زیادہ دور نہیں ہو گا۔ پھر جن لوگوں کے ساتھ بسر کریں گے وہ ہمارے اپنے لوگ ہوں گے۔ کل صبح جب ہم روانہ ہوں گے تو سہ پہر تک پھر ایک ایسے ہی مقام پر ہوں گے جہاں گرما گرم لنچ ملے گا اور شام تک ہم اپنی منزل پر ہوں گے۔ واپسی بھی اسی طرح ہو گی۔"

"میری بڑی الجھن دور ہو گئی مسٹر بختاور ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ نا معلوم ہمیں کتنا طویل سفر کرنا پڑے۔"

"مگر مس طرا! ایک بات کی معذرت میں پہلے سے ہی چاہتا ہوں۔ براہ کرم مجھ سے ان مقامات کے بارے میں کوئی سوال نہ کرنا جہاں جہاں ہم ٹھہریں گے اور نہ ہی ان لوگوں سے تعارف پر اصرار کرنا جو ہماری میزبانی کریں گے۔ یہ احتیاطی تدابیر ہیں جو ہم ہر غیر ملکی کے سلسلے میں اختیار کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے تم برا نہیں مانو گی۔"

"یقیناً میں برا نہیں مانوں گی۔ مجھے اپنے کام سے غرض ہے اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"ویری گڈ مس طرا! تم جیسی تعاون کرنے والی خاتون کے ساتھ کام کر کے بڑی خوشی ہوتی ہے اور پھر مشن سے بڑا مرحلہ سہولت کے ساتھ طے ہو جاتا ہے۔ دراصل اس کاروبار میں زیادہ سوالات ہمیشہ تباہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ہمیشہ یہ بات یاد رکھنا کہ اسمگلنگ کے کاروبار میں ضرورت سے زیادہ ایک لفظ اور بغیر کسی ضرورت کے ایک سوال بھی مہلک انجام سے دوچار کر سکتا ہے۔ سمجھیں مس طرا؟"

"بالکل مجھے بھی مسٹر بختاور! اب میں بلا ضرورت کوئی سوال نہیں کروں گی۔"

"ٹھیک ہے! تم ہی نہیں، میں خود بھی تم سے کوئی فضول سوال نہیں کروں گا اور تم نے محسوس کیا ہوگا کہ اب تک میں نے تم سے علاوہ ضروری کام کے دوسری کوئی بات نہیں کی۔ ہم لوگ کتنی دیر سے خاموش سفر کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ صبح سے اب تک لالہ نے بمشکل چند لفظ بولے ہوں گے۔ یہ ہمارا بہت پرانا کارکن ہے اور ایک لحاظ سے ہم سب کا استاد۔ اس کے ہاتھوں بڑے بڑے مشکل کام ایسی چٹکیوں میں بخیر وخوبی انجام پاتے ہیں۔ یہ بھی بالکل خاموش ہے۔ معاف کرنا ہماری گفتگو پھر بلا ضرورت ہوتی جا رہی ہے۔"

ہم دونوں نے اس بات پر ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور خاموش ہوگئے۔

ہماری گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی جسے شاید لالہ نہیں سمجھ سکا تھا وہ بدستور پوری توجہ سے ڈرائیونگ کر رہا تھا اور میں خاموش ہو کر ایک ایک منٹ گن رہی تھی کہ کب ہم اپنے میزبانوں کے درمیان پہنچیں گے اور کب کھانا نصیب ہوگا۔

بالآخر یہ جان لیوا آدھا گھنٹہ بھی گزر گیا اور ایک پہاڑی گاؤں کے آثار نظر آنے لگے۔ ٹھیک ساڑھے تین بجے لالہ نے پتھروں سے بنی ہوئی ایک جھونپڑی کے سامنے گاڑی روک دی۔ گاڑی کی آواز سن کر اندر سے تین چار افراد باہر آگئے جو اپنے علاقائی لباسوں میں ملبوس تھے۔ بختاور کو دیکھ کر انہوں نے بڑا تپاک ظاہر کیا۔ اس سے گلے ملے۔ انہوں نے بختاور سے اپنی زبان میں میرے بارے میں کچھ پوچھا۔ میرا اندازہ ہے کہ بختاور نے ان لوگوں کو میری اصلیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا لیکن اس نے جو کچھ بھی بتایا اس کے نتیجے میں ان کی نظروں میں میرے لیے انتہائی احترام جھلکنے لگا۔

ہم تینوں جھونپڑی کے اندر پہنچے جہاں ایک قیمتی قالین بچھا تھا اور ہر طرف بڑے بڑے تکیے نظر آ رہے تھے۔ مجھے اس جھونپڑی میں اتنا قیمتی قالین دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔

ہمارے پہنچتے ہی ہمارے میزبانوں نے دسترخوان بچھا دیا اور درمیان میں ایک بہت بڑے کھلے برتن میں پکے ہوئے چاول جن پر دنبے کے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے لا کر رکھ دیے۔ واقعی گرما گرم تھا۔ اپنی زندگی میں میں نے کبھی اتنے لذیذ چاول اور گوشت نہیں کھایا تھا۔ فرش پر بیٹھ کر کھانے کا بھی میرا یہ پہلا اتفاق تھا۔ یہ خالص مشرقی انداز تھا۔ مجھے اتنی شدید بھوک لگی ہوئی تھی کہ کھانے سے پہلے میں نے کسی بات پر غور ہی نہیں کیا۔ جب پیٹ میں کچھ چلا گیا تب سمجھ میں آیا کہ یہ مشرقی تہذیب ہے جس میں فرش پر آرام سے بیٹھ کر کھانا کھایا جاتا ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر سیاہ قہوے کا دور چلا۔ اس قہوے میں بھی مجھے بے پناہ لطف محسوس ہوا تھا۔ کم و بیش ایک گھنٹہ گزار کر ہم اپنے میزبانوں سے رخصت ہوئے اور ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔

اب جو راستہ ہمارے سامنے تھا وہ گزرے ہوئے راستے کے مقابلے میں کہیں زیادہ دشوار گزار تھا۔ میں بار بار دہل رہی تھی اور دل ہی دل میں خیریت سے منزل تک پہنچنے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

"کھانا پسند آیا؟" اچانک بختاور نے سوال کیا۔

"بے حد پسند آیا مسٹر بختاور! سب سے بڑی بات یہ بھی کہ اس میں سرخ مرچ استعمال نہیں ہوئی تھی مجھے یہی ڈر تھا کہ کہیں ایسی کوئی ڈش نہ ہو جو میں نہ کھا سکوں اور پھر مجھے ان بسکٹوں پر ہی گزارہ کرنا پڑے۔"

"ارے ہاں! یہ بات تو میں [illegible]ن ہی گیا تھا کہ تم یورپی لوگ سرخ مرچ نہیں کھا سکتے۔ دراصل ہمارے ہاں گوشت کے سالن میں طرح طرح کے مسالے اور سرخ مرچ استعمال کی جاتی ہے، چاولوں میں نہیں۔ اور یہ اچھا ہی ہوا خیرات کا کھانا بھی کچھ اس سے ملتا جلتا ہی ہوگا۔"

یہ سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر خاموش ہوگئی۔ پیٹ بھر جانے کے بعد اب جو خاموشی چھائی تو مجھے نیند نے آ گھیرا۔ میں جہاں بیٹھی تھی وہ جگہ کافی کشادہ تھی لہٰذا میں نے بغیر کسی تکلف کے آرام سے لیٹ کر سو جانے کا فیصلہ کیا۔ چند گھنٹوں کی نیند مجھے تر و تازہ بھی کر سکتی تھی اور میں اس خطرناک راستے کے پر ہول نظارے سے محفوظ بھی رہ سکتی تھی۔ چنانچہ میں آرام سے لیٹ گئی۔ مجھے لیٹتے دیکھ کر بختاور نے کہا "بالکل ٹھیک کر رہی ہو مس طرا! میں خود تم سے کہنے والا تھا کہ چاہو تو آرام سے سو جاؤ۔"

"چلیے آپ کے کہنے سے پہلے ہی میں نے سونے کا پروگرام بنا لیا۔ خدا حافظ۔"

وہ ہنسنے لگا۔ گاڑی کے جھٹکے مجھے جھولے کے ہلکورے معلوم ہونے لگے اور انجن کی آواز لوری میں بدل گئی۔

میری آنکھ کھلی تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ اردگرد کا منظر ڈراؤنا سا تھا۔ پہاڑوں کی بلند و بالا چوٹیاں عجیب [illegible] لگنے لگی تھیں۔ لالا اسی تیور اور ہوشمندی سے گاڑی چلا رہا تھا جبکہ بختاور بیٹھا بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر وہ بھی ہوشیار ہو گیا اور گھڑی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے لالا سے پشتو میں کچھ کہا اور جواب سن کر میری طرف متوجہ ہوا۔ "تمہارے سونے کے بعد مجھے بھی نیند آنے لگی تھی اور میں بھی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ سات بج چکے ہیں اب ہم تھوڑی دیر بعد اس جگہ پہنچ جائیں گے جہاں ہمیں رات بسر کرنا ہے۔"

میں خاموش رہی اور اردگرد اسی خیال سے نظر دوڑانے لگی کہ کہیں انسانی آبادی ہو اور روشنیاں نظر آجائیں۔ لیکن دور دور تک تاریکی تھی اور لینڈ کروزر کی آواز کے علاوہ مکمل سناٹا تھا۔ میں سوچنے لگی میرے سونے کے دوران نامعلوم کیسے کیسے خوبصورت مناظر گزر گئے ہوں گے۔ دراصل ہائی اسکول کے زمانے تک مجھے مصوری کا بھی شوق رہا تھا اور لینڈ اسکیپ کی پینٹنگ میرا پسندیدہ موضوع تھا۔ میں نے تہیہ کیا کہ واپسی میں چونکہ اندھیرا نہیں ہوگا اس لیے میں ضرور وہ مناظر دیکھوں گی جو دو گھنٹوں کی نیند کی وجہ سے میں نے کھو دیے ہیں۔

گاڑی میں بھی مکمل خاموشی طاری تھی۔ ہر چند کہ بختاور بھی اپنی غنودگی سے نجات پا کر پائپ سلگا چکا تھا لیکن کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آرہا تھا۔ یہی حال میرا تھا۔ کسی کسی وقت میرے ذہن پر انجانے اندیشے ابھرنے لگتے تھے۔ ان غیر مہذب لوگوں کی نیت میں فتور آتے کتنی دیر لگتی۔ میرے پاس اپنی حفاظت کے لیے کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا جبکہ وہ ہر وقت مسلح رہتے تھے۔ اگر ایسا کوئی وقت آجاتا تو میں کیا کر سکتی تھی۔ سوچتے سوچتے میں نے فیصلہ کیا کہ میں ان لوگوں کے سامنے کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کروں گی۔ اب تک جس خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتی آرہی ہوں اسے جاری رکھوں گی۔ آخر یہ لوگ بھی تو سوچیں گے کہ بظاہر ایک کمزور سی لڑکی ایسے خطرناک مشن پر آئی ہے تو ضرور اس نے اپنی حفاظت کا کوئی مضبوط انتظام کر رکھا ہوگا۔ بس یہی گمان میری حفاظت کے لیے کافی ہے۔

لالا نے ایک بہت ہی مشکل موڑ بڑی مہارت سے موڑا اور ایک فرلانگ تک تقریباً عمودی چڑھائی چڑھنے کے بعد اچانک ایک بستی میں گاڑی داخل کر دی۔ چاروں طرف دھیمے دھیمے جلتے ہوئے چراغوں کی روشنی نظر آرہی تھی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ بختاور نے سیٹ پر پہلو بدلا۔ پھر گاڑی ایک پتھروں سے بنے ہوئے احاطے میں داخل ہو کر ٹھہر گئی۔

آٹھ بج رہے تھے۔ اس بستی میں بھی بلا کا سناٹا تھا صرف ہلکی سی روشنی کی وجہ سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کچھ لوگ رہتے ہیں اگر گھروں میں چراغ نہ جل رہے ہوتے تو کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں کوئی انسانی بستی بھی ہے۔

گاڑی کے رک جانے کے باوجود اندر مکان سے کوئی برآمد نہیں ہوا تو لالا نے ہارن بجایا، جو اس سناٹے میں بم کے دھماکے کی طرح لگا تھا۔ فوراً ہی چاروں طرف سے آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ بختاور گاڑی سے اتر چکا تھا۔ لالا اور میں ابھی اپنی جگہ پر بیٹھے تھے۔ چند لمحوں بعد کئی لوگ بختاور کے قریب پہنچ گئے اور اس سے معانقہ کرنے لگے۔

گاڑی جس احاطے میں رکی تھی وہ اس گاؤں کی چوپال تھی جسے مقامی لوگ حجرہ کہتے تھے۔ بختاور کے اشارے پر میں بھی گاڑی سے اتر آئی اور اپنا بیگ لٹکائے ہوئے آگے بڑھ کر حجرے میں داخل ہو گئی۔ حجرہ خاصا کشادہ تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے تک یہاں بہت سے لوگ بیٹھے رہے ہوں۔ تمباکو کی بو بھی سارے حجرے میں بسی ہوئی تھی۔ ایک جانب ایک طویل و عریض تخت بچھا ہوا تھا جس پر ایک قیمتی قالین بچھا تھا۔ حجرے کے درمیان میں ایک گڑھا تھا جس میں آگ جل رہی تھی۔ میں نے اپنا بیگ تخت پر ایک جانب رکھ دیا اور خود بھی ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ بختاور اور دوسرے لوگوں کی آوازیں باہر سے آرہی تھیں۔ وہ لوگ پشتو میں باتیں کر رہے تھے جو میں نہیں سمجھ سکی۔ میں بیٹھی بیٹھی حجرے کا جائزہ لیتی رہی اور سوچتی رہی کہ اس علاقے میں لوگوں نے مشکل زندگی کو اپنی سادگی سے کتنا آسان بنا لیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس بستی میں بمشکل ایک سو گھر ہوں گے اور شاید تمام لوگ ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کر کے زندگی کی گاڑی کو دھکا دیتے ہوں گے ورنہ اس اجاڑ اور ویران مقام پر کسی کا بھی گزارہ ممکن نہیں ہو سکتا۔

میں اپنی سوچوں میں گم تھی کہ بختاور اندر آیا اور مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بیگ اٹھایا اور اس کے تعاقب میں چلتی ہوئی حجرے سے باہر آگئی۔ بختاور نے ایک شخص کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا۔
"مس حرا! تم اس کے ساتھ اس کے گھر میں جاؤ، وہاں

خواتین ہیں۔ تم ان کے ہمراہ رات بسر کرو گی۔ تمہارا ڈنر بھی تمہیں وہیں ملے گا۔"

"او، مسٹر بختاور! بہت بہت شکریہ۔ تم نے یہ انتظام کر کے میری ساری فکر دور کر دی۔"

بختاور نے فخریہ لہجے میں کہا: "مس مارگرا! ہم پٹھان لوگ اپنے مہمان کی حفاظت کرنا اچھی طرح جانتے ہیں۔ تم یورپ کے کسی شہر میں شاید اتنی محفوظ نہیں ہو گی جتنا پاکستان کے اس دور افتادہ پہاڑی گاؤں میں۔ یہاں تمہیں اپنی ماں کی آغوش کی مانند آرام اور تحفظ ملے گا۔ جاؤ اور کل صبح سات بجے روانگی کے لیے تیار رہنا۔"

اتنا کہہ کر بختاور، ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو گیا اور میں اس شخص کے ساتھ اس کے مکان میں آ گئی جہاں تین خواتین تھیں جو غالباً بڑے جوش و خروش سے میری آمد کی منتظر تھیں۔ میرے پہنچتے ہی انہوں نے پشتو میں جلدی جلدی بولنا شروع کر دیا اور مجھے اس انداز سے دیکھ رہی تھیں جیسے میں کسی اور سیارے کی مخلوق ہوں۔ سب سے زیادہ حیرت سے وہ میری اسکرٹ کو دیکھ رہی تھیں جو ان کے معیار کے مطابق برہنگی کی دوسری شکل تھی۔ تاہم انہوں نے مجھے بڑے آرام کے ساتھ رات بھر رکھا۔ میں بھی پوری دل جمعی کے ساتھ بستر پر لیٹ گئی۔ کھانا البتہ مجھے تنہا ہی کھانا پڑا۔ شاید وہ پہلے ہی کھا چکی تھیں یا شاید میرے ساتھ کھانا انہوں نے معیوب سمجھا تھا۔

✱

اس علاقے میں ان دنوں اچھی خاصی گرمی پڑ رہی تھی لیکن مجموعی طور پر موسم خوشگوار تھا۔ میں جو اپنے ملک میں علی الصبح اٹھ کر اسکول جانے کی عادی تھی بغیر کسی دشواری کے بختاور کی ہدایت کے مطابق صبح سات بجے چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ میری میزبان خواتین نے مجھے دودھ، مکھن اور مکئی کی تازہ روٹی کا ناشتہ کرایا۔ میں اس لذت کو بیان نہیں کر سکتی جو مجھے اس پہاڑی بستی میں اتنا سادہ ناشتہ کر کے حاصل ہوئی تھی۔ مجھے یہ ناشتہ اور اپنی میزبان خواتین ساری عمر یاد رہیں گی۔ ان کے بارے میں میں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن یہ موقع ان تفصیلات میں جانے کا نہیں ہے۔ مختصراً اتنا کہہ سکتی ہوں کہ پاکستان کے مرد جتنے متواضع، خلیق، بہادر اور شاندار ہیں، ان کی خواتین ان صفات میں ان سے ہرگز کم نہیں بلکہ ان میں ایک زائد صفت ان کی حیا اور پاکیزگی ہے۔ میری میزبان خواتین میں ایک غیر شادی شدہ نوجوان لڑکی بھی تھی۔ وہ مجھ سے اتنا شرماتی تھی کہ یورپ میں کوئی دوشیزہ کسی غیر مرد سے بھی اتنا حجاب نہ برتتی ہوگی۔

ٹھیک سات بجے ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔ ایک نئی بات یہ ہوئی کہ ہمارا ڈرائیور لالہ جو بوسکی کی شلوار قمیص میں ملبوس پنڈی سے چلا تھا، اب اس نے گہرے سرمئی رنگ کے ملیشیا کے کپڑے پہن لیے تھے۔ اس کا ریوالور اور کارتوسوں والی پیٹی البتہ اسی طرح اس کی شخصیت کا حصہ تھی۔ بختاور نے مجھے صبح بخیر کہا اور رسمی طور پر آگے بڑھنے کی اجازت مانگی۔ میں نے مسکرا کر کہا: "ضرور سفر شروع کر دو تاکہ یہ جلد ختم ہو اور ہم لوگ بامراد ہو کر اپنی اپنی جگہوں پر واپس ہو سکیں۔"

"آمین!" بختاور نے کہا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ بستی کے تقریباً تمام ہی مردوں اور بچوں نے ہمیں خدا حافظ کہا اور جب تک ہماری لینڈ روور نظر آتی رہی وہ رنگ برنگے رومال لہراتے رہے۔

رات بھر آرام اور اطمینان سے سونے کا فائدہ یہ ہوا کہ میں بالکل تازہ دم ہو چکی تھی۔ گزشتہ روز کے سفر کی تھکن کا کوئی اثر باقی نہیں رہا تھا۔ صبح کے وقت اس علاقے کی خوبصورتی نرم نرم دھوپ میں نکھر کر اور بھی دلکش ہو گئی تھی۔ دور دور تک سرسبز پہاڑوں کے سلسلے، گہری گہری وادیاں جن میں حدِ نگاہ تک پھول ہی پھول کھلے تھے۔ فضا میں ایسی خوشبو رچی ہوئی تھی جس نے مشامِ جان کو معطر کر دیا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے دل میں امنگیں لہرا لہرا جاتی تھیں۔ اس وقت کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔ دوپہر ہوتے ہوتے جب دھوپ میں تیزی آ گئی تو علاقے کے مناظر بھی بدلنا شروع ہو گئے۔

"اب ہم علاقہ غیر میں سفر کر رہے ہیں۔ یہاں کسی کی حکمرانی نہیں ہے نہ کسی مہذب حکومت کا کوئی قانون یہاں نہیں چلتا۔ اس علاقے کے رہنے والے اپنے معاملات خود اپنے بڑوں کے ذریعے طے کرتے ہیں۔ قتل تک کے مقدمات متعلقہ علاقے کے بزرگ آپس میں مشورے سے نمٹاتے ہیں۔ یہاں صرف انصاف ہوتا ہے اور اسلامی احکام کے مطابق تنازعات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ قرآن کی قسم پر سنگین سے سنگین مسئلہ حل ہو جاتا ہے لیکن ہمارے لوگ قرآن کی سچی قسم بھی جہاں تک ممکن ہو نہیں کھاتے۔ کہیں کوئی شخص قرآن کی قسم کھا کر کسی بات کا یقین دلائے تو ہر شخص پر لازم ہو جاتا ہے کہ اس کا یقین کرے۔"

میں حیرت سے جبّاور کی باتیں سن رہی تھی۔ اس علاقے کے بارے میں جبّاور کا اتنی تفصیل سے گفتگو کرنے کا مقصد غالباً میرے دل میں یہ خوف پیدا کرنا تھا کہ اگر میرے دل میں ایک لمحے کے لیے کوئی ایسی ویسی بات یا غداری کا تصور بھی آ جائے تو میں اپنے ارادے سے باز رہوں اور خاموشی سے وہی کرتی رہوں جس کا جبّاور مجھے حکم دے۔ وہ مزید بتانے لگا۔

"جب ہندوستان اور پاکستان پر انگریزوں کی حکومت تھی، جیسے ہالینڈ والوں نے انڈونیشیا کو غلام بنایا ہوا تھا۔ ان دنوں بھی اس علاقے کے لوگ انگریزوں کے قبضے میں نہیں آ سکے تھے۔ ان پہاڑوں میں بڑی خوفناک جنگیں بھی لڑی گئیں لیکن یہ مسلمان قبائلی کسی بھی طور پر انگریزوں کے قابو میں نہیں آ سکے۔ یہی وجہ تھی کہ افغانستان جو ہمیشہ سے ایک بہت کمزور ملک رہا ہے، انگریز اس کی خود مختاری کا احترام کرنے پر مجبور ہو گئے اور باقاعدہ معاہدہ کر کے افغانستان کو ایک آزاد مملکت تسلیم کر لیا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی قبائلی اپنے قدیم رسم و رواج کے پابند ہیں۔ وہ نہ افغانستان کی حکومت کے تابع ہیں اور نہ ہی حکومت پاکستان کے کسی قانون کو مانتے ہیں۔ البتہ اپنے مذہب اسلام کے نام پر وہ بڑی سے بڑی قربانی بھی دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ صرف اسلام اور قرآن کا قانون مانتے ہیں اور اسی کے مطابق اپنے تنازعات کے فیصلے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر طرف انصاف کا دور دورہ ہے۔ اگر کسی کمزور پر کسی طاقتور نے کوئی ظلم کیا ہے تو وہ غریب جرگہ میں جا کر فریاد کر سکتا ہے۔ اس کی شکایت پر جرگہ اس شخص کو فوراً طلب کرے گا خواہ وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔ پھر جرگہ فریقین کا موقف سن کر از روئے انصاف فیصلہ صادر کرے گا۔ اس کا فیصلہ ماننا ہر شخص پر فرض ہوتا ہے۔

اس قبائلی معاشرے میں جو بظاہر وحشی نظر آتا ہے تمہیں ایسے واقعات عام ملیں گے جن میں کسی قبیلے کے بزرگوں نے ایک غیر ملکی کے مقابلے میں خود اپنے کسی شخص کے خلاف فیصلہ دیا ہو لیکن یہ لوگ اس امر کی ہرگز اجازت نہیں دیتے کہ کوئی غیر ملکی یہاں آ کر مقامی لوگوں کا استحصال کرے یا اپنی چالاکی سے ایسا کوئی کام کرنے کی کوشش کرے جس سے وہ خود تو دولت مند ہو جائے اور مقامی آبادی یا فرد کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔"

جبّاور نے غیر ملکیوں کے حوالے سے یہ گفتگو محض مجھے یہ باور کرانے کے لیے کی تھی کہ میں کبھی کسی غداری کا خیال بھی دل میں نہ لاؤں۔ وہ خواہ مخواہ ایسی باتیں کر کے خود اپنے بنائے ہوئے اس اصول کو توڑ رہا تھا کہ اسمگلنگ کے کاروبار میں متعلقہ فریقین کو کم سے کم گفتگو کرنا چاہیے اور غیر متعلق بات تو بالکل ہی نہیں کرنا چاہیے۔ میں جبّاور کی تسلی کے لیے پوری توجہ سے اس کی تقریر سنتی رہی اور سر ہلاتی رہی۔ اس طرح میں نے وہی رد عمل ظاہر کیا جس کی وہ مجھ سے توقع رکھتا تھا۔

اب ہماری گاڑی باقاعدہ سڑک چھوڑ کر تنگ پہاڑی پگڈنڈیوں پر نسبتاً کم رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ اس راستے پر بھی لالہ یکساں مہارت سے گاڑی چلا رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے خراب راستے کا کوئی احساس ہی نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسے راستوں پر کار چلانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ صرف لالہ جیسے منجھے ہوئے ٹھنڈے دل و دماغ کا شخص ہی ان راستوں پر کار چلا سکتا تھا اور اس پر پورا پورا قابو رکھ سکتا تھا۔

دوپہر کو جبّاور نے فیصلہ کیا کہ گاڑی میں موجود راشن کی مدد سے لنچ تیار کیا جائے گا لیکن اس مقصد کے لیے گاڑی روکی نہیں جائے گی۔ چلتی گاڑی میں ہی آلو کے چپس اور مٹر کے دانے بھونے جائیں گے جنہیں مکھن لگی ڈبل روٹی سے کھایا جائے گا۔ بعد ازاں کافی یا چائے بنا کر پی جائے گی۔

اس قافلے میں عورت ہونے کی وجہ سے لنچ تیار کرنے کی ذمے داری میں نے سنبھال لی حالانکہ جبّاور نے خود سب کام کرنے کے لیے بہت اصرار کیا لیکن میں نے اس کی مدد لینے سے بھی صاف انکار کر دیا اور چلتی گاڑی میں بڑی آسانی کے ساتھ بڑا مزے دار لنچ تیار کر دیا۔ لنچ تیار کرتے ہوئے اور بعد ازاں لنچ کرتے ہوئے میں یہ بات بالکل بھول گئی کہ میں کسی مشن پر ہوں۔ مجھے بالکل پکنک جیسا لطف آ رہا تھا۔ ان دونوں نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا اور میری بڑی تعریف کی۔

ہم لوگ لنچ سے فارغ ہو کر چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ اچانک ایک دھماکے کی آواز سن کر اچھل پڑے۔ کہیں قریب ہی کسی نے رائفل سے فائر کیا تھا۔ لالہ نے بڑی ہوشیاری سے گاڑی کو ایک چٹان کی آڑ میں کھڑا کر دیا اور جبّاور نے اپنا ریوالور نکال کر ہاتھ میں تھام لیا۔ لالہ نے بھی اپنا ہولسٹر کھول لیا لیکن ریوالور باہر نہیں نکالا۔ تھوڑی دیر تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے، جیسے فائر کی سمت کا تعین کرنے کی کوشش کر رہے ہوں لیکن

دو تین منٹ گھومنے کے باوجود بھی نہ تو کوئی دوسرا دھماکہ
ہوا نہ ہی ہماری گاڑی کی طرف کوئی آتا نظر آیا۔

بجاور اچانک نیچے کود گیا اور تھوڑی سی دشواری کے
ساتھ اس چٹان پر چڑھ گیا جس کی آڑ میں گاڑی کھڑی تھی۔
اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ پھر وہ واپس گاڑی
میں آیا اور جس سیٹ پر وہ بیٹھا تھا اس کے نیچے سے ایک
دوربین نکال کر دوبارہ چٹان پر چڑھ گیا۔

وہ فوراً واپس آیا اور تشویش ناک لہجے میں لالہ سے پشتو
میں باتیں کرنے لگا۔ پھر وہ میری فکرمندی کا خیال کرکے مجھے
بتانے لگا کہ تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر وادی میں چند لوگ
رائفلیں لیے نظر آئے ہیں۔ دور ہونے کی وجہ سے وہ پہچانے
نہیں جا سکے۔ ممکن ہے وہ شکاری ہوں اور یہ بھی ہو سکتا
ہے کہ افغانستان یا پاکستان کی بارڈر آرمی کے سپاہی ہوں،
جن کے ذمے صرف سرحدوں کی حفاظت ہی نہیں بلکہ اسمگلنگ
کی روک تھام بھی ہے۔

میں نے کسی گھبراہٹ کے اظہار کیے بغیر پوچھا: "یہ کیسے
پتہ چلے گا کہ وہ کون ہیں؟"

"ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔" بجاور نے کہا: "لیکن یہ
انتظار خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا: "اگر وہ اتنے قریب آگئے کہ ہمیں دیکھ
لیا اور وہ بارڈر آرمی کے لوگ ہوئے تو پھر ہمیں نکل جانے
کا موقع بھی نہیں ملے گا۔" بجاور نے میری بات سن کر اس
طرح سر ہلایا جیسے وہ میری بات کو وزن دے رہا ہو۔ پھر
لالہ سے مخاطب ہو کر پشتو میں کچھ کہنے لگا۔ لالہ جواب
تک خاموش ہی رہا تھا اکھڑ لہجے میں بجاور کو ایک جانب
اشارہ کرکے کچھ بتانے لگا۔ پھر وہ دونوں اپنی اپنی جگہوں پر
بیٹھ گئے اور گاڑی بظاہر اسی طرف روانہ ہو گئی جدھر بجاور
نے دوربین سے رائفل بردار لوگ آتے دیکھے تھے۔

ناہموار راستے پر کچھ دیر چلنے کے بعد لینڈ روور نے ایک
خطرناک موڑ کاٹا اور تھوڑی سی چڑھائی چڑھ کر نسبتاً ایک
ہموار جگہ پہنچ گئی۔ یہاں پہنچ کر لالہ نے گاڑی روک دی اور
بجاور کے ہاتھ سے دوربین لے کر چاروں طرف دیکھنے لگا
پھر ایک سمت مسلسل دیکھتے رہنے کے بعد بجاور سے کچھ
کہا جس پر وہ دونوں ہنسنے لگے۔

بعد میں پتہ چلا کہ نزدیکی آبادی سے روزمرہ کے استعمال
کی اشیا لے کر کسی قبیلے کے چار افراد اپنے ٹھکانے پر واپس
ہو رہے تھے۔ اس علاقے میں یہ دستور تھا کہ جب سفر پر
جاتے تو دو چار میل چلنے کے بعد ایک فائر ضرور کر دیتے تاکہ
کوئی انہیں لوٹنے کا ارادہ کرے تو انہیں ہر طرح سے مسلح
دیکھ کر اپنا ارادہ ترک کر دے۔

مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کہ ان لوگوں کا یہ دستور پہلے سے
معلوم رہا ہوگا، پھر پہلے فائر پر یہ بدحواس کیوں ہو گئے
تھے؟ میں سوچنے لگی دال میں کچھ کالا ضرور ہے مگر میری سمجھ
میں کچھ نہ آیا۔ رقم پہلے سے ہی بجاور کے قبضے میں تھی وہ ہی
ایک ایسی چیز تھی جسے لوٹنے کے لیے وہ لوگ میرے ساتھ
کوئی اقدام کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ کیا بات ہو سکتی ہے
میں گہرے غور و فکر میں ڈوب گئی۔

لالہ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور دوبارہ اسی مقام پر لے
آیا جہاں سے مڑ کر ہم اوپر پہنچے تھے۔ وہ اس چٹان کے قریب
رکے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک کوئی
خاص بات نہیں ہوئی۔ وہ دونوں بھی خاموش تھے جیسے کسی
گہری سوچ میں ہوں۔ میں نے خاموشی کو توڑا۔

"اب ہمارا کتنا سفر اور باقی ہے مسٹر بجاور؟"

"تقریباً چار گھنٹے کا۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے
کہا: "چھ بجے تک ہم اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ جائیں گے۔"

مجھے کچھ اطمینان سا ہو گیا اور میں کل کی طرح ایک نیند
لینے کے خیال سے پھر لیٹ گئی۔ میں نے سوچا کہ سفر کے یہ
آخری گھنٹے میں سو کر گزار دوں تو انتظار کی اذیت سے بچ
جاؤں گی۔ جب سو کر اٹھوں گی تو منزل سامنے ہوگی۔

ایک گھنٹے قبل ہونے والے واقعے سے طبیعت میں
جو تکدر پیدا ہو گیا تھا وہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ میں دوبارہ
نارمل ہو کر آنکھیں بند کرنے والی تھی کہ بجاور نے لالہ سے پشتو
میں گفتگو شروع کر دی اور معمول کے خلاف لالہ نے مختصر جواب
دینے کے بجائے بجاور کے ساتھ طویل بات چیت شروع کر
دی۔ میں سوچنے لگی کہ آخر ایسی کیا نئی بات ہو گئی جو لالہ اتنی
طویل گفتگو کر رہا ہے۔ میری چھٹی حس بیدار ہونے لگی۔ میں
نے اٹھ کر بیٹھنے کا ارادہ کیا لیکن فوراً ہی ملتوی کر دیا۔ میں اپنی
حرکات و سکنات سے ایسا کوئی تاثر نہیں دینا چاہتی تھی،
جس سے وہ یہ اندازہ کر سکیں کہ میری خود اعتمادی میں کمی واقع
ہو رہی ہے۔ میں خاموش آنکھیں بند کیے لیٹی رہی جیسے مجھے
ان کی کوئی پروا نہ ہو۔

تھوڑی دور چل کر اچانک گاڑی پھر رک گئی۔ میں بدستور
آنکھیں بند کیے یہ ظاہر کرتی رہی جیسے سو رہی ہوں۔ یکایک
کئی آدمیوں کے پشتو میں باتیں کرنے کی آوازیں آنا شروع

ہو گئیں۔ اب مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے پلاسٹک کے کونے سے جھانک کر باہر نظر دوڑائی تو دیکھا ایک قریبی چٹان کے عقب سے تین رائفل بردار پٹھان آتے نظر آئے جو گاڑی کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے اور باہر کھڑے ہوئے بجّاور سے تیز آواز میں کچھ کہہ رہے تھے۔ بجّاور خاموش کھڑا ان کا جائزہ لینے میں مصروف تھا جیسے سوچ رہا ہو کہ اس نئی افتاد کا مقابلہ کس طرح کرے۔

لالہ جو اب تک خاموش اپنی نشست پر بیٹھا تھا ان لوگوں کو قریب آتے دیکھ کر نیچے اتر گیا اور گھوم کر بجّاور کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ آنے والے تینوں افراد نے بجّاور اور لالہ سے نہ ہاتھ ملائے نہ اپنے دستور کے مطابق معانقہ کیا۔ ان لوگوں نے آتے ہی ان دونوں سے جیسے کچھ مطالبہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں اپنی جگہ سہم گئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اگر فائرنگ شروع ہو گئی تو میں کیا کروں گی۔ آس پاس کا تمام علاقہ میرے لیے قطعی غیر محفوظ تھا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں بظاہر بالکل ویرانی تھی، سنّاٹا تھا لیکن کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مہیب چٹانوں اور خوفناک غاروں میں آدمی چھپے بیٹھے ہوں جو اچانک ہی سامنے آ جائیں گے۔ میں نے اپنی جگہ سے باہر نکلنا مناسب نہیں سمجھا اور کوشش کی کہ وہ لوگ مجھے نہ دیکھ سکیں۔ میں برابر باہر جھانک کر صورتِ حال پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

اچانک آنے والے تین آدمیوں نے اپنی رائفلیں سیدھی کر لیں اور بجّاور اور لالہ کو کور کر کے انہیں ایک طرف چلنے کی ہدایت کی۔ بجّاور انہیں خشمگیں نظروں سے تکتے ہوئے اسی طرف چلنے لگا جدھر سے وہ تینوں آئے تھے۔ لالہ بجّاور کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ کوئی بیس قدم چل کر وہ پانچوں ایک سمت مڑ گئے اور ایک بڑی چٹان کی وجہ سے میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اب میں اس خوفناک ویرانے میں تنہا رہ گئی تھی۔ میں نے تھوڑی دیر نئی صورتِ حال پر غور کیا اور فیصلہ کیا کہ مجھے ان کا انتظار کرنا چاہیے۔

سورج غروب ہونے میں بھی ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ ہو سکتا ہے ان لوگوں کا کوئی قبائلی مسئلہ ہو جسے طے کر کے بجّاور اور لالہ جلد ہی واپس آ جائیں۔ میں نے اپنے دل میں شکر کیا کہ میں ان لوگوں کے سامنے نہ آئی ورنہ وہ مجھے بھی ان دونوں کے ساتھ لے جاتے اور مجھے تو شاید مالِ غنیمت سمجھتے۔ چند لمحوں بعد میں نے گاڑی سے اتر کر کہیں قریبی چٹان کے پیچھے چھپ کر بیٹھنے کا فیصلہ کیا تاکہ گاڑی پر بھی نظر رکھ سکوں اور آس پاس کی صورتِ حال کا بھی جائزہ لیتی رہوں۔

میں نے جلدی جلدی اپنا ضروری سامان سمیٹا، خشک راشن کے چند ڈبے بھی اپنے بیگ میں ڈال لیے اور پورے ہوش و حواس میں رہ کر آئندہ پیش آنے والی متوقع صورتِ حال کے مطابق اپنی ضروریات پر غور کیا اور احتیاط کے ساتھ عقبی دروازہ کھول کر گاڑی سے نیچے اتر آئی۔ میں نے قریب ہی ایک ایسی جگہ ڈھونڈلی جو تین طرف سے بند تھی اور سامنے بھی ایک چٹان کی آڑ موجود تھی جس کی اوٹ سے گاڑی پر نظر رکھی جا سکتی تھی۔ میں اس کھوہ میں اتر گئی جو بہت زیادہ گہری نہیں تھی اور جس راستے پر ہم سفر کر رہے تھے اس کے بالکل کنارے واقع تھی۔

میں نے اپنے بیٹھنے کے لیے جگہ صاف کی اور چھپ کر بیٹھ گئی۔ بیٹھے بیٹھے میں سوچنے لگی کہ گاڑی چلانا تو میں جانتی ہوں لیکن راستے کا علم نہیں ہے جاؤں گی کہاں؟ اگر میں گاڑی لے کر ادھر ادھر بھٹکوں گی تو بہت جلد حریص نظریں میرے تعاقب میں لگ جائیں گی۔ اگر میں پیدل چل پڑتی ہوں تو ممکن ہے کہ کسی قریبی آبادی تک پہنچ جاؤں جہاں گزشتہ رات کے پڑاؤ کی طرح گھروں میں عورتیں بھی ہوں۔ وہاں سے مدد لے کر خیال خان کے گاؤں تک پہنچ جاؤں جو بقول بجّاور کے صرف تین چار گھنٹوں کی مسافت پر ہے۔ خیال خان مجھ سے واقف ہے اور اس کا شاید لنڈی وغیرہ سے رابطہ بھی ہے۔ وہ اس صورتِ حال سے ان لوگوں کو مطلع کر سکتا ہے اور میری حفاظت بھی کر سکتا ہے۔ اسی ادھیڑبن میں کئی گھنٹے گزر گئے۔ بجّاور اور لالہ کی کوئی خبر نہیں تھی۔ گاڑی بھی اپنی جگہ کھڑی تھی، کوئی غیر متعلق شخص بھی گاڑی تک نہیں آیا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا میری پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس پریشانی کے عالم میں مجھے اپنے والدین اور جم بڑی طرح یاد آنے لگے تھے۔ مجھے جم کے مشورے یاد آ رہے تھے۔ اس کا خیال سو فیصد درست نکلا تھا کہ میں بے رحم جرائم پیشہ افراد کا آلۂ کار بن گئی ہوں۔ اس گروہ میں اطالوی بھی تھے، بھارتی بھی، افغان اور جاپانی بھی، اور اب میں ڈچ اور یہ پاکستانی بھی شامل ہو گئے تھے۔ معلوم نہیں اور کون کون لوگ اس گروہ میں ہوں گے۔ پھر ہر ملک میں ان کے بااثر پشت پناہ بھی ہوں

گے جن کے بل بوتے پر یہ لوگ دنیا بھر میں اپنی مذموم سرگرمیوں کا جال بچھائے ہوئے ہیں۔

تقریباً پانچ بجے ہوں گے جب میں نے اپنی کمین گاہ سے نکل کر خود اپنے طور پر جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں سورج غروب ہونے سے پہلے کسی انسانی آبادی تک پہنچنا چاہتی تھی تاکہ رات محفوظ طریقے سے گزار سکوں اور مدد حاصل کر کے اپنا موجودہ سفر دوبارہ جاری رکھ سکوں۔ یہ سوچ کر میں نے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنا بیگ، دوربین جو گاڑی سے اٹھا لائی تھی اپنے دونوں کندھوں پر لٹکائے اور ایک سمت کا تعین کر کے چل کھڑی ہوئی۔ پہاڑی علاقوں میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ آبادیاں چھپی ہوئی ہوتی ہیں، اور اچانک سامنے آجاتی ہیں۔ اس لیے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ مجھے دور سے کسی آبادی کا نشان نظر آجاتے گا۔ میں نے محض اپنے وجدان کے سہارے ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔ جس طرف میں جا رہی تھی ادھر پہاڑیاں تو تھیں لیکن بہت بلند نہیں تھیں۔ تھوڑی سی جدوجہد سے انہیں عبور کیا جاسکتا تھا۔ ایک پہاڑی کے دامن میں ایک پہاڑی نالہ بھی بہہ رہا تھا جس میں شفاف پانی شور کرتا ہوا گزر رہا تھا۔ میں جب اس نالے پر پہنچی تو دن بھر کی کسل مندی نے مجھے غسل کرنے پر اکسایا لیکن اس نالے کے کنارے کہیں کوئی ایسی آڑ نہیں تھی جہاں میں غسل کر سکتی۔ اس لیے باوجود شدید خواہش کے میں نے صرف منہ ہاتھ دھو کر خود کو تروتازہ کر لیا اور پھر اللہ کا نام لے کر چل پڑی۔ میں ان پہاڑیوں کی چوٹی تک پہنچ کر دوربین سے چاروں طرف آبادی تلاش کرتی رہی لیکن مجھے مایوسی ہوئی۔ اب میں نے نسبتاً ایک زیادہ بلند پہاڑی پر چڑھ کر اردگرد کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ میں جلد از جلد کسی پڑاؤ تک پہنچنا چاہتی تھی۔ جوں جوں سورج مغرب کی سمت جھک رہا تھا میری گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔

سخت محنت کے بعد میں ایک بلند پہاڑی کی چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ میں اپنی خوشی الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی جو مجھے اس کامیاب کوہ پیمائی سے حاصل ہوئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے ایورسٹ کی چوٹی فتح کر لی ہو۔ اتنی بلندی پر پہنچنے کے بعد میں نے دوربین سے جب گاڑی کی سمت دیکھا تو مجھے وہاں آدمیوں کی چہل پہل نظر آئی۔ اب جو میں نے غور کیا اور دل جمعی کے ساتھ دیکھا تو مجھے بختاور، لالا اور وہی تین رائفل بردار نظر آئے جو گاڑی کے چاروں طرف کچھ تلاش کر رہے تھے۔ وہ لوگ یقیناً مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔ میں کانپ کر رہ گئی۔ اگر میں ان کے ہتھے چڑھ جاتی تو نامعلوم میرا کیا حشر ہوتا۔ میں نے بڑی تیزی کے ساتھ چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ کہیں بہت دور ایک سمت مجھے ایک پہاڑی کے عقب سے دھواں اٹھنے کے آثار نظر آئے۔ میں نے دوربین ہٹا کر جب اس مقام کا جائزہ لیا تو وہ جگہ مجھے کم از کم ایک میل دور نظر آئی لیکن دشوار گزار ہونے کی وجہ سے میں وہاں سورج ڈوبنے سے پہلے نہیں پہنچ سکتی تھی۔ مجھے یہ محسوس کر کے اطمینان ہوا کہ میری متوقع پناہ گاہ اس سمت سے قطعی مخالف سمت میں ہے جس طرف بختاور وغیرہ کو رائفل کی نوک پر زبردستی لے جایا گیا تھا۔ گویا یہ دو بستیاں ہیں جو ایک دوسری کے مخالف سمت میں واقع ہیں۔ چلتے چلتے میں نے پھر گاڑی کی طرف دیکھا تو پانچ افراد گاڑی میں سوار ہو کر چل پڑے تھے۔

اب گویا میری کشتیاں جل چکی تھیں اور جو کچھ کرنا تھا مجھے ہی کرنا تھا۔

اونچے نیچے سنگلاخ راستوں پر چلتی ہوئی میں ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی پر چڑھتی اترتی رہی۔ میں بار بار دوربین سے اس پہاڑی کو دیکھ لیتی جس کے عقب میں مجھے انسانی آبادی کے آثار محسوس ہوئے تھے۔ میں بعض مقامات پر بہت گھوم کے راستہ طے کر رہی تھی لیکن میں نے اس پہاڑی کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔

ابھی میں نے اپنے حساب سے آدھا راستہ ہی طے کیا ہو گا کہ ایک چٹان کے عقب سے مجھے کسی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے گھبرا کر فوراً اپنی سمت بدل دی اور خود کو ایک اوٹ میں چھپا لیا۔ چند منٹوں بعد میں نے دیکھا کہ میں جس راستے پر جا رہی تھی، وہیں ایک بڑی چٹان کے پیچھے سے دو رائفل بردار برآمد ہوئے اور آگے بڑھتے چلے گئے۔ میں ایک جانب چھپی انہیں جاتے دیکھتی رہی اور شکر کرتی رہی کہ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا اور میں بروقت ہوشیار ہو گئی۔ میں کسی آبادی میں پہنچنے سے پہلے کسی کی نظر میں نہیں آنا چاہتی تھی۔

تفتیشی افسر کا نوٹ:-
مس جین مُلر نے مجھے اپنے پیروں پر مندمل زخموں کے وہ نشانات دکھائے ہیں جو بقول اس کے مذکورہ پہاڑی سفر کے دوران آئے تھے۔ اس کے تلووں پر بھی چھالوں کے نشانات موجود تھے۔ (انسپکٹر)

جب کسی کی جان پر بن جائے تو کتنا ہی کمزور انسان کیوں نہ ہو، اس میں نہ جانے کہاں سے اتنی قوت آجاتی ہے کہ وہ بڑے سے بڑے مصائب کو روند ڈالتا ہے۔ قدرت نے میرے اندر بھی اس وقت کچھ اتنی ہی طاقت، اعتماد اور عزم پیدا کر دیا تھا جس کے سہارے میں سورج غروب ہونے کے تھوڑی دیر بعد اپنی مطلوبہ بستی میں داخل ہو گئی۔ یہ بھی بالکل ویسی ہی آبادی تھی جیسی میں نے گزشتہ دو دنوں میں راستے میں دیکھی تھیں۔ بے ترتیب بنے ہوتے پتھریلے گھر اور درمیان میں ایک کشادہ احاطہ جس میں بنا ہوا ایک بڑا ہال کمرہ جسے یہ لوگ حجرہ کہتے تھے۔

آبادی میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا کہ یہاں کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ دور فاصلے پر مجھے بہت سے لوگوں کی چہل پہل نظر آ رہی تھی لیکن ابھی تک مجھ پر کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ میں نے تھوڑی دیر ٹھہر کر حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے میں کوئی خاص بات محسوس نہ کر سکی۔ پھر میں نے بہادری کے ساتھ آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور سیدھی حجرے پر پہنچی۔ بڑے کمرے کے اندر سے تیز تیز آوازیں آ رہی تھیں جیسے کوئی بحث ہو رہی ہو۔ ابھی میں متذبذب سی احاطے میں کھڑی تھی کہ چند لوگوں نے مجھے دیکھ لیا اور وہ دوڑتے ہوتے میری طرف آئے۔ انہوں نے آتے ہی مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا اور تقریباً گھسیٹتے ہوتے بڑے کمرے کی جانب لے چلے۔

اندر ایک قیمتی قالین پر دروازے کے بالکل سامنے خیال خان بیٹھا تھا اور اس کے سامنے بختاور اور لالہ سہمے ہوتے دو زانو بیٹھے تھے جبکہ فرش پر چاروں طرف کم از کم تیس آدمی اور بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی.... خیال خان، بختاور اور لالہ پشتو میں ایک خوشی کا نعرہ لگا کر کھڑے ہو گئے اور مجھے پکڑ کر لے جانے والوں سے کوئی سوال کیا جس کا انہوں نے مختصر سا جواب دیا۔ پھر خیال خان نے انگریزی میں مجھے خوش آمدید کہا اور میرے بیٹھنے کے لیے اپنی جگہ خالی کر دی۔ بختاور نے مجھے حیرت سے دیکھ کر پوچھا: "تم کہاں چلی گئی تھیں؟" میں جو اب تک اپنے ہوش و حواس میں رہی تھی اس اچانک صورتحال سے تھرا اٹھی۔ میں سوچنے لگی کہ یقیناً میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ شاید میں کہیں راستے میں بے ہوش پڑی ہوں اور خواب میں وہی کچھ دیکھ رہی ہوں جو میں چاہتی تھی لیکن میری گم صم کیفیت بہت جلد ختم ہو گئی۔

میرے وہاں پہنچنے پر ماحول یکایک ایسا رنگ اختیار کر گیا تھا جیسے صرف میں ہی نہیں بلکہ وہاں موجود ہر شخص شدید حیرت کی لپیٹ میں آ گیا ہو۔ بہرحال تھوڑی دیر بعد جب سب کے حواس کچھ درست ہوئے تو پتہ چلا کہ ایک غلط فہمی کی بنا پر حالات نے اتنا سنگین رخ اختیار کر لیا تھا۔

بختاور اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آ کر بیٹھ گیا اور مجھے بتانے لگا۔

"مس مُلر! تم رحمت کا فرشتہ بن کر یہاں پہنچی ہو۔ اگر اور تھوڑی دیر تم نہ آتیں تو معلوم نہیں یہاں کیا کچھ ہو جاتا۔ دراصل اس علاقے میں خیال خان کی فیکٹری ہے جس کی حفاظت کے لیے خان صاحب نے خصوصی انتظامات کر رکھے ہیں۔ تمہیں یاد ہوگا جس مقام پر ہمیں روکا گیا تھا اس سے چند میل پہلے لالہ اور میرے درمیان تھوڑی سی بحث ہوئی تھی۔ دراصل میں نے لالہ سے یہ کہا تھا کہ اب جبکہ ہم اپنی منزل سے قریب پہنچ چکے ہیں ہمیں چاہیے کہ لینڈ روور میں رکھا ہوا سرخ فلیگ گاڑی کے ہُڈ پر لگا دیں تاکہ آس پاس پہاڑوں میں چھپے ہوتے حفاظتی عملے کے لوگ دور سے ہی ہمیں پہچان جائیں اور ہمیں صحیح راستے تک پہنچنے میں مدد دیں لیکن لالہ نے میری بات سے اتفاق نہیں کیا اور کہنے لگا کہ ابھی سرحد کافی دور ہے اور اتنا پہلے سے فلیگ لگایا گیا تو پاکستانی قبائلی علاقے کے لوگ جو اس فیکٹری کے سخت خلاف اور اس کے مالک کے جانی دشمن ہیں ہمیں پکڑ لیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ جب تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ منزل ابھی اور کتنی دور ہے تو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ چار گھنٹے کا سفر اور ہے۔ یہ بات میں نے لالہ کے خیال کے مطابق بتائی

تھی۔ لالہ کا بیان ہے کہ وہ بھی اپنی جگہ صحیح تھا۔ وہ جس
راستے پر چلا آ رہا تھا وہ اس کا سیکڑوں بار کا دیکھا بھالا
تھا اور اسے اپنے سفر اور راستے کا صحیح اندازہ تھا۔ لیکن
صرف ایک مقام پر اس نے ایک بڑے سے پہاڑ کے گرد
گھوم کر آگے بڑھنے کے بجائے اس کے درمیانی دشوار گزار
راستے پر گاڑی ڈال دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم عین اس
مقام پر جا نکلے جہاں خیال خاں کے حفاظتی دستے نے اپنی
کمانڈ پوسٹ بنائی ہوئی ہے اور اس محفوظ ترین مقام
کے قریب سے کسی گاڑی کے گزرنے کا تصور بھی نہیں کیا
جا سکتا۔ اس پگڈنڈی سے صرف خچروں اور اونٹوں کے
قافلے ہی گزرتے رہتے ہیں جو عام طور سے بے ضرر ہوتے
ہیں۔ جب ہم لوگ اس مقام پر پہنچے تو ہمیں روک لیا
گیا۔ تم چونکہ گاڑی کے اندر چھپی بیٹھی تھیں اس لیے تم
پر کسی کی نظر نہیں پڑی۔ کاش وہ لوگ تمہیں دیکھ لیتے
تو اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ ان لوگوں میں سے ہر ایک کو
یہ بات معلوم تھی کہ ایک یورپین لڑکی خیال خاں کی
مہمان بن کر آنے والی ہے جو ان راستوں سے گزرے گی۔
اس مہمان کو یعنی تمہیں ہر قسم کی سہولت بہم پہنچانا ان
لوگوں کے فرائض میں شامل تھا۔ میں نے فوری طور پر
ان لوگوں کو یہ بات نہیں بتائی کہ ہمارے ساتھ تم سفر
کر رہی ہو۔ تمام راستے میں اور لالہ خاموش ان گارڈز
کے ساتھ چلتے گئے۔ یہاں تک کہ ان کی کمانڈ پوسٹ پر
پہنچ گئے جو ایک گہرے غار میں بنی ہوئی ہے۔ اس
پوسٹ کا کمانڈر اندر آرام دہ قالین کے بستر پر سویا ہوا
تھا چنانچہ ہمیں زبردست پہرے میں باہر بٹھا دیا گیا۔ ہم
سے کوئی شخص بات نہیں کر رہا تھا اور نہ ہی کوئی ہماری
بات سننے کے لیے تیار تھا۔ میں جب بھی ان محافظوں
سے کچھ کہنے کی کوشش کرتا تو مجھے یہ کہہ کر خاموش
کر دیا جاتا کہ کمانڈر سے کہنا وہی تمہاری بات سنے گا
اور فیصلہ کرے گا۔ میں خاموش ہو کر انتظار کرنے لگا اور
لالہ نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا کہ محافظ بالکل وحشی ہیں
ان سے کوئی بات کرنا پتھروں سے سر پھوڑنا ہے۔
چار گھنٹے بعد کہیں جا کر کمانڈر صاحب برآمد ہوئے
ہم دونوں پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور بغیر کچھ کہے
قریبی چشمے پر غسل کرنے چلے گئے۔ وہاں سے فارغ ہو کر
انھوں نے اپنی عدالت لگائی۔ میں نے کمانڈر کو بتایا
کہ میں خیال خاں کا مہمان ہوں اور اس نے اپنے کسی کام
سے مجھے طلب کیا ہے۔ میرے بیان کی روشنی میں اس
نے مجھ سے بے شمار سوال کیے۔ میں خیال خاں کو کیسے جانتا
ہوں؟ اس کا پیغام میرے پاس کس طرح پہنچا؟ میں کیا
کام کرتا ہوں؟ جس گاڑی میں سفر کر رہا ہوں اس کا مالک
کون ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن تمام عرصے میں تمہارا کوئی
ذکر نہیں ہوا۔ میں خود بھی ڈر رہا تھا کہ اگر ان لوگوں کو
یہ معلوم ہو گیا کہ گاڑی میں ایک نوجوان اور خوبصورت
لڑکی بھی سفر کر رہی ہے تو نا معلوم ان کا رد عمل کیا ہو۔
لیکن میرے جوابات سے کمانڈر مطمئن نہیں ہوا اور اپنے
آدمیوں سے کہا کہ میری گاڑی سے نشان والا بیگ
ڈھونڈ کر لائیں۔ اس موقع پر میں نے کمانڈر سے کہا کہ
در اصل گاڑی میں خیال خاں کی ایک مہمان اور بھی ہے
اور پھر میں نے تمہارا ذکر کیا۔ تمہارا ذکر سن کر کمانڈر ایکدم
کھڑا ہو گیا اور مجھے گالی دے کر کہنے لگا۔ میں نے پہلے
اسے یہ بات کیوں نہیں بتائی؟ اور پھر ان لوگوں سے
مخاطب ہوا جو مجھے لے کر آئے تھے کہ آخر تمہیں وہ
گاڑی میں کیوں چھوڑ کر آئے۔ کمانڈر کی جواب طلبی پر
ان لوگوں نے مجھے جھوٹا قرار دیا اور کہنے لگے گاڑی
میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ بات
کی تصدیق کے لیے کمانڈر اپنے آدمیوں کے ساتھ ہماری
گاڑی تک آیا۔ مجھے اطمینان تھا کہ تم گاڑی میں بیٹھی
مل جاؤ گی تو سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"
"جب تم لوگ گاڑی کی تلاشی لے رہے تھے تو
میں قریب ہی ایک جگہ چھپی ہوئی — تم لوگوں کو
دیکھ رہی تھی اور جب تم لوگ واپس چلے گئے تو میں
نے خطرہ محسوس کیا اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں
آس پاس کسی آبادی کی تلاش میں تھی کہ بہت دور
مجھے اس جگہ سے دھواں اٹھتا ہوا نظر آیا اور میں گرتی
پڑتی یہاں پہنچ گئی۔" میں نے بختاور کی بات کاٹ کر کہا۔
بختاور نے دوبارہ اپنی بات شروع کی: "تم وہاں
نہیں ملیں تو کمانڈر شش و پنج میں پڑ گیا۔ در اصل کسی مشتبہ
شخص کو ان جگہوں پر گھومتے ہوئے اگر پکڑ لیا جائے
اور کمانڈر کو یقین ہو جائے کہ وہ شخص پاکستان یا
افغان حکومت کا کوئی جاسوس ہے جو فیکٹری کے
محل وقوع وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی
فکر میں ہے تو اسے گولی مار کر ہزاروں فٹ گہرے کھڈ
میں پھینک دیا جاتا ہے۔ بصورتِ دیگر اسے خیال خاں

کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے جو خود اس کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے۔ اکثر معصوم مسافر بھی ان راستوں سے گزرتے ہیں، جنہیں خبر ہی نہیں ہوتی کہ وہ کسی خطرناک راستے پر سفر کرتے ہوئے آنکلے ہیں۔ ان علاقوں کے رہنے والے تو سب ہی اس جگہ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ لوگ کبھی ادھر کا رُخ ہی نہیں کرتے۔ یہ تمام پہاڑی علاقہ پاکستان اور افغانستان کی سرحد ہے جو کسی کی بھی ملکیت نہیں۔ یہاں رہنے والے قبائل ہر قانون سے بالا آزاد فضا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے اپنے قوانین اور رسم و رواج ہیں اور ان میں جو قبیلہ زیادہ طاقتور ہو، جس کے پاس اسلحہ کی تعداد زیادہ ہو وہی اس سرحدی علاقے کا اصل حکمراں ہوتا ہے۔ بہرحال میری یہ بات سن کر کہ میرے ساتھ ایک یورپین لڑکی بھی سفر کر رہی تھی جو گاڑی کے اندرونی حصے میں چھپی ہوئی تھی اور اب ڈر کر کہیں غائب ہو گئی ہے، کمانڈر نے از خود کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے مجھے اور سالار کو خیال خان کے پاس روانہ کرنا مناسب سمجھا چنانچہ ہم دونوں یہاں ملن چھپنے سے کئی گھنٹے پہلے پہنچ چکے ہیں۔ ہماری گاڑی ابھی تک کمانڈر کے قبضے میں ہے۔ اب یہاں یہ مسئلہ درپیش تھا کہ واقعی ہمارے ساتھ تم بھی تھیں یا نہیں۔ خیال خان نے مجھ سے کئی بار سوال کیا تھا کہ اس جاپانی نے پیچھے کہیں تمہیں غائب تو نہیں کر دیا ہے اور مجھے سکھا پڑھا کر بھیج دیا ہے۔ اس کے علاوہ اور نامعلوم کیا کیا شکوک ان لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر آج رات تم یہاں نہ پہنچتیں تو ہم دونوں کا حشر بہت خراب ہوتا۔
جتنی [illegible] بتا رہا مجھے حالات بتاتا رہا خیال خان خاموش بیٹھا مسکر[illegible] انگریزی جانتا تھا۔ کابل میں میری اس سے ملاقات [illegible] ہو چکی تھی اور ہم دونوں کے مابین بڑی خوش اسلوبی سے سارا معاملہ انجام تک پہنچا تھا۔ لہٰذا اس کے دل میں میری بڑی قدر تھی۔ پھر اسے یہ بھی خیال تھا کہ میرے مالکان کو بھی مجھ پر کلی اعتماد ہے۔ اسی وجہ سے وہ اتنی بڑی رقم کی [illegible] پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔
تھوڑی دیر بعد پٹھانوں کی مخصوص روایات کے مطابق فرش پر دستر خوان بچھا دیا گیا اور دو بھنی ہوئی سالم بھیڑیں جن میں چاول بھرے ہوئے تھے، لا کر دستر خوان پر رکھ دی گئیں۔ کمرے میں موجود تمام افراد ہاتھ دھو کر دستر خوان کے گرد بیٹھ گئے۔ سب کے سامنے پلیٹیں رکھی تھیں جن میں انہوں نے چاول اور گوشت اپنے اپنے لیے نکال لیے اور بے تکلفی سے ہاتھوں سے کھانے لگے۔ میرے لیے چھری کانٹے کا کوئی اہتمام ممکن نہیں تھا چنانچہ میں نے بھی کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کی تقلید کی اور اپنا پیٹ بھرا۔ کھانے کے دوران تقریباً خاموشی رہی۔ کبھی کبھار خیال خان پشتو میں اپنے کسی ساتھی سے کچھ کہتا اور کنکھیوں سے مجھے بھی دیکھتا جاتا۔ سجاد اور خاں سر جھکائے کھانے میں مصروف تھا اور لالہ بھی ایک کونے میں اپنی پلیٹ ہاتھوں میں اونچی اٹھائے کھانے میں مشغول تھا۔ ان دونوں کے چہروں پر بلا کا اطمینان تھا جو موت کے منہ میں جانے سے بچ جانے کے نتیجے میں قدرتی طور پر ظاہر ہو رہا تھا۔
کھانے سے فارغ ہو کر سیاہ قہوے کا دور چلا پھر پٹھانوں نے تمباکو نوشی کا سلسلہ شروع کیا تو پورا کمرہ دھوئیں سے بھر گیا اور مجھے اپنی سانس گھٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ خیال خان کو میری تکلیف کا احساس ہو گیا اس نے اپنے ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ مجھے کسی گھر میں لے جائے جہاں خواتین موجود ہوں۔ میں دن بھر کی تھکن اور پریشانی سے چور ہو رہی تھی اور کھانے کے بعد واقعی میری دلی خواہش تھی کہ اب میں پاؤں پھیلا کر سو جاؤں۔
مجھے ایک قریبی مکان میں پہنچا دیا گیا جہاں تین عورتیں موجود تھیں۔ یہ بھی بالکل ویسی ہی تھیں جیسی میں نے اس سے پہلے دیکھی تھیں۔ ان میں ایک عورت معمر تھی جو غالباً گھر کی مالک تھی۔ بقیہ دو میں سے ایک شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں تھی جبکہ تیسری بمشکل سولہ سترہ سال کی لڑکی تھی۔ وہ بہت چنچل اور خوبصورت تھی۔ اس نے بڑی دلچسپی سے میرا سر سے پیر تک جائزہ لیا۔ میرے لباس میرے پرس، میرے بالوں اور بالوں میں لگی ہوئی پنوں کو بار بار غور سے دیکھا اور اپنی زبان میں مجھ سے کچھ کہنے لگی جسے میں بالکل نہ سمجھ سکی۔ میں نے مسکرا مسکرا کر اشاروں میں اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ معصوم ہرنی کی طرح اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھتی رہی۔
اس لڑکی نے میرے آرام کا بڑا خیال رکھا۔ وہ خود بھی میرے برابر دوسرے پلنگ پر سوئی۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ سونے سے قبل وہ مجھ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن زبان کا مسئلہ ہم دونوں کے درمیان دیوار بن گیا تھا۔ میں جس کمرے میں شب بسری کے لیے لائی گئی تھی وہاں ایک کونے میں میں نے دیکھا کہ سفید سیلوفن کی تھیلیاں رکھی تھیں جن میں سیال حشیش بھر کر میں

سے جا چکی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس گھر میں کوئی ایسا شخص رہتا ہے جس کا تعلق خیال خان کی فیکٹری سے ہے۔ رات کے گہرے سناٹے میں، میں نے کوشش کی کہ مجھے کوئی ایسی آواز سنائی دے جس سے میں فیکٹری کی سمت کا اندازہ لگا سکوں لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔

میں صبح اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہوئی اور ان تینوں عورتوں کے ساتھ دودھ، مکھن اور انڈوں سے ناشتہ کیا۔ انہوں نے بطور خاص میرے لیے قہوہ بھی تیار کیا۔ وہ خود صبح کے وقت قہوہ یا چائے پینے کی عادی نہیں تھیں۔ لیکن انہیں معلوم تھا کہ ہم یورپین لوگ ناشتے میں چائے یا کافی ضرور پیتے ہیں۔ بڑی بڑی جو کے آٹے کی روٹیاں بھی میرے سامنے رکھی گئیں لیکن میں انہیں نہ کھا سکی۔ ان عورتوں نے البتہ بڑے اطمینان سے وہ روٹیاں کھائیں اور بار بار مجھے بھی اکساتی رہیں۔ ناشتے سے فراغت پاتے ہی میں نے اشارے سے باہر... جانے کے لیے کہا۔ معمر عورت میرا مطلب سمجھ گئی لیکن اس نے مجھے باہر جانے سے روک دیا اور اشارے سے بتایا کہ تھوڑی دیر انتظار کرو۔ وہ لوگ خود مجھے بلا کر لے جائیں گے۔ میں چونکہ بالکل تیار ہو چکی تھی اور اب باہر نکل کر خیال خان سے معاملے کی بات کر کے جلد از جلد اس جگہ سے واپس ہو جانے کی متمنی تھی۔ اس لیے یہ تھوڑا سا انتظار بھی مجھے کچھ اچھا معلوم نہیں ہوا۔ میں گھر کے کچے صحن میں ٹہلتی رہی۔ پھر اکتا کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ مجھے اپنے چاروں طرف کوئی ایسی چیز نظر نہیں آ رہی تھی جو میری دلچسپی کا باعث ہو سکتی اور میرا وقت گزر سکتا۔ وہ بھولی بھالی نوجوان لڑکی ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ مگر میں اس سے بھی کوئی بات نہیں کر سکتی تھی کیونکہ زبان کا مسئلہ آڑے آ رہا تھا۔

خلاف توقع دس بجے کے قریب مجھے مکان کے دروازے پر کار کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ میں چونک کر کھڑی ہو گئی۔ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ جواب میں معمر عورت دروازے پر گئی اور پشتو میں کچھ پوچھ کر پلٹ کر مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے خالص مشرقی انداز میں ہاتھ پیشانی تک لے جا کر ان لوگوں کو سلام کیا۔ جواب میں معمر عورت نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا جبکہ بقیہ دونوں نے اپنی زبان میں نامعلوم الفاظ کہے اور میں گھر سے باہر آ گئی۔

باہر ایک جیپ کھڑی تھی جس میں بجاور کے ساتھ دو افراد اور بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک ڈرائیور تھا لیکن وہ لالا نہیں تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر بجاور خان نیچے اترا اور مجھے پچھلے دروازے سے جیپ کے پچھلے حصے میں بیٹھنے کو کہا اور میرے بیٹھتے ہی جیپ اسٹارٹ ہو گئی۔ بجاور نے مجھ سے پوچھا۔ "مس تھرا! رات کیسی گزری؟"

"بہت آرام سے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ لوگ بہت اچھے ہیں۔ خصوصاً آپ کی خواتین بہت سیدھی سادی اور مخلص ہیں۔ میری آسائش اور آرام کے لیے ان لوگوں نے بڑی تکلیف اٹھائی۔ میں ان کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔ میں ان کی محبت کا جواب آخر کس طرح دوں؟"

بجاور نے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔ "ہم پٹھانوں کی کچھ روایات ہیں جن کی ہم سب سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ ہر پٹھان گھرانہ اس بیابان میں کسی اجنبی کو مہمان بنا کر بہت خوش ہوتا ہے۔ مہمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ ایثار کرنا ہم لوگوں کی روایت ہے جس کا اگر معاوضہ دینے کی کوشش کی جائے تو ہم لوگ اسے اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ لہٰذا مس تھرا آئندہ یہ خیال بھی اپنے دل میں نہ لانا۔ ایک پٹھان کی میزبانی کا معاوضہ صرف یہی ہوتا ہے کہ اس کی تواضع کو قبول کر لیا جائے۔"

"بہرحال میں تم سب کی شکرگزار ہوں۔" میں نے بڑے خلوص سے کہا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے بجاور سے سوال کیا۔ "اب کیا پروگرام ہے؟"

"اب ہم لوگ خیال خان کے گاؤں چل رہے ہیں۔"

"تو گویا یہ گاؤں خیال خان کا نہیں تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ خیال خان کے چچا کا علاقہ ہے جو یہاں کے قبائل کا سردار ہے۔ خیال خان کا گاؤں یہاں سے چالیس میل دور ہے۔ اس کے گاؤں سے افغان سرحد صرف چند سو گز کے فاصلے پر ہے۔ در اصل اس کا گاؤں ایسے مقام پر واقع ہے جو پاکستان اور افغانستان کی سرحد ہے اور کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ اس گاؤں میں خیال خان کی وہ فیکٹری ہے جس کے بارے میں خود پاکستان اور افغانستان کے لوگ کچھ زیادہ نہیں جانتے لیکن یورپ اور امریکہ میں کچھ لوگ اس سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ جاپانی جسے تم اچھی طرح جانتی ہو اسی فیکٹری کی مشینیں اسمگل کر کے لایا تھا۔ اسی نے خیال خان کو رضامند کر کے فیکٹری کی تنصیب

کی اور علاقے میں افراط سے پیدا ہونے والی حشیش کو تیل کی
شکل میں بدلنے اور چرس سے ہیروئن بنا کر اسے غیر ممالک
اسمگل کرنے کا منصوبہ ترتیب دیا۔ ورنہ اس سے قبل خیال خان
حشیش اور چرس کی اسمگلنگ کا کام کرتا تھا۔ اس میں بھی
اسے خاصا منافع ہوتا تھا لیکن اب فیکٹری لگانے کے بعد
تو اس کا منافع کئی سو گنا بڑھ چکا ہے۔ اس علاقے میں بسنے
والے قبائلی جو پہلے حشیش کی کاشت کر کے بمشکل دو وقت
کی روٹی کما سکتے تھے۔ اب ان کی حالت بھی بدل گئی ہے۔
خیال خان اپنے لوگوں سے بہت معقول قیمت پر حشیش خریدتا
ہے جس سے وہ لوگ خیال خان سے بہت خوش ہیں اور
اس کے لیے ہر قسم کا کام کر گزرنے پر تیار رہتے ہیں۔ اس بار
جب تم جاؤ گی تو ہم تمہیں ہیروئن کے بھی کچھ نمونے دیں گے
بجاور راستے بھر مجھے خیال خان کے بارے میں بتاتا رہا
اور مجھے یہ بات سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ اگر میں اسی طرح
ان کی وفادار رہوں اور پوری دیانت داری کے ساتھ دھندا
کرتی رہوں تو بہت جلد لکھ پتی بن جاؤں گی۔ بجاور نے
مجھے رائے دی کہ میں کراچی یا کابل میں ایک شاندار ہوٹل
تعمیر کرا لوں اور ہالینڈ سے نقل وطن کر کے اس علاقے میں مستقل
آباد ہو جاؤں۔ خیال خان اور وہ خود میری ہر طرح مدد کریں
گے۔ بقول بجاور کچھ عرصے بعد میری افادیت ختم ہو جائے
گی کیونکہ بار بار کے سفر سے متعلقہ ملکوں کے حکام میری طرف
سے مشتبہ ہو جائیں گے اور کسی نہ کسی پھیرے میں میری
گرفتاری عمل میں آ سکتی ہے۔

اپنی گرفتاری کے متوقع خطرے سے میں لرز کر رہ گئی۔
اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگی کہ خدایا اس بار مجھے خیریت
سے وطن واپس پہنچا دے آئندہ میں کسی قیمت پر بھی اس کام
میں نہیں پڑوں گی۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے میں ایمسٹرڈم چھوڑ
کر ڈنمارک چلی جاؤں گی۔ سوئٹزرلینڈ جا بسوں گی لیکن اب
منشیات کی اسمگلنگ نہیں کروں گی۔ میں نے صدق دل سے
توبہ کی اور سوچا کہ خدا ابھی میری مجبوری دیکھ رہا ہے کہ کس طرح
ان چالاک لوگوں نے مجھے اس گھناؤنے کاروبار میں ملوث
کر دیا ہے اور اب میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے اشاروں
پر چلنے کے لیے مجبور ہوں۔

دشوار گزار راستے طے کرتی ہوئی جیپ خیال خان
کے گاؤں تقریباً بارہ بجے پہنچ گئی۔ یہ بستی بمشکل پچاس
گھروں پر مشتمل تھی جن کے درمیان سردار کا حجرہ تھا بالکل
ویسا ہی جیسا میں اب تک دیکھتی آئی تھی۔ حجرے میں
کئی لوگ ادھر ادھر بیٹھے تمباکو نوشی میں مصروف تھے۔ ہماری
جیپ کے وہاں پہنچتے ہی ان میں سے ایک شخص آگے
آیا اور بجاور سے پشتو میں بات کرنے لگا۔ بجاور اور اس
کے ساتھی جیپ سے اتر گئے جبکہ میں اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ بجاور
حجرے کے اندر چلا گیا۔ اس کا ساتھی باہر ہی کھڑا دوسرے
لوگوں سے گپ شپ میں مصروف ہو گیا۔ جیپ میں
ڈرائیور بدستور اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا اور میں پچھلی سیٹ
میں خاموش بیٹھی اس فکر میں تھی کہ کسی طرح یہاں سے جلد
از جلد فارغ ہو کر مہذب دنیا میں لوٹ جاؤں، کم از کم
کراچی ہی پہنچ جاؤں جہاں مجھے انسانوں کے درمیان رہنے
کا احساس ہو گا۔ وہاں کسی سے کوئی بات چیت تو کرنے
کے قابل ہوں گی۔ اس پہاڑی علاقے میں تو اب مجھے
وحشت ہونے لگی تھی۔ بجاور کو حجرے کے اندر گئے
کافی دیر ہو چکی تھی۔ جیپ میں بیٹھے بیٹھے مجھے سخت
اکتاہٹ ہونے لگی اور میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر
نکل آئی۔ ڈرائیور نے مجھے اترتے دیکھا تو خود بھی نیچے
آ گیا۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ میری نگرانی پر متعین ہو،
اور مجھے اپنی نظروں سے ایک لمحے کے لیے بھی اوجھل نہ
ہونے دینا چاہتا ہو۔

کم و بیش ایک گھنٹے بعد میں نے دور سے وہ...
لینڈ روور آتی دیکھی جس میں گزشتہ دنوں میں نے بجاور اور سلالہ
کے ساتھ سفر کیا تھا۔ جب وہ ہماری جیپ کے برابر آ کر
ایک جھٹکے سے رکی تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ
خیال خان کے ساتھ وہ جاپانی بھی اس میں موجود تھا جو
پہلے مجھے کابل میں اور پھر کراچی میں ملا تھا۔ میں اس کے
بارے میں سوچنے لگی کہ وہ کوئی چھلاوہ ہے جو جب اور
جہاں چاہتا ہے پہنچ جاتا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے
مسکراتے ہوئے "ہیلو" کہا۔ قریب آ کر مجھ سے ہاتھ ملایا
اور میری خیریت پوچھی۔ اس نے میرے چہرے پر تردد اور
پریشانی کی جھلک صاف محسوس کر لی اور مجھے تسلی دیتے
ہوئے کہا: "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے مس کیتھرا، تم یہاں
بہترین دوستوں کے درمیان بالکل محفوظ ہو۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا کر یوں اظہار کیا جیسے
مجھے اس کی بات پر یقین ہو اور ایمان کی بات ہے کہ اب
تک میرے ساتھ ان لوگوں کا سلوک بہت اچھا رہا تھا۔
باوجود اس کے کہ یہ لوگ جاہل تھے اور مہذب دنیا کے
طور طریق سے واقف نہیں تھے۔ اب تک میرے ساتھ

کوئی غیر شائستہ حرکت نہیں کی تھی۔ اس کے برعکس انہوں نے میرے آرام اور تحفظ کا پورا پورا خیال رکھا تھا۔ جہاں کہیں ممکن ہوا انہوں نے مجھے اپنی عورتوں کے درمیان رات گزارنے کا موقع فراہم کیا اور دن میں بھی کسی شخص نے مجھ سے بلا ضرورت بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

خیال خان کی آمد کے ساتھ ہی نجا مرزا بھی حجرے سے باہر نکل آیا۔ پھر جاپانی کے ساتھ ان دونوں نے سرگوشیوں میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔ تھوڑی دیر تک مشورہ کرنے کے بعد خیال خان میری طرف متوجہ ہوا۔ اس وقت میں جیپ کے قریب لاتعلق سی الگ کھڑی تھی۔ اس نے میری طرف آتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

"مس مری! ایک منٹ، ہم تم سے ایک مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔"

میں اس کی طرف بڑھ گئی اور سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے دس پونڈ سیال کی قیمت وصول ہو گئی ہے۔ یہ مال میں تمہیں فوری طور پر دے سکتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ زیادہ مال لے جاؤ۔ اس لیے کہ یہ ممکن ہے کہ آئندہ تمہارا یہاں آنا حفاظت کے خیال سے ممکن نہ ہو۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اس وقت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا لیا جائے۔ اس کے علاوہ میں تمہیں کچھ ہیروئن کا پاؤڈر بھی بطور نمونہ دینا چاہتا ہوں۔ یہ تمہارے مالکان کو بہت پسند آئے گا۔"

"مسٹر خان! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں دس کے بجائے بیس پونڈ بھی لے جا سکتی ہوں لیکن سوال زائد رقم کی ادائیگی کا ہے۔ تم جانتے ہو ادائیگی کے لیے میرے پرنسپلز نے کیا طریقہ اختیار کیا ہوا ہے۔ میں اس سلسلے میں کوئی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"اوہ مس مری! میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ زائد مال کی رقم تم ادا کرو۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم زیادہ سے زیادہ مال اس پھیرے میں لے جاؤ۔ رقم کی وصولی سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ یہ میرا درد سر ہے۔ میں خود وصول کر لوں گا۔"

"ٹھیک ہے تم جس قدر مال مجھے دو گے میں لے جاؤں گی لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟" خیال خان نے تشویش سے پوچھا۔

"یہ کہ مجھے جلد سے جلد فارغ کر دو۔ میں یہاں بہت گھبراہٹ محسوس کر رہی ہوں۔"

"میں تمہیں آج ہی واپس روانہ کر دوں گا بلکہ تم یقین رکھو چند گھنٹوں بعد تم کابل میں ہو گی۔"

"کابل میں؟ وہ کیوں؟"

"کراچی جانا ٹھیک نہیں ہے۔ وہاں کسٹم کا عملہ بہت چوکس ہے۔ تم کراچی سے اس علاقے کے لیے روانہ ہوئی ہو۔ یقین کرو کراچی میں اس بات کو بطورِ خاص نوٹ کر لیا ہو گا۔ جب تم کراچی جاؤ گی تو حکام تمہیں گھیر لیں گے اس لیے مناسب یہی ہے کہ تم یہاں سے کابل جاؤ جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ پھر سابقہ روٹ سے ہالینڈ پہنچ جاؤ۔"

بات میری سمجھ میں آ گئی اور پھر یہی ہوا۔۔۔ مجھے خیال خان نے ایک خوبصورت سوٹ کیس کی خفیہ تہوں میں پچیس پونڈ سیال حشیش اور ہیروئن اس طرح پیک کر دی کہ بظاہر کوئی شک پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

کابل پہنچ کر میں نے ایک معمولی ہوٹل میں قیام کیا حالانکہ میرے پاس کافی پیسے تھے۔ میں انٹر کانٹی نینٹل میں بھی قیام کر سکتی تھی لیکن خیال خان نے اس خیال کی مخالفت کی اور مجھے ایک رات کے لیے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ٹھہرا دیا۔ میں خیال خان کی بہت شکر گزار ہوں کہ وہ میرے ساتھ کابل تک خود آیا اور خود ہی اس نے اپنے نام پر ہوٹل کا کمرہ بک کرایا۔ وہ کابل میں بھی بڑے رسوخ کا مالک تھا اور میں نے محسوس کیا کہ لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔

اگلے دن خیال خان مجھے مع سوٹ کیس کے ایئرپورٹ لے گیا اور کے ایل ایم کی فلائٹ سے بخیر و خوبی مجھے میں وطن بھیج دیا۔ کابل سے روانہ ہو کر ایمسٹرڈم تک پہنچنے کے دوران میں بڑی متفکر رہی۔ پہلے سفر میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت مجھے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں اور میرے جرم کی نوعیت کتنی سنگین ہے۔ میں یہی سمجھتی رہی کہ میں اس علاقے میں پیدا ہونے والی کسی خاص بوٹی کا عرق لے کر جا رہی ہوں جسے جان بچانے والی دواؤں کی تیاری میں استعمال کیا جائے گا لیکن اس بار کیفیت مختلف تھی۔ اب میں اچھی طرح جان چکی تھی کہ میں کیا کر رہی ہوں، اور اگر پکڑی گئی تو اس کے نتائج کیا ہوں گے ایک بات کا مجھے اطمینان تھا کہ ایمسٹرڈم ایئرپورٹ

پر مائیکل سب کچھ سنبھال لے گا۔ وہ اتنا بارسوخ تھا کہ مقامی حکام کی نظروں سے میرا لایا ہوا سوٹ کیس بچا کر نکال سکتا تھا۔ اور اس نے کیا بھی یہی۔ جونہی میں طیارے سے اتری مائیکل مجھے سیڑھیوں پر ہی مل گیا۔ اس نے بڑی خوش دلی اور گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ خاموشی سے ہدایت کی کہ میں تنہا بغیر سامان لیے باہر چلی جاؤں۔ اس نے سامان کا ٹیگ مجھ سے لے لیا تاکہ میرا لایا ہوا سوٹ کیس حاصل کر سکے۔ اس طرح میری پریشانی اپنے وطن کی زمین پر قدم رکھتے ہی ختم ہو گئی۔ ایئرپورٹ کی کارروائی سے فارغ ہو کر میں اپنا پرس جھلاتی ہوئی باہر آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں مائیکل کی منتظر تھی جو ابھی تک سوٹ کیس لے کر باہر نہیں نکلا تھا۔

کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد بھی جب مائیکل نہیں آیا تو میں نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا، گھر سے اسے فون کر کے معلوم کر لوں گی۔

میں گھر پہنچی تو وہاں جم بھی موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ممی اور ڈیڈی خوشی سے اچھل پڑے۔ ڈیڈی نے مجھے سینے سے لگا لیا اور میرے خیریت سے واپس آ جانے پر خدا کا شکر ادا کرنے لگے۔ جم ٹٹولتی ہوئی نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے چہرے پر موجود تفکرات کی پرچھائیں صاف دیکھی جا سکتی تھی جسے اس نے محسوس کر لیا تھا۔

میں اپنے کمرے میں جا کر تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ میں جم کی نظروں سے بچنا چاہتی تھی سو وہ سب کچھ جان چکا تھا۔ میرے پاس بہت رقم تھی اور مزید بہت بڑی رقم مجھے ملنے والی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں خود اپنی نظروں سے گر چکی تھی۔ یہ دولت جس کی خاطر میں نے اتنے پاپڑ بیلے تھے میرے لیے سوہان روح بن چکی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں امریکی ڈالروں سے بھرا ہوا پرس آتش دان میں پھینک دوں اور اپنی کھوئی ہوئی عزت دوبارہ حاصل کر لوں۔ مگر آہ، اب یہ ممکن نہیں تھا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

تفتیشی افسر کا نوٹ:-

ملزمہ نے اپنے بیان کا مذکورہ بالا حصہ روتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں ریکارڈ کرایا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس امر میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ دل سے اس کام کو اچھا نہیں سمجھتی تھی لیکن اپنی سادگی اور حوصلے کی کمی کی وجہ سے مجبور ہو گئی تھی کہ چرس کی اسمگلنگ کرنے والے شاطر گروہ کی آلۂ کار بنی رہے۔ مجھے اس لڑکی سے ہمدردی ہے لیکن مجھے اپنی سرزمین پر نافذ قانون کا تحفظ بھی کرنا ہے۔ قانون کے مطابق میں ملزمہ کا بیان خود اس کے الفاظ میں قلمبند کرنے کا پابند ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی بیان کی ہوئی بعض غیر متعلق تفصیلات بھی اس دستاویز میں شامل ہو گئی ہیں۔ میری درخواست ہے کہ ایڈمنسٹریشن آف جسٹس ملزمہ کی کم عمری، ناتجربے کاری اور اس کی جذباتی کیفیت کے پیش نظر اس کے بیان کے ان حصوں کو نظر انداز کر دے جو براہِ راست مقدمے سے متعلق نہیں ہیں اور صرف ملزمہ کی جذباتی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔ (انسپکٹر)

تھوڑی دیر بعد میں لباس تبدیل کر کے اپنے کمرے سے باہر آئی تو جم بدستور میرا منتظر تھا۔ اس کے چہرے پر گہرے غور و فکر کے آثار نظر آ رہے تھے۔ وہ برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ ڈیڈی اپنے کمرے میں تھے اور ممی کچن میں مصروف تھیں۔ میں خاموشی سے جم کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"سفر کیسا گزرا جین؟" جم نے پوچھا۔

"سمجھو قیامت سے گزر کر آئی ہوں۔"

"واقعی؟ کیا تم مشرق سے بالکل محظوظ نہیں ہوئیں؟"

"محظوظ ہونے کا کیا سوال؟ صرف جانا اور آنے کی گنہگار ہوں۔ پاکستان میں البتہ مجھے چند دن فرصت کے مل گئے تھے جنہیں گزارنے کی خاطر میں نے کراچی کے گلی کوچوں کی آوارہ گردی کی۔ وہاں کے غریبوں کی زندگی کی ایک جھلک میں نے قریب سے دیکھی۔ ایک شریف ٹیکسی ڈرائیور مجھے یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر سمجھ کر ان بستیوں میں لے گیا جہاں کراچی کے غریب پیشہ اور کم آمدنی والے لوگ رہتے تھے۔ وہاں مجھے ایک نوجوان ملا جو غریب تھا لیکن نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ تھا۔ وہ اپنے معاشرے سے نالاں تھا۔ اسے ملازمت نہیں مل رہی تھی حالانکہ وہ

اس ملک کے معیار کے مطابق اعلیٰ تعلیم یافتہ یعنی گریجویٹ
تھا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ملازمت نہ ملنے کی وجہ یہ تھی
کہ وہ ایک معمولی گھرانے کا فرد تھا۔ اس کے خاندان میں کوئی
با اثر شخص نہیں تھا نہ ہی ایسا کوئی دوست تھا جو سفارش کر کے
اسے اس کی صلاحیت کے مطابق ملازمت دلا سکتا۔ ایک لمحے
کے لیے تو میرے دل میں آیا کہ میں اسے ہالینڈ آنے کی پیشکش
کر دوں۔ پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ اگر واقعی وہ کسی نہ
کسی طرح یہاں آ گیا تو اسے پتہ چل جائے گا کہ میں وہاں کیوں
گئی تھی۔ میرے اسکالر ہونے کا جھوٹ بھی کھل جائے گا۔
میں نہیں چاہتی تھی کہ اس نے جس حیثیت میں میری اتنی عزت
کی اس کا بھرم کھل جائے۔"

"تم کابل بھی تو گئی تھیں۔ وہ کیسی جگہ ہے؟" جم نے پوچھا۔
"کابل میں وہ بات کہاں۔ اب بھی سیدھا سادہ کابل ہی ہے
ابھی وہاں لیکن میں نے کابل کو اتنی تفصیل سے نہیں دیکھا
جتنا کراچی کو دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ بظاہر کابل میں کوئی
خاص دلچسپی کی بات مجھے نظر نہیں آئی۔ بہت چھوٹا سا شہر
ہے اور کے مقابلے میں پاکستان کے جتنے شہر بھی میں نے دیکھے
وہ زیادہ بارونق تھے البتہ وہ پہاڑی علاقے جہاں پٹھان
قبائل رہتے ہیں مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں آئے۔ اس کی وجہ یہ
بھی ہو سکتی ہے کہ ان علاقوں میں سفر کے دوران میں مسلسل
خوفزدہ رہی۔ اس لیے وہاں کے قدرتی مناظر بھی غور سے دیکھ
بھی نہ سکی۔"

"تم خوفزدہ کیوں رہیں؟" جم نے کریدا۔
"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے جم! ایک نوجوان لڑکی
وحشی قسم کے قبائلی لوگوں میں تنہا سفر کر رہی ہو تو قدرتی طور پر
اسے ہر لمحے اپنے تحفظ کی فکر ستاتی رہے گی۔ یہی حال میرا تھا۔
ہر چند کہ میرے ساتھ ان لوگوں کا سلوک بہت شائستہ تھا۔
جہاں کہیں بھی رات گزارنے کا موقع آتا انھوں نے اپنی عورتوں
کے درمیان مجھے شب بسری کا موقع دیا۔ دن میں اکیلے مردوں
کے ساتھ سفر یا بات چیت میں وقت گزارنا پڑا لیکن میں نے
انھیں مہمان نواز خصوصاً عورتوں کے سلسلے میں بہت حساس
پایا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ میری طرف میلی نظر سے دیکھ
سکے۔ ویسے بھی میں جتنے عرصے ان لوگوں میں رہی میں نے کسی
عورت کے ساتھ کسی مرد کی زیادتی کا کوئی واقعہ نہیں سنا۔ یوں وہ
لوگ ہر وقت رائفلوں سے مسلح رہتے ہیں۔ اکثر وہ ادنیٰ سی بات
پر آپس میں خون خرابے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مجھے تو یہ
لوگ مشرقی یورپ اور ہنگری کے آس پاس پہاڑوں میں
بسنے والے قبائلیوں سے بہت ملتے جلتے نظر آئے۔ یہ لوگ
بھی قبیلے بنا کر خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور چراگاہوں
پر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ بس یہی کیفیت ان
پٹھان قبائل کی بھی ہے۔"

جم نے مسکراتے ہوئے کہا: "تھوڑے سے عرصے میں
تمہاری اسٹڈی قابل تعریف ہے۔"
"شکریہ جم! مجھے اگر تھوڑا سا بھی اطمینان نصیب
ہوتا تو میں واقعی ان لوگوں کی نفسیات اور ان کی معاشرتی
زندگی کا اچھی طرح جائزہ لیتی اور پھر ایک تجزیاتی مضمون لکھتی۔"

"اب بھی تم اپنے سفر کے تاثرات سلسلے وار کسی اخبار
کے لیے لکھ سکتی ہو۔ بہت اچھا معاوضہ مل جائے گا۔"
"مگر میں بتاؤں گی کیا کہ میں نے یہ دو سفر اور وہ
بھی اتنے کم وقت میں آخر کیوں کیے تھے؟ مجھے کسی یونیورسٹی
نے مطالعاتی مشن پر بھی نہیں بھیجا تھا اور کوئی اس بات پر
کیسے یقین کرے گا کہ ایک معمولی سی نرس اپنے خرچ پر دو بار
پاکستان اور افغانستان کا سفر کر چکی ہے اور دونوں ہی بار وہ
صرف چند دن ہی وہاں رہی۔"
"بالکل ٹھیک۔ تمہارے پاس اس بات کا کوئی جواب
نہیں ہے۔ یوں بھی اگر مقامی حکام تمہیں طلب کر کے اب بھی
یہ سوال کریں تو تم کیا کہو گی؟" جم نے کہا۔
"میں خود پریشان ہوں۔ اگر ایسا کوئی وقت آ گیا تو
میں کیا کہوں گی؟"
جم بھی گہری سوچ میں ڈوب گیا اور میں بھی فکر مند
ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ میرے پاسپورٹ پر میری آمد و رفت کے
اندراجات موجود تھے۔ ایئرپورٹ پر میری روانگی اور واپسی
کی تاریخیں ریکارڈ پر تھیں۔ میں واقعی بہت بڑی مصیبت
میں گرفتار ہو سکتی تھی۔ جم نے اس بارے میں مائیکل سے بات
کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی ایسا طریقہ بتا
دے گا جس سے میں حکام کو مطمئن کر سکوں۔
مجھے گہری سوچ میں مبتلا دیکھ کر جم نے تسلی دی: "تم
تو ابھی سے اتنی پریشان ہو رہی ہو جیسے دروازے پہ وزارت
داخلہ کا کوئی افسر کھڑا ہو۔ یہ تو ایک مفروضہ ہے جس پر
ہمیں پہلے سے غور کر لینا چاہیے اور یہ صورتِ حال بھی صرف
اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کوئی تمہارا دشمن تمہارے
بارے میں حکومت کو کوئی اطلاع پہنچائے۔ نصیب سے ہر
روز لاتعداد سیکڑوں لوگ آتے جاتے ہیں کوئی یہ پوچھتا نہیں

سکتا کہ میں کس حال میں ہوں۔ خود ہی فیصلہ
کرنے سے قاصر رہا ہوں کہ [illegible]
حقیقتاً میں دست و بے بسی [illegible] ہوں
کی مانند اپنے لیے بہتری حاصل کرنے کی [illegible]
طاقت کی [illegible] بے بسی [illegible] سے اپنی
مرضی کے مطابق [illegible] دے رہی ہے۔ [illegible]

اب تک کے واقعات کی روشنی میں بظاہر مجھے
پاکستان یا افغانستان میں نہیں ہونا چاہیے تھا بلکہ مجھے
شادی کر کے یا تو ہالینڈ میں ہی یا پھر کسی اور یورپی ملک
میں خاموش زندگی گزارنا چاہیے تھی۔ بدقسمتی سے ایسا نہ
ہو سکا اور میں پھر یہاں کراچی میں موجود ہوں اور نہ
صرف موجود ہوں بلکہ اپنے تمام اندیشوں کے مطابق
زیرِ حراست بھی ہوں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے
کہ مائیکل نے ایک بار پھر مجھے بلیک میل کیا۔ چند دن
پہلے اس نے مجھے بتایا کہ میرے دوسرے سفر کے اختتام پر
ہیتھرو ایئرپورٹ سے میرا سوٹ کیس اس نے بدل دیا
تھا۔ اس سوٹ کیس کا ٹیگ بھی مائیکل نے بدل دیا تھا جو
اس سوٹ کیس کی ملکیت ظاہر کرتا تھا چنانچہ بقول مائیکل
کے اس دن جو پرابلم پیدا ہو گئی تھی وہ بڑھتے بڑھتے
اس مرحلے تک پہنچ گئی کہ حکام نے اس پُراسرار سوٹ
کیس کی مالکہ کی تلاش شروع کر دی۔ مائیکل کا بیان تھا
کہ اس نے بڑی کوشش کی کہ معاملہ دب جائے لیکن ایسا
نہ ہو سکا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ خود یا اس کی کمپنی کا
چند باس میری مدد صرف اسی صورت میں کر سکتے ہیں کہ
میں ایک بار پھر ان کے لیے کام کرنے پر رضامند ہو جاؤں
بصورتِ دیگر مائیکل نے مجھے پکڑوا دینے کی دھمکی دی۔
میں ایک بار پھر مجبور کر دی گئی۔ اس بار تب میں نے
تم سے کوئی ذکر نہیں کیا اور صرف اپنے ڈیڈی کو اعتماد میں
لے کر انہیں بتا دیا کہ میں چند دنوں کے لیے پھر جا رہی
ہوں۔

میں کراچی پہنچ کر ہوٹل مہران میں مقیم ہو گئی۔ جہاں
حسبِ معمول وہی جاپانی مجھ سے ملا۔ اس نے اخراجات
کے لیے مجھے ایک ہزار امریکی ڈالر دیے اور مال کی رقم
اگلے دن لانے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی
میں نے پریشانی کے عالم میں سوچنا شروع کیا کہ موجودہ
صورتِ حال سے کیسے نکلوں؟ مجھے خیال آیا کہ اسی

جہاں سے اتفاق تھا کہ پاکستانی کسٹم کے حکام مزید [illegible]
[illegible] یا پاکستان [illegible]
کہاں غائب ہو گئی [illegible] کراچی [illegible] کی بلی تو
[illegible] ہو جائے گی چنانچہ میں نے فیصلہ
کیا کہ [illegible] خود ہی گرفتار ہو جاؤں تاکہ حکام میرے ساتھ
نرمی کا سلوک کریں۔

جاپانی کے جانے کے بعد میں ہوٹل سے نکلی اور ٹیکسی
کر کے میں پھر اسی علاقے میں پہنچ گئی جہاں ایک شکستہ
گھر میں میری ملاقات محمد شریف نامی نوجوان سے ہوئی
تھی۔ خوش قسمتی سے وہ مجھے گھر ہی پر مل گیا۔ مجھے اپنے
سامنے یوں اچانک دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ مجھے اندر
لے گیا اور احترام سے بٹھا کر خاطر تواضع کی فکر کرنے لگا۔
میں نے اسے روک دیا اور اسے کہا کہ میں بہت پریشان
ہوں اور اس کی مدد چاہتی ہوں۔ میں نے مختصر الفاظ میں
اسے اپنے سابقہ سفر کا حال سنایا اور یہ بھی بتا دیا کس طرح
میرے وطن میں مجھے بلیک میل کیا جا رہا ہے۔ معلوم ہونے
کے بعد کہ مجھے بلیک میل کرنے والے انگریزوں میں ایک
ہندو بھی شامل ہے، شریف پُرجوش ہو گیا اور مجھے اپنے
ایک دوست کے پاس لے گیا جو کچھ عرصہ پہلے پولیس
کی ملازمت سے ریٹائر ہوا تھا۔ میں اس شخص کا نام
بھول گئی ہوں۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں جاپانی سے
رقم وصول کر کے یہ اصرار کروں کہ مال مجھے کراچی میں ہی پہنچایا
جائے اور سرحد جانے سے صاف انکار کر دوں۔
جب وہ لوگ مال مجھے پہنچا دیں تو پولیس کو مطلع کر کے
ان سب کو گرفتار کرا دوں۔ میری سمجھ میں یہ بات آ گئی۔
میرے سامنے اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار بھی نہیں رہا
تھا۔ وہ لوگ مجھے یوں ہی بلیک میل کر کر کے تباہ کرنے پر تلے
ہوئے تھے۔ لہٰذا اپنے وطن میں گرفتار ہو کر ذلیل ہونے
کے بجائے میں نے ایک ایسی جگہ گرفتاری کو ترجیح دی
جہاں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا اور جہاں میں بچ بچا کر
اپنے لیے کچھ آسانی کی بھی توقع کر سکتی تھی۔ دوسرے
دن جب جاپانی مجھے مال کی رقم دینے آیا تو میں نے
اس سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ مجھے مال یہیں کراچی
میں چاہیے۔ میں کہیں اور نہیں جاؤں گی۔ میرے الفاظ
کی سختی نے جاپانی کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا اور وہ سر
ہلا کر چلا گیا۔ اس کی دی ہوئی رقم میرے پاس ہی رہی۔
اگلے دن جاپانی نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ

اگلے دن صبح دس بجے پشاور سے جو پی آئی اے کی فلائٹ آئے گی، اس سے مجاہد مال لے کر کراچی پہنچ رہا ہے چنانچہ مجھے ایئر پورٹ پہنچ کر اس سے مال وصول کر لینے اور رقم ادا کرنے کی ہدایت کی گئی۔ میں نے محمد شریف کو ڈیلے ہوسٹل فون پر مناسب الفاظ میں پروگرام سے مطلع کر دیا تاکہ وہ اپنے دوست سے کہہ کر مال کی برآمدگی اور گرفتاری کا بندوبست کر لے۔

میں پروگرام کے مطابق دوسرے دن صبح دس بجے کراچی ایئر پورٹ پہنچ گئی جہاں مجھے معلوم ہوا کہ فلائٹ آدھے گھنٹے لیٹ ہے۔ میں ڈومیسٹک لاؤنج میں انتظار کرنے لگی۔ میں ابھی اس کرسی پر بیٹھی ہی تھی کہ مجھے شریف نظر آ گیا۔ وہ ایئر پورٹ کے سیکورٹی برآمدے میں کھڑا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ وہ مجھے دیکھ لے لیکن دور ہونے کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہوا۔ شریف برآمدے میں تنہا کھڑا تھا اور کسی کا منتظر تھا۔ ہو سکتا ہے وہ میرا ہی انتظار کر رہا ہو۔ بہرحال ساڑھے دس بجے فلائٹ آ گئی اور طے شدہ منصوبے کے مطابق مجاہد ایک بیگ اٹھائے مجھے اپنی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر میں کھڑی ہو گئی اور مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ مجاہد نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"مسز قمر! آپ کیوں گھبرا گئیں۔ کیا گزشتہ بار ہماری مہمان نوازی آپ کو پسند نہیں آئی؟"

"یہ بات نہیں ہے مسٹر مجاہد! میں بہت تھک چکی تھی اور اتنا دشوار سفر کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ خیر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لو اپنی امانت سنبھالو۔" یہ کہہ کر میں نے رقم کا تھیلا اس کی طرف بڑھا دیا اور اس کے ہاتھ سے مال کا تھیلا لے لیا۔ ہم دونوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنے تھیلے تبدیل کیے تھے۔ دوسرے دیکھنے والوں نے شبہ بھی نہیں کیا ہوگا کہ کیا ہو گیا۔

میں نے مال کا تھیلا لے کر نیچے فرش پر رکھ دیا۔۔۔ مجاہد تھیلے تبدیل کرتے ہی تیزی سے ایک طرف چلا گیا میں اسے روک بھی نہیں سکی۔ اب مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ میں نے نظر دوڑائی تو برآمدے سے شریف بھی غائب تھا وہ شاید انتظار سے اکتا کر واپس جا چکا تھا۔ میں منتظر تھی کہ ابھی پولیس آ جائے گی اور مال قبضے میں لے کر مجاہد کو پکڑ لے گی لیکن میری بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ میں نے بے دلی سے تھیلا اٹھایا جس میں پوشیدہ پسندیدہ پاؤڈر لندن تھا اور باہر کی طرف چل دی۔ ابھی میں لاؤنج سے گیٹ کی طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ ایک باوردی کسٹم افسر نے مجھے روک کر پوچھا۔ اس تھیلے میں کیا ہے؟ تو میں گھبرا گئی اور اسے صاف صاف بتا دیا کہ اس میں سیال ہیروئن ہے جو ابھی ابھی پشاور سے آنے

والی فلائٹ سے ایک شخص بختاور کے ذریعے مجھ تک
پہنچی ہے۔ میں نے کسٹم افسر کو یہ بتانے کی کوشش بھی کی کہ
میں نے خود پولیس چھاپے کا انتظام کیا تھا لیکن اس نے
میری بات پر کان نہیں دھرے۔ پشاور فلائٹ کی پیسنجر
لسٹ چیک کی گئی لیکن اس میں بختاور نام کا کوئی مسافر
نہیں تھا۔

ایئر پورٹ پر کسٹم حکام نے مجھے حراست میں لے
لیا اور پھر تفتیش کے لیے آپ کے سپرد کر دیا۔ یہ ہے
میری کہانی۔

تفتیشی افسر کا نوٹ:۔

ملزمہ کی نشاندہی پر محمد شریف نامی نوجوان
کی تلاش کی گئی۔ مس ٹیلر کی رہنمائی میں پولیس
کی ایک پارٹی جس میں کسٹم کا بھی ایک
افسر شامل تھا محمد شریف کے مکان پر گئی،
جہاں پتہ چلا کہ وہ چند دن قبل بلوچستان چلا
گیا ہے۔ محلے کے دوسرے افراد سے پوچھ گچھ
کی گئی تو مس جین ٹیلر کے اس بیان کی تصدیق
ہو گئی کہ وہ دو مرتبہ اس علاقے میں آ چکی ہے
اور محمد شریف کے مکان میں بیٹھ کر اس سے
بات چیت بھی کر چکی ہے۔ محلے والوں نے بتایا
کہ چونکہ شریف پڑھا لکھا ہے اور انگریزی میں
بات چیت کر سکتا ہے اس وجہ سے ملزمہ اس
سے گفتگو کرتی رہی لیکن وہ لوگ یہ نہیں بتا
سکے کہ ان دونوں کی بات چیت کی نوعیت
کیا تھی کیونکہ وہ انگریزی زبان سے واقف
نہیں تھے۔ شریف کے گھر والوں سے ان کے
آبائی گاؤں کا پتہ لیا گیا ہے اور وائرلیس کے
ذریعے بلوچستان کسٹم کو شریف سے رابطہ قائم
کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تاہم ابھی تک اس
میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اگر جین ٹیلر کے
بیان کے اس حصے کی تصدیق ہو جاتی ہے
کہ اس نے فی الواقعی شریف کے ساتھ مل کر
اسمگلروں کے گروہ کو مع مال کے پکڑوانے
کا منصوبہ بنایا تھا جو ناقص منصوبہ بندی
کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔ تو صورت حال بدل
جائے گی اور مس ٹیلر کی حیثیت بھی ملزمہ کے
بجائے ایک اہم سرکاری گواہ کی ہو جائے گی
اور حکام کو ان تمام اسمگلروں کی گرفتاری کے لیے
از سر نو کوشش کرنا ہو گی جو پاکستان میں
اس گھناؤنے کام میں مصروف ہیں۔ بختاور
کی دستیابی اس وجہ سے ضروری ہے
ممکن ہے وہ تاجر گروہ کا [illegible] جانے کی وجہ سے
خائف ہو اور کسی معیت میں گرفتار ہو جانے
کے خوف سے کہیں غائب ہو گیا ہو بہرحال
جب تک حکام کو اس سلسلے میں کوئی
ٹھوس شہادت حاصل نہیں ہو جاتی مس
جین ٹیلر کی حیثیت ایک ایسی ملزمہ کی ہے
کہ جسے کراچی ایئر پورٹ پر سپیل اوور کے
اسمگلنگ کی کوشش کرتے ہوئے گرفتار کیا
گیا ہو۔ ملزمہ کے خلاف تحقیقات جاری
ہیں۔ ابھی تک پیش نہیں کیا گیا کیونکہ کسٹم
کے اعلیٰ حکام کا خیال ہے کہ مس جین کے
غیر ملکی ہونے اور ایک تعلیم یافتہ خاتون ہونے
کی وجہ سے قانون جس حد تک بھی رعایت
کی اجازت دیتا ہے اسے دی جانی چاہیے اور
تفتیشی حکام کو اس کے بیان کی صداقت جانچنے
کے لیے ہر ممکن راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس
طرح ممکن ہے کہ کسٹم حکام چالاک مجرموں
کے خطرناک گروہ کا استیصال کرنے میں کامیابی
حاصل کر لیں اور ایک ایسی نوجوان خاتون کو
تباہ ہونے سے بچا لیں جسے جیل کے
ایسے شکنجے میں [illegible] مجبور
کر دیا گیا ہے۔ کسٹم کے اعلیٰ حکام کی یہ بھی
ہدایت ہے کہ جین ٹیلر کو کسٹم کی حراست میں
رکھنے کے لیے متعلقہ عدالت سے جسمانی ریمانڈ
حاصل کرنا چاہیے اور ریمانڈ کی مدت کے
دوران ہی اس کے بیان کے ہر پہلو کی اچھی
طرح جانچ پڑتال کرنا چاہیے۔ پاکستان میں
ہالینڈ کے سفارت خانے کو بھی ملزمہ کے
بارے میں مطلع کر کے اس کے بیان کردہ
کوائف کی تصدیق بھی حاصل کی جانی چاہیے

انسپکٹر